

سلسلہ نصاب تعلیم جامعہ عثمانیہ

تاریخ یونان

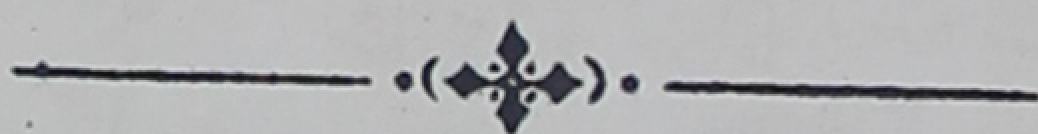
پروفیسر بیوری کی کتاب "ہسٹری اوف گریس" (خورد) کا اردو ترجمہ
انٹرمیڈیٹ کے لئے

مترجمہ
مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی
رکن سررشتہ تالیف و ترجمہ
جامعہ عثمانیہ

۱۳۳۷ھ م ۱۳۲۸ف م ۱۹۱۹ع

مطبوعہ دار الطبع سرکار عالی حیدرآباد دکن

مقدمہ



دنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اُس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، ایجاد و اختراع اور غور و فکر کا مادّہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے، تخیل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہو جاتی ہے، علم کا دار و مدار چند رسمی باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہے۔ اُس وقت قوم یا تو بیکار اور مردہ ہو جاتی ہے یا سنبھلنے کے لئے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے۔ تاریخ عالم کے ہر دَور میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ خود ہمارے دیکھتے دیکھتے جاپان پر یہی گذری اور یہی حالت اب ہندوستان کی ہے۔

جس طرح کوئی شخص دوسرے بنی نوع انسان سے قطع تعلق کرکے تنہا اور الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اگر رہے تو پنپ

نہیں سکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی قوم دیگر اقوام عالم سے بے نیاز ہو کر پھولے پھلے اور ترقی پائے۔ جس طرح ہوا کے جھونکے اور ادنیٰ پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کے اثر سے وہ مقامات تک ہرے بھرے رہتے ہیں جہاں انسان کی دسترس نہیں اسی طرح انسانوں اور قوموں کے اثر بھی ایک دوسرے تک اڑ کر پہنچتے ہیں۔ جس طرح **یونان** کا اثر روم اور دیگر اقوام **یورپ** پر پڑا جس طرح **عرب** نے **عجم** کو اور **عجم** نے **عرب** کو اپنا فیض پہنچایا، جس طرح اسلام نے **یورپ** میں تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ قانون عالم ہے جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہیگا۔

"دئے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے"

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل **ترجمہ** ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب قوم میں جدت اور اپج نہیں رہی تو ظاہر ہے کہ اس کی تصانیف معمولی، ادھوری، کم مایہ اور ادنیٰ ہونگی۔ اُس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعہ سے دنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر آخر یہی ترجمے تصنیف وتالیف

کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سُجھائیں گے۔ ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف سے زیاد قابل قدر، زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے۔

اسی اصول کی بنا پر جب عثمانیہ یونیورسٹی کی تجویز پیش ہوئی تو ہز اکزالٹڈ ہائینس رستمِ دوراں ارسطوئے زماں سپہ سالار آصف جاہ مظفر الممالک نظام الملک نظام الدولہ نوابؔ میرؔ عثمانؔ علیخانؔ بہادرؔ فتح جنگؔ جی۔سی۔اس۔آئی۔جی۔سی۔بی۔ای۔والی حیدرآباد دکن خلّداللہ ملکہ و سلطنتہ نے جن کی علمی قدردانی اور علمی سرپرستی اس زمانہ میں احیائے علوم کے حق میں آب حیات کا کام کر رہی ہے، بہ تقاضائے مصلحت و دوربینی سب سے اول سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے قیام کی منظوری عطا فرمائی' جو نہ صرف یونیورسٹی کے لئے نصاب تعلیم کی کتابیں تیار کریگا بلکہ ملک میں نشر و اشاعتِ علوم و فنون کا کام بھی انجام دیگا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی یہ کام ہندوستان کے مختلف مقامات میں تھوڑا تھوڑا انجام پایا مثلاً فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زیر نگرانی ڈاکٹر گِلکرسٹ' دہلی سوسائٹی میں' انجمن پنجاب میں زیر نگرانی ڈاکٹر لائٹنر و کرنل ہالرائڈ' علی گڑھ سائنٹفک انسٹیوٹ میں جس کی بنا سر سیّد احمد خاں مرحوم نے ڈالی۔ مگر یہ کوششیں سب وقتی اور عارضی تھیں۔ نہ اُنکے پاس کافی سرمایہ اور سامان تھا نہ اُنہیں یہ موقع حاصل تھا

اور نہ انہیں اعلیحضرت و اقدس جیسے علم پرور فرمانروا کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ یہ پہلا وقت ہے کہ اردو زبان کو علوم و فنون سے مالا مال کرنے کے لئے باقاعدہ اور مستقل کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ پہلا وقت ہے کہ اردو زبان کو یہ رتبہ ملا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار پائی ہے۔ احیائے علوم کے لئے جو کام آگسٹس نے رومہ میں، خلافت عباسیہ میں ہارون الرّشید و مامون الرّشید نے ہسپانیہ میں عبدالرحمٰن ثالث نے، بکرماجیت و اکبر نے ہندوستان میں، الفرڈ نے انگلستان میں، پیٹر اعظم و کیتھرائن نے روس میں اور مُت شی ہٹو نے جاپان میں کیا، وہی فرمانروائے دولت آصفیہ نے اس ملک کے لئے کیا۔ اعلیحضرت واقدس کا یہ کارنامہ ہندوستان کی علمی تاریخ میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا جائیگا۔

منجملہ اُن اسباب کے جو قومی ترقی کا موجب ہوتے ہیں ایک بڑا سبب زبان کی تکمیل ہے۔ جس قدر جو قوم زیادہ ترقی یافتہ ہے اُسی قدر اُس کی زبان وسیع اور اس میں نازک خیالات اور علمی مطالب کے ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، اور جس قدر جس قوم کی زبان محدود ہوتی ہے اُسی قدر تہذیب و شایستگی بلکہ انسانیت میں اس کا درجہ کم ہوتا ہے۔ چنانچہ وحشی اقوام میں الفاظ کا ذخیرہ بہت ہی کم پایا گیا ہے۔ علمائے فلسفہ و علم اللسان نے یہ ثابت کیا ہے کہ زبان، خیال اور

خیال، زبان ہے اور ایک مدت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی دماغ کے صحیح تاریخی ارتقا کا علم، زبان کی تاریخ کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ الفاظ ہمیں سوچنے میں ویسی ہی مدد دیتے ہیں جیسی آنکھیں دیکھنے میں۔ اس لئے زبان کی ترقی درحقیقت عقل کی ترقی ہے۔

علمِ ادب اسی قدر وسیع ہے جس قدر حیاتِ انسانی۔ اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف انسان کی ذہنی، معاشرتی، سیاسی ترقی میں مدد دیتا، اور نظر میں وسعت، دماغ میں روشنی، دلوں میں حرکت اور خیالات میں تغیر پیدا کرتا ہے بلکہ قوموں کے بنانے میں ایک قوی آلہ ہے۔ قومیت کے لئے ہم خیالی شرط ہے اور ہم خیالی کے لئے ہم زبانی لازم۔ گویا یک زبانی قومیت کا شیرازہ ہے جو اسے منتشر ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ مسلمان اقطاعِ عالم میں پھیلے ہوئے تھے لیکن اُن کے علمِ ادب اور زبان نے انہیں ہر جگہ ایک کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں انگریز ایک دنیا پر چھائے ہوئے ہیں لیکن باوجود بُعدِ مسافت و اختلافِ حالات یک زبانی کی بدولت قومیت کے ایک سلسلے میں منسلک ہیں، زبان میں جادو کا سا اثر ہے اور صرف افراد ہی پر نہیں بلکہ اقوام پر بھی اُس کا وہی تسلّط ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا صحیح اور فطرتی ذریعہ اپنی ہی زبان ہو سکتی ہے۔ اس امر کو اعلیٰحضرت واقدس نے

پہچانا اور جامعۂ عثمانیہ کی بنیاد ڈالی۔ جامعۂ عثمانیہ ہندوستان میں پہلی یونیورسٹی ہے جس میں ابتدا سے انتہا تک ذریعۂ تعلیم ایک دیسی زبان ہوگا۔ اور یہ زبان اردو ہوگی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں "بھانت بھانت کی بولیاں" بولی جاتی ہیں، جہاں ہر صوبہ ایک نیا عالم ہے، صرف اردو ہی ایک عام اور مشترک زبان ہو سکتی ہے۔ یہ اہل ہند کے میل جول سے پیدا ہوئی اور اب بھی یہی اس فرض کو انجام دیگی۔ یہ اس کے خمیر اور وضع و ترکیب میں ہے۔ اس لئے یہی تعلیم اور تبادلہ خیالات کا واسطہ بن سکتی اور قومی زبان کا دعوے کر سکتی ہے۔

جب تعلیم کا ذریعہ اردو قرار دیا گیا تو یہ کھلا اعتراض تھا کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کتابوں کا ذخیرہ کہاں ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اردو میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ اس میں علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کافی ذخیرہ نہیں۔ اور اردو ہی پر کیا منحصر ہے، ہندوستان کی کسی زبان میں بھی نہیں۔ یہ طلب و رسد کا عام مسئلہ ہے۔ جب مانگ ہی نہ تھی تو رسد کہاں سے آتی۔ جب ضرورت ہی نہ تھی تو کتابیں کیونکر مہیا ہوتیں۔ ہماری اعلیٰ تعلیم غیر زبان میں ہوتی تھی، تو علوم و فنون کا ذخیرہ ہماری زبان میں کہاں سے آتا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اب ضرورت محسوس ہوئی ہے تو کتابیں بھی

مہیا ہو جائیں گی۔ اسی کمی کو پورا کرنے اور اسی ضرورت کو رفع کرنے کے لئے **سررشتۂ تالیف و ترجمہ** قائم کیا گیا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ اردو زبان میں اس کی صلاحیت نہیں۔ اس کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ **سررشتۂ تالیف و ترجمہ** کا وجود اس کا شافی جواب ہے۔ یہ سررشتہ یہی کام کر رہا ہے۔ کتابیں تالیف و ترجمہ ہو رہی ہیں اور چند روز میں **عثمانیہ یونیورسٹی کالج** کے طالب علموں کے ہاتھوں میں ہونگی اور رفتہ رفتہ عام شایقینِ علم تک پہنچ جائیں گی۔

لیکن اس میں سب سے کٹھن اور سنگلاخ مرحلہ وضع اصطلاحات کا تھا۔ اس میں بہت کچھ اختلاف اور بحث کی گنجائش ہے۔ اس بارے میں ایک مدت کے تجربہ اور کامل غور و فکر اور مشورہ کے بعد میری یہ رائے قرار پائی ہے کہ تنہا نہ تو ماہرِ علم صحیح طور سے اصطلاحات وضع کر سکتا ہے اور نہ ماہرِ لسان۔ ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے۔ اور ایک کی کمی دوسرا پورا کرتا ہے۔ اس لئے اس اہم کام کو صحیح طور سے انجام دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں یک جا جمع کئے جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے مشورہ اور مدد سے ایسی اصطلاحیں بنائیں جو نہ اہلِ علم کو ناگوار ہوں نہ اہلِ زبان کو۔ چنانچہ اسی اصول پر ہم نے وضع اصطلاحات کے لئے ایک ایسی مجلس بنائی جس میں دونوں، جماعتوں کے اصحاب شریک ہیں۔ علاوہ اِن کے

ہم نے اُن اہلِ علم سے بھی مشورہ کیا جو اس کی خاص اہلیت رکھتے ہیں اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے ہماری مجلس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض الفاظ غیر مانوس معلوم ہوں گے اور اہل زبان انہیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن اس سے گزیر نہیں۔ ہمیں بعض ایسے علوم سے واسطہ ہے جن کی ہوا تک ہماری زبان کو نہیں لگی۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے چارہ نہیں کہ جب ہماری زبان کے موجودہ الفاظ خاص خاص مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہوں تو ہم جدید الفاظ وضع کریں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم نے محض ٹالنے کے لئے زبردستی الفاظ گھڑ کر رکھ دئے ہیں؛ بلکہ جس نہج پر اب تک الفاظ بنتے چلے آئے ہیں اور جن اصولِ ترکیب و اشتقاق پر اب تک ہماری زبان کاربند رہی ہے، اس کی پوری پابندی ہم نے کی ہے۔ ہم نے اُس وقت تک کسی لفظ کے بنانے کی جرأت نہیں کی جب تک اُسی قسم کی متعدّد مثالیں ہمارے پیش نظر نہ رہی ہوں۔ ہماری رائے میں جدید الفاظ کے وضع کرنے کی اس سے بہتر اور صحیح کوئی صورت نہیں۔ اب اگر کوئی لفظ غیر مانوس یا اجنبی معلوم ہو تو اس میں ہمارا قصور نہیں۔ جو زبان زیادہ تر شعر و شاعری اور قصص تک محدود ہو، وہاں ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ جس ملک سے ایجاد و اختراع کا مادّہ سلب ہو گیا ہو جہاں لوگ نئی چیزوں کے بنانے اور دیکھنے کے عادی نہ ہوں، وہاں جدید الفاظ کا

غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہونا موجب حیرت نہیں۔ الفاظ کی حالت بھی انسانوں کی سی ہے۔ اجنبی شخص بھی رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اول اول الفاظ کا بھی یہی حال ہے۔ استعمال آہستہ آہستہ غیر مانوس کو مانوس کر دیتا ہے اور صحت و غیر صحت کا فیصلہ زمانہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ لفظ تجویز کرتے وقت ہر پہلو پر کامل غور کرلیں، آئندہ چل کر اگر وہ استعمال اور زمانہ کی کسوٹی پر پورا اترا تو خود ٹکسالی ہو جائیگا اور اپنی جگہ آپ پیدا کرلیگا۔ علاوہ اس کے جو الفاظ پیش کئے گئے ہیں وہ الہامی نہیں کہ جن میں ردّ و بدل نہ ہوسکے، بلکہ **فرہنگِ اصطلاحاتِ عثمانیہ** جو زیر ترتیب ہے پہلے اس کا مسودہ اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جائے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا اس کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ہماری مشکلات صرف **اصطلاحات علمیہ** تک ہی محدود نہیں ہیں۔ ہمیں ایک ایسی زبان سے ترجمہ کرنا پڑتا ہے جو ہمارے لئے بالکل اجنبی ہے، اس میں اور ہماری زبان میں کسی قسم کا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں۔ اس کا طرز بیان، ادائے مطلب کے اسلوب، محاورات وغیرہ بالکل جدا ہیں۔ جو الفاظ اور جملے انگریزی زبان میں بالکل معمولی اور روز مرہ کے استعمال میں آتے ہیں، اُن کا ترجمہ جب ہم اپنی زبان میں کرنے بیٹھتے ہیں تو سخت دشواری پیش آتی ہے۔ ان تمام دشواریوں پر

غالب آنے کے لئے مترجم کو کیسا کچھ خونِ جگر کھانا نہیں پڑتا۔ ترجمہ کا کام، جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے، کچھ آسان کام نہیں ہے ۔ بہت خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے ‌+

اس سررشتہ کا کام صرف یہی نہ ہوگا (اگرچہ یہ اس کا فرضِ اولین ہے) کہ وہ نصاب تعلیم کی کتابیں تیار کرے، بلکہ اس کے علاوہ وہ ہر علم پر متعدّد اور کثرت سے کتابیں تالیف و ترجمہ کرائے گا، تاکہ لوگوں میں علم کا شوق بڑھے، ملک میں روشنی پھیلے، خیالات و قلوب پر اثر پیدا ہو، جہالت کا استیصال ہو۔ جہالت کے معنی اب لاعلمی ہی کے نہیں بلکہ اس میں افلاس، کم ہمتی، تنگ دلی، کوتہ نظری، بے غیرتی، بد اخلاقی سب کچھ آجاتا ہے ۔ جہالت کا مقابلہ کرکے اسے پس پا کرنا سب سے بڑا کام ہے ۔ انسانی دماغ کی ترقی علم کی ترقی ہے۔ انسانی ترقی کی تاریخ علم کی اشاعت و ترقی کی تاریخ ہے ۔ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک انسان نے جو کچھ کیا ہے، اگر اس پر ایک وسیع نظر ڈالی جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جوں جوں علم میں اضافہ ہوتا گیا، پچھلی غلطیوں کی صحت ہوتی گئی، تاریکی گھٹتی گئی، روشنی بڑھتی گئی، انسان میدانِ ترقی میں قدم آگے بڑھاتا گیا ۔ اسی مقدس فرض کے ادا کرنے کے لئے یہ سررشتہ قائم کیا گیا ہے اور وہ اپنی بساط کے موافق اس کے انجام دینے میں کوتاہی نہ کرے گا ۔

لیکن غلطی، تحقیق و جستجو کی گھات میں لگی رہتی ہے ۔ ادب کا

کامل ذوق سلیم ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا ۔ بڑے بڑے نقّاد اور مبصّر فاش غلطیاں کر جاتے ہیں ۔ لیکن اس سے ان کے کام پر حرف نہیں آتا ۔ غلطی ترقی کے مانع نہیں ہے، بلکہ وہ صحت کی طرف رہنمائی کرتی ہے پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو رستہ بھٹکنے سے بچا دیتی ہے ۔ ایک جاپانی ماہر تعلیم (بیرن کی کوچی) نے اپنے ملک کا تعلیمی حال لکھتے ہوئے اس صحیح کیفیت کا ذکر کیا ہے جو ہونہار اور ترقی کرنے والے افراد اور اقوام پر گزرتی ہے ۔

"ہم نے بہت سے تجربے کئے اور بہت سی ناکامیاں اور غلطیاں ہوئیں، لیکن ہم نے ان سے نئے سبق سیکھے اور فائدہ اٹھایا ۔ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے ملک کی تعلیمی ضروریات اور امکانات کا صحیح اور بہتر علم ہوتا گیا اور ایسے تعلیمی طریقے معلوم ہوتے گئے جو ہمارے اہل وطن کے لئے زیادہ موزوں تھے ۔ ابھی بہت سے ایسے مسائل ہیں جو ہمیں حل کرنے ہیں، بہت سی ایسی اصلاحیں ہیں جو ہمیں عمل میں لانی ہیں، ہم نے اب تک کوشش کی اور ابھی کوشش کر رہے ہیں اور مختلف طریقوں کی برائیاں اور بھلائیاں دریافت کرنے کے درپے ہیں، تاکہ اپنے ملک کے فائدے کے لئے اچھی باتوں کو اختیار کریں اور رواج دیں اور برائیوں سے بچیں۔"

اس لئے جو حضرات ہمارے کام پر تنقیدی نظر ڈالیں انہیں وقت کی تنگی، کام کا ہجوم اور اس کی اہمیت اور ہماری مشکلات پیش نظر رکھنی چاہئیں ۔ یہ پہلی سعی ہے اور پہلی سعی میں کچھ نہ کچھ خامیاں

ضرور رہ جاتی ہیں، لیکن آگے چل کر یہی خامیاں ہماری رہنما بنیں گی اور پختگی اور اصلاح تک پہنچائیں گی۔ یہ نقش اول ہے نقش ثانی اس سے بہتر ہوگا۔ ضرورت کا احساس، علم کا شوق، حقیقت کی لگن، صحت کی ٹوہ، جد و جہد کی رسائی خود بخود ترقی کے مدارج طے کرلے گی۔

جاپانی بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تیس چالیس سال کے عرصے میں وہ کچھ کر دکھایا جس کے انجام دینے میں یورپ کو اتنی ہی صدیاں صرف کرنی پڑیں۔ کیا کوئی دن ایسا آئے گا کہ ہم بھی یہ کہنے کے قابل ہوں گے؟ ہم نے پہلی شرط پوری کردی ہے یعنی بیجا قیود سے آزاد ہوکر اپنی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ لوگ ابھی ہمارے کام کو تذبذب کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور ہماری زبان کی قابلیت کی طرف مشتبہ نظریں ڈال رہے ہیں۔ لیکن وہ دن آنے والا ہے کہ اس ذرّے کا بھی ستارہ چمکے گا، یہ زبان علم و حکمت سے مالا مال ہوگی اور **اعلیٰحضرت واقدس** کی نظر کیمیا اثر کی بدولت یہ دنیا کی مہذب و شایستہ زبانوں کی ہمسری کا دعوے کرے گی۔ اگرچہ اُس وقت ہماری سعی اور محنت حقیر معلوم ہوگی، مگر یہی شامِ غربت صبحِ وطن کی آمد کی خبر دے رہی ہے، یہی شب بیداریاں روزِ روشن کا جلوہ دکھائیں گی، اور یہی مشقت اُس قصر رفیع الشان کی بنیاد ہوگی جو آئندہ تعمیر ہونے والا ہے۔ اس وقت ہمارا کام صبر و استقلال سے میدان صاف کرنا،

داغ بیل ڈالنا اور نیو کھودنا ہے، اور فرہاد وار شیرینِ حکمت کی خاطر سنگلاخ پہاڑوں کو کھود کھود کر جوئے علم لانے کی سعی کرنا ہے۔ اور گو ہم نہ ہوں گے مگر ایک زمانہ آئیگا جب کہ اس میں علم و حکمت کے دریا بہیں گے اور ادبیات کی افتادہ زمین سرسبز و شاداب نظر آئے گی۔

آخر میں میں سررشتہ کے مترجمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے فرض کو بڑی مستعدی اور شوق سے انجام دیا۔ نیز میں ارکانِ مجلسِ وضعِ اصطلاحات کا شکرگزار ہوں کہ اِن کے مفید مشورے اور تحقیق کی مدد سے یہ مشکل کام بخوبی انجام پا رہا ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ سررشتہ جناب مسٹر محمدؐ اکبر حیدری بی۔ اے معتمد عدالت و تعلیمات و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی کا ممنون ہے جنہیں ابتدا سے قیام و انتظام جامعۂ عثمانیہ میں خاص انہاک رہا ہے۔ اور اگر ان کی توجہ اور امداد ہمارے شریک حال نہ ہوتی تو یہ عظیم الشان کام صورت پذیر نہ ہوتا۔ میں سید راس مسعود صاحب بی۔ اے (آکسن) آئی۔ اِی۔ ایس۔ ناظمِ تعلیمات سرکارعالی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی توجہ اور عنایت ہمارے حال پر مبذول رہی اور ضرورت کے وقت ہمیشہ بلا تکلف خوشی کے ساتھ ہمیں مدد دی۔

عبد الحق

ناظمِ سررشتۂ تالیف و ترجمہ (عثمانیہ یونیورسٹی)

ارکانِ دار الترجمہ



مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	ناظم۔
قاضی محمد حسین صاحب۔ ایم۔ اے۔ رینگلر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مترجم ریاضیات
چودھری برکت علی صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مترجم سائینس
مولوی سید ہاشمی صاحب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مترجم تاریخ۔
مولوی محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مترجم معاشیات
قاضی تلمذ حسین صاحب یم۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مترجم سیاسیات
مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مترجم تاریخ۔
مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مترجم فلسفہ و منطق
مولوی عبدالحلیم صاحب شرر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مولف تاریخ اسلام
مولوی سید علی رضا صاحب بی۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مترجم قانون۔
مولوی عبداللہ العمادی صاحب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	مترجم کتب عربی

علاوہ ان مذکورۂ بالا مترجمین کے مولوی حاجی صفی الدین صاحب ترجمہ شدہ کتابوں کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے لئے اور نواب حیدر یار جنگ (مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی) ترجموں پر نظر ثانی کرنے کے لئے مقرر فرمائے گئے ہیں +

ارکانِ مجلسِ وضعِ اصطلاحات

مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب وظیفہ یاب سرکار عالی (سابق ناظم مردم شماری)

مولوی حمیدالدین صاحب بی۔اے صدر دارالعلوم

نواب حیدر یار جنگ (مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی)

مولوی وحیدالدین صاحب سلیم

مولوی عبدالحق بی۔اے ناظم سررشتہ تالیف وترجمہ

علاوہ ان مستقل ارکان کے، مترجمین سررشتہ تالیف وترجمہ نیز دوسرے اصحاب سے بلحاظ اُنکے فن کے مشورہ کیا گیا۔ مثلاً

خان فضل محمد خانصاحب ایم۔اے رنیگلر (پرنسپل سٹی ہائی اسکول حیدرآباد)

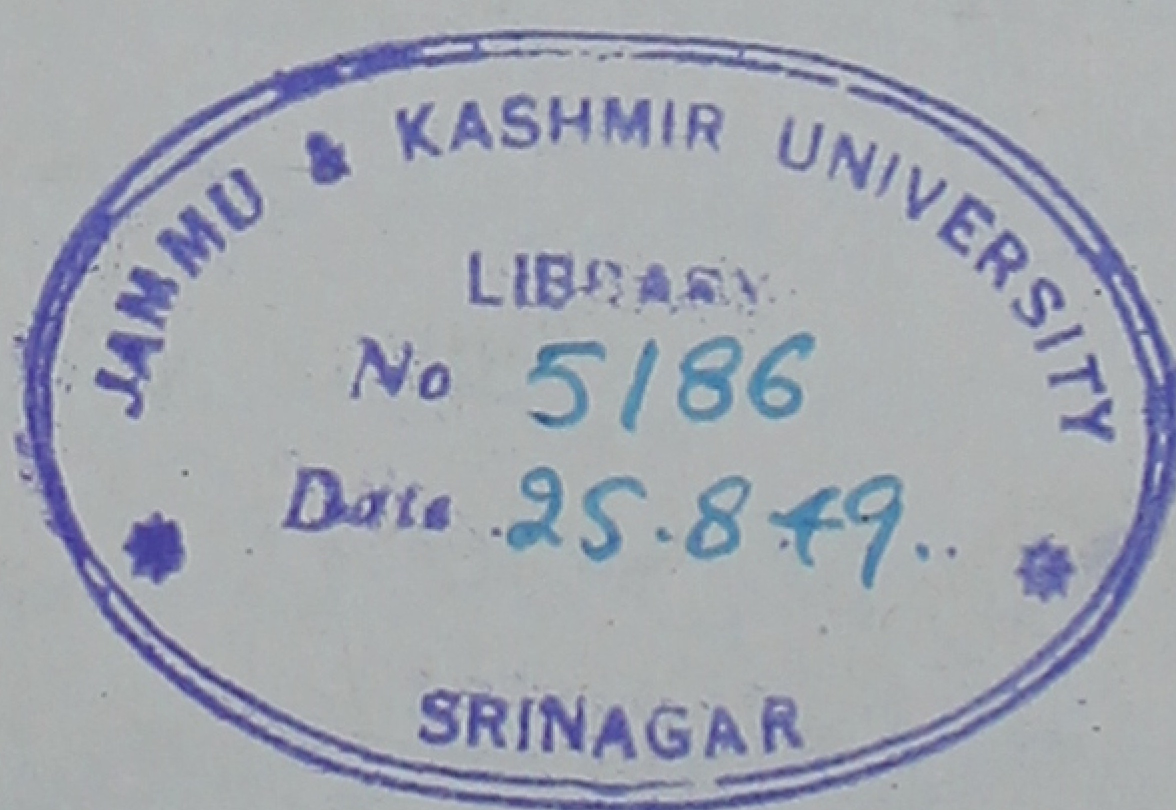
مولوی عبدالواسع صاحب (پروفیسر دارالعلوم حیدرآباد)

پروفیسر عبدالرحمٰن صاحب بی۔ایس۔سی (نظام کالج)

مرزا محمد ہادی صاحب۔بی۔اے (پروفیسر کرسچن کالج لکھنؤ)

مولوی سلیمان صاحب ندوی

سید راس مسعود صاحب بی۔اے (ناظم تعلیمات حیدرآباد) وغیرہ



۷۸۶

فہرست مضامین

باب اوّل

آغاز تاریخ و عہد شجاعت

صفحہ

صفحہ

باب دوم

یونان کی وسعت

باب سوم

اسپارٹہ کا فروغ شرفا کا زوال

صفحہ

باب چہارم

اتحاد ایٹی کا اور جمہوریہ ایتھنز کی بنا

باب پنجم

ایتھنز کا فروغ چھٹی صدی میں

صفحہ

باب ششم

ایرانکی پیش قدمی ایتھنز کیطرف

باب ہفتم

ابتلائے یونان: ایران و فنیقیہ کی یورش صفحہ

باب ہشتم

سلطنت ایتھنز کی بنا

بابُ نہم

سلطنت ایتھنز پری کلیس کے عہد اقتدار میں

بابُ دہم

محاربہ ایتھنز و پلوپنی سس

صفحہ

بابِ یازدہم

سلطنت ایتھنز کا زوال اور خاتمہ

بابُ دُوازدہم

اقتدار اسپارٹہ اور جنگ ایران

بابُ سِیزدہم

صفحہ

ایتھنز کا دوبارہ فروغ اور دوسری ہیئت اتحاد

بابِ چہاردہم

ریاستِ تھبنز کی سیادت

بابِ پانزدہم

سیراکیوز کی سلطنت

صفحہ

بابِ شانزدہم

مقدونیہ کا عروج

بابِ ہفدہم

صفحہ

ایران کی تسخیر

بابِ ہجدہم
مشرقی اقصیٰ کی فتوحات

تمت

باب اوّل

آغازِ تاریخ اور عہدِ شجاعت

۱۔ یونان اور بحیرۂ ایجین

اس داستان کی ورق گردانی رفتہ رفتہ ہمارے ناظرین کو ملک یونان کے جزایر و امصار، جبال و انہار کے ناموں سے گوش آشنا کر دے گی۔ لیکن آغاز ہی میں چند عام اسباب و حالات کا ذہن نشین کر لینا مناسب ہے کہ انہی کا ناگزیر اثر یونانیوں کی تاریخ کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا چلا گیا تھا؛ جن اقطاع و جزایر میں وہ لوگ آباد تھے اُس کی خصوصیاتِ طبعی کا ان کی تاریخ سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر یونان کے جغرافیے سے قطع نظر کر لی جائے تو یونان کی تاریخ مطلق سمجھ میں نہ آئے گی کیونکہ وہ قوم، جو جزیروں میں یا ایسی سرزمین پر آباد ہو جس میں جابجا راسیں اور گہری خلیجیں ہوں، سمندر ہی کے راستے اطراف و اکناف

میں پھیل سکتی تھی ۔ گویا خود قضا و قدر نے اُسے سمندر کی گود میں ڈال دیا تھا۔

جزیرہ نمائے یونان میں سب سے نمایاں شئے، وہ گہری خلیج ہے جس نے اس ملک کو قریب قریب مساوی دو حصّوں میں چیر دیا ہے۔ اور انتہائے مشرق میں اگر خشکی کا ایک تنگ تسمہ نہ لگا رہ جاتا تو جنوبی حصّہ بالکل علیحدہ ایک جزیرہ ہوتا۔ اور خود اس کے یونانی نام (پلوپی سس) کے معنی بھی "قوم پلوپ کا جزیرہ" ہیں؛ بہر حال، سمندر کا اس طرح ملک میں دور تک آجانا، قدیم یونان کی تاریخ پر بہت بڑا اثر رکھتا ہے اور اس کا اندازہ تین پہلوؤں سے نظر ڈال کر ہو سکتا ہے یعنی اول تو خود ایک فاصل خلیج کا ملک میں ہونا دوسرے جنوبی اور شمالی یونان کے درمیان، محض ایک خاکنائے کا تعلق۔ اور تیسرے اس خاکنائے کا انتہائے مغرب میں نہ ہونا بلکہ انتہائے مشرق میں واقع ہونا۔

(۱) خود خلیج کا دوگونہ اثر تو پہلی ہی نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس نے ایک طرف تو بہت سے ایسے باشندوں تک سمندر کو پہنچا دیا کہ اگر یہ خلیج نہ ہوتی، تو وہ اندرون ملک کے محض کوہستانی باشندے رہ جاتے۔ نیز یہ کہ اس خلیج کی بدولت یونان کا ساحل زیادہ دراز ہو گیا؛ اس کے علاوہ دوسرا کام خلیج نے یہ کیا کہ جنوبی یونان کو بجائے خود ایک مستقل اور جداگانہ عالم بنا دیا جسے شمالی یونان سے بالکل علیحدہ ملک سمجھا جا سکتا تھا۔

(۲) لیکن اگر فی الواقع یہ جنوبی حصّہ ایک علیحدہ جزیرہ ہوتا اور یہ

تنگ خاکنائے بھی موجود نہوتی تو یونان کے مشرقی اور مغربی علاقے ایک دوسرے سے اتنی دُور نہ رہتے۔ یعنی بحیرۂ ایجین اور بحیرۂ آیونیان کے ساحلوں میں زمانۂ قدیم سے مسلسل آمد و رفت اور تعلق باہمی کا ایک سیدھا راستہ نکل آتا اور جہازوں کو، خواہ سوداگری کے لئے ہوں خواہ جنگ جوئی کے لئے، سارے جزیرہ نمائے پلوپنی سس کے گرد چکر کھانے کی دِقّت نہ اٹھانی پڑتی بلکہ وہ مشرق سے چلتے اور سیدھے وسطِ یونان سے گزر کر مغربی ساحل تک پہنچ جاتے! دوسرے اگر خاکنائے نہ ہوتی تو خشکی کے راستوں کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا اور تجارت کے مرکز بھی اور ہی ہوتے۔ نیز تاریخ یونان کی جن لڑائیوں کا حال ہم اب پڑھتے ہیں ان کی نوعیت کچھ اور ہوتی۔ اس خاکنائے کی اہمیت کا اندازہ بڑے پیمانے پر، اس زمانے کی ایک مثال سے یوں ہوسکتا ہے کہ اگر آج اس قدرتی پُل یعنی خاکنائے کو دور کردیا جائے، جو شمالی امریکہ کو جنوبی امریکہ سے ملائے ہے۔ تو خیال کرو کہ بحرہائے اعظم کے تجارتی راستوں میں اور بحری جنگ کے موقعوں میں کتنا بڑا انقلاب پیدا ہوجائے گا۔

(۳) پھر یہ کہ وہ قدرتی پُل جس نے پلوپنی سس کو ملک یونان سے ملا رکھا ہے، اگر مشرق کی بجائے خلیج کے مغربی سرے پر ہوتا تو اس صورت میں بھی بحیرۂ ایجین اور ممالک مشرقی سے بحری تجارت کا آسان اور قریبی راستہ ان یونانی علاقوں کیلئے نکل آتا جو خلیج کے دونوں جانب واقع تھے۔ اور اس طرح

بالکل ممکن تھا کہ شمال مغربی یونان پر بھی تمدّن کا جلد اور زیادہ گہرا اثر پڑتا، نیز یہ کہ پلوپنی سس سے منقطع رہنے کی حالت میں، علاقہ بیوشیہ اور ایٹی کا کی تاریخ کا رنگ ہی دوسرا ہوتا*

اس خلیج کے بعد دوسرے درجے پر، بحیرہ ایجین کے محلِ وقوع اور اس کے حالات طبعی کا تاریخ یونان پر اثر پڑنا مقدر تھا۔ اس میں بے شمار جزیروں کے بکھرے ہونے کی گویا غایت یہی تھی کہ اُن کے باشندے آپس میں ایک دوسرے سے روابط بڑھائیں اور وہ مجمع الجزایر جسے یونانی سای کلیڈیز (یعنی حلقے) کہتے تھے، آگے بڑھ کر اس طرح جزیرہ بہ جزیرہ ساحلِ ایشیا کے قریبی جزایر تک پہنچ گیا ہے کہ وہ اُن سے جُدا اور غیر متعلق نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ یونان سے ایشیا تک جہازوں کے گزرنے کیواسطے گویا جزیروں کا ایک پُل قدرت نے بنادیا ہے۔ سچ پوچھئے تو ایشیاے کوچک کے مغربی ساحل کا برّ اعظم ایشیا کی بجاے یورپ سے قدرتی تعلق بھی زیادہ ہے اور یہ بہت جلد عالم یونانی کا ایک گوشہ بنگیا تھا۔ پس بحیرہ ایجین کو اگر یونان کا اصلی مرکز قرار دیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا*

مغربی ساحل یونان کو بھی قدرت نے عمدہ بندرگاہیں عطا کردی تھیں۔ اور جزیرہ کرکایرا (موجودہ کارفو) سے ملکِ اطالیہ کی ایڑی تک ،کوئی بعید مسافت نہ تھی۔ لہٰذا مغربی یونان کے باشندوں کے سامنے اُدھر بھی سیر و سیاحت کے لئے ایک دُنیا موجود تھی۔ مگر اس دنیا کے لوگ عہدِ قدیم میں بالکل وحشی تھے اور تہذیب و تمدّن

کا کوئی تحفہ ان کے پاس نہ تھا جسے وہ اپنے یونانی معاصرین کی نذر کرتے پس مشرقی ساحلِ یونان کے باشندوں کی جب نگاہ اُٹھتی، ممالکِ ایشیا کے رُخ اُٹھتی۔ اور وہ مشرق کے سب سے قدیم تمدنوں کی جانب کھنچتے اور اُن سے مستفیض ہوتے تھے۔ گویا زمانہ اولیٰ میں مغربی یونانیوں کی اپنے مشرقی ہم وطنوں سے پس ماندگی کی وجہ یہ نہ تھی کہ مغربی ساحل کی ساخت مشرقی ساحل جیسی اچھی نہ تھی۔ بلکہ اس کا اصلی سبب یہی تھا کہ وہ ایشیا کی طرف واقع تھے اور ان کا رخ اُدھر نہ تھا۔ چنانچہ ایک عرصے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اسی مغربی ساحل آیونیان پر تجارت کی گرم بازاری ہے، اور بہت سے خوش حال شہر آباد اور تہذیب و شائستگی کے میدان میں سب سے آگے قدم زن ہیں +

یونان، پہاڑوں اور چھوٹی چھوٹی وادیوں کی سر زمین ہے جن میں، نہ بڑی بڑی ندیاں ہیں نہ میدان۔ گنتی کے چند میدانی علاقے ہیں بھی تو وہ رقبے میں زیادہ وسیع نہیں۔ یہی سبب ہے کہ یہ ملک الگ الگ بستیاں بسانے کے لئے، جنہیں کوہستانی دیواروں نے ہمسایوں کی دست بُرد سے محفوظ کردیا ہے، قدرتاً موزوں تھا چنانچہ یونان کی تاریخ، حقیقت میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کی تاریخ ہے + یوں تو ہر ملک کی تاریخ پر وہاں کے جغرافی حالات کا کسی نہ کسی حد تک اثر ہوتا ہے لیکن یونان میں ان کا اثر بہت زیادہ اور نمایاں نظر آتا تھا اور یونانیوں کی قومی شیرازہ بندی میں جہاں اور اسباب مانع تھے اُنہی میں ان جغرافی حالات کو بھی اتحادِ ملکی کا ایک

دشمنِ قوی سمجھنا چاہئے - اور ہرچند جزیروں میں الگ الگ ریاستیں قایم تھیں لیکن سمندر اگر پہاڑوں کی طرح باعثِ فصل و افتراق ہوسکتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ ذریعۂ اتحاد و ارتباط بھی بن سکتا ہے مگر پہاڑوں میں یہ صلاحیت نہیں - اور اسی لئے یونان میں ایک بحری سلطنت قایم کرنا بڑی سلطنت قایم کرنے کے برابر دشوار کام نہ تھا۔اسی طرح ، پہاڑیاں زیادہ آمد و رفت اور اُن کے وسایل کی ترقی کے مانع تھیں - حالانکہ ساحل کا جا بجا سے خمیدہ ہونا اور جزیروں کی کثرت ، بحری آمد و رفت میں اور سہولت پیدا کردیتی تھی جس کا ہم اُوپر ذکر کر آئے ہیں ؛

بحیرۂ افشین یا اسود سے جو ہوائیں ساحلِ یونان کی جانب آتی ہیں اُن کے راستے میں کوئی روک نہیں کہ ان کے زور کو کم کردے اور یہی سبب ہے کہ یونان کا موسم کسی قدر شدید اور نشاط بخش ہے جو وہاں کے باشندوں میں جفاکشی اور چستی و چالاکی پیدا کردیتا تھا - اس کے علاوہ یونان کی زمین شاداب و حاصل خیز بھی نہیں ہے - اس میں وسیع و سیراب میدان صرف چند ہیں اور جن وادیوں میں زراعت ہوتی ہے وہاں کی پیداوار اُس رقبے کی وسعت کے لحاظ سے خاطر خواہ نہیں ہوتی ؛ یہاں کی مٹّی میں جَو خوب ہوسکتا ہے ۔ مگر اتنی قوت نہیں کہ گیہوں بھی بخوبی بار آور ہوسکے ۔ غرض اول سے یہاں کے کسانوں کو بڑی محنت اُٹھانی پڑتی تھی اور اس ملکی خصوصیت کا بھی ایک نتیجہ یہ تھا کہ وہ سمندروں میں قسمت آزمائی کرنے پر مایل ہوئے خاص کر جب

افزائشِ آبادی نے وسائلِ معاش میں تنگی پیدا کی تو اِدھر سمندر پار کی زرخیز زمینوں نے انہیں اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اور دوسرے ملکی پیداوار کی کمی پورا کرنے کے لئے باہر سے غلّہ منگانا بھی رفتہ رفتہ ناگزیر ہوگیا۔ بایں ہمہ، گو دیمتر[1] دیوی نے اپنی اعلیٰ نعمتوں سے یونان کو محروم رکھا تھا، لیکن انگور و زیتون کی ملک کے اکثر حصّوں میں کچھ کمی نہ تھی اور ان کی وسیع پیمانے پر کاشت بھی قدیم یونان کی معاشی خصوصیات میں داخل تھی +

۲ تمدّن ایجین (تیسری ہزاری قبل مسیح)

تھسالیہ (یا تھسلی) اور اپیرس وہ علاقے ہیں جہاں ہمیں اول ہی اوّل ایک دھندلی جھلک یونانیوں کی نظر آتی ہے کہ وہ اپنے منصبِ ازلی کی انجام دہی اور مغربی تمدّن و افکار کے نقشِ اوّل کی اختراع و تشکیل میں مصروف ہیں۔ اُن کے سب سے بڑے دیوتا زئیس کی کُہن ترین درگاہ بھی جہاں تک تحقیق ہوا، اِپی رس ہی میں موضع ودونا کے درختانِ بلوط میں تھی۔ لیکن تاریخ قدیم میں اس سے بھی بڑا حصّہ تھسالیہ نے لیا جس کے سب سے پہلے آباد کار، قومیت کے اعتبار سے اکائیائی اور نسلاً یونانی تھے اور قصبہ آرگس* کے میدانوں اور گرد و نواح کے پہاڑوں پر بسنے کے بعد انہی نے وہ داستانیں اور قصّے تراشے جو بعد میں اہلِ

---

[1] DEMETER زرعی پیداوار اور پیدائش یا شادی بیاہ کی دیوی + مترجم *یہ آرگس، تھسالیہ کی جنوب مغربی ساحل کے قریب واقع تھا + م

یورپ کے تخیّل کا مایۂ ناز بنے۔ اسی علاقے میں انھوں نے کوہ اولمپس کو آباد کیا اور اس کی بلندیوں کے زیر سایہ آسمانی ہستیوں کے ساتھ آکر رہے، جن کی بدولت یہ پہاڑی ہمیشہ کے لئے مقدّس و ربّانی کہلانے لگی۔ اسی علاقے میں انہوں نے ۶ رُکن کی بحر میں اپنے گیت بنائے اور قیاس غالب یہ ہے کہ خود یہ نادر بحر بھی اُنہی کی جدّت آفرینی کا نتیجہ تھی۔ لیکن یہ اکائیائی لوگ تھسالیہ کے اصلی باشندے نہ تھے بلکہ ایک اور سرزمین یعنی الّیریہ کے پہاڑوں سے یہاں آئے تھے اور اُن کے بعض قبایل کچھ عرصے بعد یہاں سے دوبارہ اُٹھکر دوسرے علاقوں میں جابسے تھے۔ یعنی اُس زمانے میں جبکہ بحرِ مذکور مکمّل نہ ہوئی تھی اور نہ اُس کی وہ نظمیں امرا کی ضیافتوں میں گائی جاتی تھیں کہ جن کے طفیل ہومر کی شاعری میں اُن قدیم آریائی رسوم و آئین کی پہلی تصویر نظر آتی ہے، جو اہلِ انگلستان اور یونانیوں میں مشترک ہیں۔

مزید برآں جب یونانی مہاجرین، بحیرۂ ایجین کے ساحل پر پہنچے تو انہیں وہاں ایک گورے رنگ کی قوم آباد ملی جو تمدّن میں اُن سے آگے تھی۔ یہ قوم جسے نسلِ ایجین سے منسوب کر سکتے ہیں، تجارت پیشہ تھی اور بہت سے ملکوں کے ساتھ اس کے روابط تھے۔ وہ اطالیہ کی لگوری اور ہسپانیہ کی ای بیری قوم کی مانند یونان میں بھی، آریہ نسل کے آنے والوں سے پہلے آباد تھی۔ اس کے تمدّن کے آثار باقیہ سے جو ٹرواے[۱] جزایر میلوس و امرگوس

[۱] اس لفظ میں "وا" کی آواز ایسی ہے جیسے فارسی لفظ "خواست" میں۔ م

وکریت میں دریافت ہوئے، حال ہی میں اس قوم کی معاشرت کے بہت کچھ خالات ہمارے علم میں آئے ہیں ؛

اُس زمانے میں جب کہ مصر میں خاندانِ دوازدہم کی حکومت تھی کریت یا قریطش میں بہت سی خوش حال بستیاں آباد تھیں (۲۵۶۵ تا ۲۷۷۸ قبل مسیح ؟) اور اُس کی بحری قوّت خاصی مضبوط ہوگئی تھی یا ہوتی جاتی تھی۔ اور غالبًا قبل مسیح دوسری ہزاری کے آغاز میں شہر ناسوس، کریت کے سب سے مستحکم اور دولتمند شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اسی شہر کے شاہی محل کے کھنڈر تھوڑے دن ہوئے کہ زمین میں دبے ہوئے نکلے ہیں۔ اگرچہ پہلی تعمیر کے بعد اس کی بہت کچھ صورت ضرور بدل گئی تھی اور بعد کے بادشاہوں نے اُسے زیادہ آرام دہ اور پُرتکلّف و شاندار بنالیا تھا۔ محل کے پتّھر، جن پر لابیر، یعنی دو زبان تبر کی شکلیں کندہ ہیں، گواہی دیتے ہیں کہ اس محل کے شاہی مکین خدائے لابیر کے عقیدت مند پرستار تھے اور اسی نام سے کریت میں "لابیرنت" یعنی (بھول بھلیّاں) کا افسانہ اختراع کرلیا گیا تھا۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ یہی شاہی محل جو ناسوس کی پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا، اوّل اوّل لابیرنت کے نام سے موسوم ہوا اور بعد میں اوہام پرستی نے اُسے ددالوس[1] کی بھول بھلیّاں بنادیا جس میں منوتور[2] کا مامن تھا ؛

---

[1] یونانی دیو مالا میں یہ شخص اتھنز کا ایک معمار تھا جسے کریت میں جلا وطن کردیا گیا اور وہاں اس نے وہ مشہور بھول بھلیاں تیار کی۔ مینوس شاہ کریت نے جان لینے کیلئے خود اسے اسی قیدخانہ میں ڈال دیا تھا مگر وہ وہاں سے پر لگا کے اڑ گیا؛

[2] یہ ایک انسان چہرہ سانڈ تھا جسے کریت کی بھول بھلیاں میں رکھا گیا اور اتھنز سے سالانہ جو سات مرد اور سات کنواریاں خراج کے طریق پر یہاں بھیجی جائیں انھیں یہی بلا مار کر کھا جاتی تھی آخر میں شاہ تھی سیس نے اسے ہلاک کیا؛ مترجم

جدید تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیاے کوچک کے شمال مغربی گوشے پر جہاں ترکی قلعہ حصارلک واقع ہے اسی عہد میں ٹرواے کی پہاڑی پر ایک بڑا شہر آباد تھا۔ اُس کی تعمیر میں دھوپ کی پکی اینٹ لگائی گئی تھی اور خود وہ ایک قدیم تر شہر کے کھنڈروں پر بسا تھا جس کی تعمیر پتھر سے ہوی تھی۔ اس شہرِ خشت کے تین پھاٹک تھے اور فصیلوں کے گوشوں کو بروج سے مورچہ بند کیا گیا تھا۔ وہاں کے باشندے اُس عہد ظلمت کے رہنے والے تھے جس میں انسان صرف پتھر اور تانبے کا استعمال جانتا تھا۔ کانسہ یا پیتل اُن کے ہاں ابھی تک معدوم تھا۔ لیکن یہاں کا محل جس کے آثار کا سُراغ لگایا جاسکتا ہے، نقشے کے اعتبار سے مجموعی طور پر اسی طرز کا بنا ہوا مکان ہے جس طرز کو ہوؔمر نے اپنی نظموں میں شاید پندرہ سو برس بعد بیان کیا ہے۔ یعنی باہر کے پھاٹک سے، ہم پہلے ایک صحن میں پہنچتے ہیں جس میں قربان گاہ بنی ہوتی تھی۔ اور صحن سے گزر کر پہلے ہمیں ایک مربّع کمرہ ملتا ہے اور وہاں سے اندر کے بڑے دالان یا ایوان میں ہم داخل ہوتے ہیں جس میں آتشدان بنا ہوتا تھا۔ بس، اس طرز کے مکان ہوتے تھے جن کا حال ہوؔمر نے لکھا ہے اور جو ایجینی نسل کے لوگ، یونانیوں کے آنے سے کہیں پہلے بنایا کرتے تھے ⁂

اس عظیم شہر خشت کو غالباً بعثتِ مسیح سے دو ہزار برس

پہلے آگ نے تباہ کیا اور اسی کی بنیادوں پر تین شہر اور تعمیر ہو ہوکر برباد ہوئے۔ اس عرصے میں تمدّن نے ترقی کی۔ پتھر کے دروازوں کی جگہ پیتل کا استعمال ہونے لگا کیونکہ ٹین کی مقدارِ کثیر اب ممالکِ مغرب سے آنے لگی تھی، اور یہی وہ غیر آریائی تمدّن ہے جس کا جلوہ ہم کو پندرھویں صدی قبل مسیح کے قریب، پلوپنی سس کے یونانیوں میں نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ لوگ یہاں کس زمانے میں حملہ آور ہوئے۔ اور حکومتوں کے مرکزوں اور مستقروں میں کون کونسی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ بہر حال مذکورہ بالا معاشرت کی حجری یادگاریں جو ابھی تک زمین کے اُوپر باقی ہیں، تین ہزار برس سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ اور وہ اشیا جو اُس زمانے کی روز مرّہ ضروریات اور نیز تکلفات کا لازمہ تھیں، مرنے والوں کے مکانات کھود کھود کر برآمد کرلی گئی ہیں۔ ان یادگاروں کا زیادہ حصّہ شہر ارگوس (یا ارگسؔ[1]) کے میدان سے، جہاں سمندر کے قریب قدیم تِرِنز واقع تھا، اور شہر مای کینی سے دستیاب ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مای کینی، اُس عہد میں، ساحلِ ایجین کے علاقوں میں سب سے دولتمند اور مضبوط شہر تھا کہ ہومر اسے "زرنگار" کا لقب دیتا ہے۔ اور اس کے زمانۂ فروغ کی ساری تہذیب یا تمدّن کو بھی اُس کے نام پر مای کینی تمدّن کہنے لگے ہیں ✦

---

[1] یہ آرگوس، جزیرہ نمائے پیلوپنی سس کا ایک شہر اور علاقہ آرگوس کا صدر مقام تھا۔م

سمندر سے کوئی ڈیڑھ میل فاصلے سے، ایک نیچی اور لمبی پہاڑی پر ترنز کے آثار ہیں۔ شہر کے اِردگِرد کسی زمانے میں دلدل تھی۔ اس کی پہاڑی شمال سے جنوب کی طرف بلند ہوتی گئی ہے اور اسی کو انسانی دستکاری نے تین چبوتروں کی شکل میں کاٹ دیا ہے جس کے جنوبی اور سب سے بلند چبوترے پر محل شاہی واقع تھا۔ اس کُل شہر یا قلعے کے گرد نہایت مستحکم حصار بنایا تھا جن میں بہت بڑے بڑے پتھر باقاعدہ چُنے ہوے تھے مگر اُن کی تراش بھدّی اور رخنہ بندی صرف چکنی مٹّی کے گارے سے کی تھی۔ اس طرز تعمیر کو "سای کلوپین" یعنی جنّاتی کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نسبت یہ افسانہ مشہور تھا کہ ترنز کی فصیل چننے کے لئے ریاست لیسیہ کے "سای کلوپ"[۱] بلائے گئے تھے۔

ساحل سے ۱۲ میل کے قریب اندر ہٹ کر، ارگوسی میدان کے شمال مشرقی کونے پر **مای کینی** کا مضبوط قلعہ ایک کوہستانی وادی میں، سطح سمندر سے ۹ سو فیٹ اونچا واقع تھا۔ اس کی شکل مثلث نما ہے اور فصیل کے حصۂ اعظم کی طرزِ تعمیر ترِنز کی مثل "جنّاتی" ہے۔ مگر اِس میں پتھر اتنے بڑے نہیں ہیں۔ دوسرے ایک بڑا فرق جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترِنز کے بعد کی تعمیر تھی، یہ ہے کہ ردّوں میں جو

---

[۱] قدیم یونانیوں کے خیال میں یہ عفریت یا جنّات کی قوم تھی اور ان کی پیشانی کے بیچ میں صرف ایک گول آنکھ ہوتی تھی۔ م

پتھر چنے ہیں، اُنہیں احتیاط سے تراش کر چوکور بنالیا ہے ۔ قلعے کے شمال مشرقی پہلو پر، فصیل کے نیچے سنگین تہ خانہ بنایا ہے اور وہاں سے ایک سرنگ اندر ہی اندر پہاڑی کے دامن تک پہنچتی ہے ۔ اور فصیلوں کے باہر سے ایک بارہ ماسی چشمے کا یہاں منہ اور اُس کا پانی جمع رکھنے کے لئے چڑیا حوض بنا ہوا ہے کہ محاصرے کی حالت میں قلعہ بند فوج کی آبرسانی کرتا رہے ۔ اس قلعے کے دو دروازے تھے صدر دروازے میں سردل کی بجائے ایک بڑی چٹان کو لگایا ہے اور پایوں پر بوجھ کم کرنے کے لئے، اوپر دونوں جانب سے مثلث نما فصل چھوڑ دیا ہے ۔ مگر بیچ میں جو جگہ باقی رہی اُس پر پتھر لگا کے بُت تراشی کا ہنر دکھایا ہے۔یعنی دو شیرنیوں کی مورت، بالمقابل، اُبھری ہوی ہے اور ان کے بیچ میں ایک ستون کی تصویر ہے جس کے بیل پایے پر انھوں نے اگلے پنجے ٹکا رکھے ہیں۔ گویا یہ قلعے کی چوکیدار تھیں۔ انہی کے نام پر اب اس دروازے کو "شیر دروازہ" کہنے لگے ہیں ۔

تِرنز کی پہاڑی پر جو کھنڈر ہیں، اُن سے شاہی محلات کے نقشے کا سراغ چل سکتا ہے اور معلوم ہوتا ہے اس عہد کی عمارتوں میں ایک خاص اصول یہ مدّ نظر رکھا جاتا تھا کہ مکان کے مردانہ اور زنانہ حصّے ایک دوسرے سے جدا رہیں۔ اور یہ وہ اصول ہے کہ تاریخی زمانے میں بھی اہل یونان کی خانگی عمارات میں اس کی پابندی کی جاتی تھی ۔ بادشاہ اور بادشاہ بیگم

کے ایوانات کا نقشہ وہی ہے جس کے مطابق ٹروائے کے محل اور وہ محلّات بنے ہوئے ہیں جن کو ہومر نے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ مردانہ حصّہ مکان میں ہر طرف ستونوں کے دالان اور صحن میں قربان گاہ ہوتی تھی۔ مکان کے دروازے کے سامنے ہی جو دالان ہوتا وہ گویا عام نشست گاہ یا دیوان خانہ تھا اور اس میں دو پٹ کے دروازے کمرے میں جانے کے واسطے بنے ہوتے تھے۔ اور اس سے دوسرے کمرے میں راستہ جاتا تھا جس کے دروازے پر پردہ پڑا رہتا۔ یہ اندر کی ڈیوڑھی تھی جس کا فرش پختہ ہوتا اور جس سے گزر کر دیوان خانے کے اندرونی کمرے میں پہنچتے تھے۔ اس کمرے کے بیچ میں بلکہ کُل مکان کے وسط میں ایک گول آتش دان بنا ہوتا تھا اور اسی کے گرد چار چوبی ستون ہوتے، جن پر چھت ٹکی رہتی تھی + ماے کینی کے محل کی بھی (جو پہاڑی کے سب سے بلند حصّے پر بنایا گیا تھا) وضع اور اکثر اندرونی حصّے اسی قسم کے تھے۔ سنگ تراشی اور نقاشی سے دیواروں کی تزئین، اُس زمانے کا دستور تھا اور ترنز کے دیوان خانے کے اگلے دالان میں بھی بے جرم سنگ مرمر کا حاشیہ لگایا تھا جس میں نیلی کانچ کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ اور دیوار پر تصویروں سے دونوں شہروں کے دیوان خانوں کو زینت دی گئی تھی +

قلعے اور محل کے علاوہ، شاہانِ ماے کینی کے آثارِ باقیہ

میں سب سے زیادہ قابل توجہ چیز، اُن کے مقبرے ہیں۔ اس شاہی قبرستان کا احاطہ، شیر دروازے کے جنوب میں مغربی فصیل کے قریب دریافت ہوا ہے اور اس میں چٹانوں کے اندر ہی اندر ۶ قبریں عمود وار کاٹی ہیں۔ اور آخری مُردے رکھے جانے کے بعد سے کسی انسان نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ مَردوں کی نعشوں کے ساتھ ہتیار بھی رکھ دیئے ہیں اور بعض کے چہرے زرّین نقابوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ ان کے قیمتی زیور اور اشیائے خانہ داری مدفون ہیں اور اُن کے سروں کو سونے کے ٹکٹ سے سجایا ہے۔ لیکن یہ قبریں پھر سیدھی سادی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں دولتمند شاہانِ مای کینی کو ان سے زیادہ شاندار مدفن بنانے کا خیال پیدا ہوا یا ایک دوسرے قیاس کے بموجب، وہ قدیم بادشاہ ہی ایک دوسری قوم کے بادشاہوں سے مغلوب ہوگئے اور نئے آنے والوں کے ساتھ ان کے مقابر کی وضع بھی اور ہوگئی۔ ان مقبروں کے گنبد، پہاڑی کے دوسرے پہلو میں قلعے سے قریب اندر ہی اندر پتھر تراش کر بنائے گئے ہیں اور ان میں سب سے وسیع "ات ریوس کا خزانہ" کہلانے لگا ہے حالانکہ اُسے خزانہ سمجھنا درست نہ تھا۔

مگر بادشاہوں کے شاندار مقابر کے علاوہ، اُن سے کم درجے کے لوگوں کی بھی قبریں چوکور خانوں کی صورت میں

پہاڑی کے اندر ترشی ہوئی نکلی ہیں۔ قلعہ کے نیچے **مای کینی** کی آبادی اصل میں کئی دیہات کا مجموعہ تھی جن میں سے ہر گانوں کا نام نشان اور نیز قبرستان جدا گانہ تھا گویا گانوں سے ترقی کرکے رفتہ رفتہ شہر بننے سے پیشتر، تمدن کی یہ وسطی منزلِ ارتقا تھی جس کا نمونہ **مای کینی** اور غالباً اس عہد کی اور بستیوں میں، نظر آتا ہے۔ یعنی یہ کہ چھوٹے چھوٹے کئی گانوں کسی قلعے کی حفاظت میں ایک دوسرے سے متصل آباد ہوجاتے تھے*

قلعے کی پہاڑی پر، بادشاہی قبروں کے اندر جو طلائی ساز و سامان مدفون و مخفی تھا، اس کا ذکر ہم اُوپر کر آئے ہیں کہ وہ ریاستِ مای کینی کی کثرت مال ثابت کرتا ہے۔ عجب نہیں کہ اسی قسم کی گراں بہا چیزیں، اگر بعد کی دستبُرد سے بچی رہتیں تو آج بعض بیرونی گنبدوں کے اندر بھی ہمیں دستیاب ہوتیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قدیم تمدّن کے مطالعہ کے لئے ہماری نظر میں کمہاروں کے برتن اور برنج گر کی دستکاری یعنی آلاتِ امن و جنگ، قیمتی زیوروں سے زیادہ بکار آمد ہیں۔ اور روز مرہ ضروریات کی یہ چیزیں غریبوں کی سنگ دوز قبروں اور بادشاہوں کے مقبروں سے ہمیں دستیاب ہوگئی ہیں اور ان آلات کو دیکھکر جو اُس عہد کے لوگ استعمال کرتے تھے یا اُن کے صنّاعوں کی مصنوعات سامنے رکھکر ہم اُن کے لباس، اسلحہ اور زیورات کی ایک مٹی مٹی تصویر اپنے ذہن

میں کھینچ سکتے ہیں اور فی الجملہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُن لوگوں میں صنعت و فن کی استعداد کتنی تھی ؀

اس دَور کی ایک اور یادگار جس کی تاریخی منزلت، مای کینی کے قلعے سے بھی دعوےٰ ہمسری کرسکتی ہے، کریٹ کے شہر ناسوس کا محل ہے جس کی بنیادیں حال میں کھود کر نکالی گئی ہیں ؀ دولت و تعیّش کے اعتبار سے ناسوس کے مالک بھی ضرور خداوندانِ مای کینی کے برابر ممتاز ہونگے لیکن آرگوسی قلعے اور اس کریٹی محل میں ایک فرق ہے جو مورّخ کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ترنز اور مای کینی کی طرح کوئی جنگی فصیل ناسوس کو گھیرے ہوئے نہیں ہے۔ دروازوں کے علاوہ اس میں کوئی استحکامات نہیں بنائے گئے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ تخت نشینانِ ناسوس، بحری بادشاہ تھے اور اُن کی اصلی قوّت، جہاز تھے۔ شاہی ساز و سامان اور خزانہ رکھنے کے لئے، اس محل میں پہلو بہ پہلو کوٹھڑیوں کا سلسلہ بنا ہوا تھا اور گراں بہا اشیاء کیواسطے پتھر کے صندوق اور اجناس کے لئے بڑے بڑے بہت سے گھڑے یہاں دستیاب ہوئے ہیں۔ اپنی املاک کی صحیح فرد اور حساب کتاب بھی یہاں کے بادشاہ رکھا کرتے تھے کیونکہ فنِ کتابت سے اہلِ کریت پوری طرح شناسا ہوچکے تھے اور حقیقت میں یہی اُنکا وہ عہدِ عروج ہے جس میں زیادہ سے زیادہ حصّہ جو کسی وقت بھی تاریخ عالم میں اُنہیں

لینا مقدر تھا، وہ لے رہے تھے۔ غرض ناسوس کے محل سے اُن کے سینکڑوں نوشتے نکلے ہیں۔ لکھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی مٹی کی تختیاں تھیں جنہیں چوبی صندوقوں میں بحفاظت رکھکر مہر لگادی جاتی تھی۔ یہ تحریریں جس خط میں منقوش یا مکتوب ہیں اُس میں لکیریں سی بنی ہوتی ہیں اور وہ اب تک سمجھ میں نہیں آسکا ہے لیکن اتنا معلوم کرلیا گیا ہے کہ اس میں کُل ستّر حروف یا علامتیں ہوتی تھیں *

ان لوگوں کا تمدّن جن کی یادگاروں کے متعلق ہم بحث کررہے ہیں عصرالنحاس یعنی اُس دَور سے تعلق رکھتا ہے جس میں انسان کانسے اور تانبے سے کام لینا سیکھ گیا تھا لیکن اِس دَور کے اواخر تک لوہا اس قدر نایاب اور قیمتی شئے تھا کہ وہ صرف زیورات (مثلاً انگوٹھی، چھلا) یا شاید سِکّہ بنانے کے کام آتا تھا۔ اسلحہ میں، اہل مای کینی حملہ کرتے وقت، تلوار برچھی اور کمان استعمال کرتے تھے اور بچاو کے لئے ان کے پاس بڑے بڑے خود ہوتے تھے جنہیں غالباً چمڑے سے تیار کیا جاتا تھا۔ اور نیز چرم گاؤ، گردن سے قریب پانوں تک، ان کی سپر کا کام دیتا تھا حملہ اس سے بہمہ وجوہ حفاظت ہوجاتی تھی لیکن وہ اس قدر بھنگم ہوتا تھا کہ اسے قابو میں رکھنا ہی جنگی تعلیم کا بڑا ہُنر تھا۔ بادشاہ دو گھوڑے کی جنگی رتھ میں لڑنے نکلتے تھے جس میں کھڑے ہونے کے لئے ایک تختہ اور اِدھر اُدھر

کنگورہ دار کٹہرا لگا رہتا تھا۔ نقرئی کشتی کے ایک ٹکڑے پر جو مای کینی کے کسی پہاڑی مقبرے سے برآمد ہوا ہے اُس عہد کی لڑائی کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ لڑائی کسی پہاڑی شہر کی فصیلوں کے سامنے ہورہی ہے جس کے مورچوں سے عورتیں کھڑی تماشا دیکھتی اور ہاتھ ہلارہی ہیں +

لوگ بڑے بڑے بال رکھتے تھے مگر یہ کھُلے ہوے نہ چھوڑے جاتے تھے بلکہ جُوڑا باندھ لیا جاتا یا زلفیں گوندھ لی جاتی تھیں۔ اوّل اوّل وہ ڈاڑھی مونچھیں بڑھنے دیتے تھے لیکن بعد میں یہ شعار بدل گیا اور جیسا کہ ان کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے، وہ لبیں منڈوانے لگے تھے۔ اور ان کی قبروں میں اُسترے بھی پائے گئے ہیں۔ ان کا لباس سیدھا سادا ہوتا تھا۔ یعنی ایک تہ بند اور اوپر لبادہ جس میں بکسُوا لگا لیتے تھے۔ بعد میں اس کی جگہ کُرتے نے لے لی تھی۔ اونچے گھروں کی عورتیں تنگ انگیا اور ڈھیلے لہنگے پہنتی تھیں۔ اور پیشانی پر ایک سر پیچ باندھنا، ان کے لباس کو اور ممتاز کردیتا تھا اور بالوں میں چھلّے یا اُوپر اُٹھے ہوئے چاند بنانا، جن کے سرے پیچھے پڑے رہتے تھے اُن کا خاص بناو تھا۔ مای کینی کے شاہی مقابر سے جو سامانِ آرائش نکلا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ وہاں کی بادشاہ زادیاں زرتار و درخشاں لباس پہنتی تھیں +

ہم نے مای کینی، ترنز اور ناسوس کے آثارِ قدیمہ کا مفصل

حال اس لئے بیان کیا کہ وہ ایجینی تمدن کی، جس کا اثر دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا، سب سے زیادہ سبق آموز یادگار ہیں اور اوّل الذکر دونوں مقامات کے سوا اور کہیں جزیرہ نمائے پلوپنی سس میں قلعے یا بڑے بڑے محلات نہیں دریافت ہوئے۔ اگرچہ اسی نمونے کے بعض بڑے بڑے قبہ دار پہاڑی مقبرے ظاہر کرتے ہیں کہ ان مقامات پر بھی کسی زمانے میں بستیاں ہونگی۔ مثلاً ایک شہر امیکلی ہے جو یونانی اسپارٹہ کے عروج سے قبل وادئی لقونیہ میں عروس البلاد سمجھا جاتا تھا۔ اُس کے بادشاہوں نے اپنے لئے ایک بلند و رفیع مقبرہ پہاڑی میں ترشوایا تھا اور "خزانہ ات ریوس" کی طرح اس پر کسی رہزن نے ڈاکہ بھی نہیں ڈالا۔ چنانچہ اس کے گنبد سے اور خزاین کے ساتھ مای کینی صناعی کے وہ نمونے بھی نکلے ہیں جو برآمد شدہ اشیا میں سب سے بیش بہا ہیں۔ یعنی سونے کے دو پیالے، جن پر زرگر نے اپنی بے مثل ہنر مندی سے جنگلی سانڈ کے دام میں لانے اور پھاندنے کی مجلّی تصویریں دکھائی ہیں ؎

علاقہ اٹی کا میں بھی بہت سی یادگاریں ہیں۔ شہر ایثنہ یا ایتھنز کے قلعے کے بعض پتھروں کو کسی نہایت قدیم محل کی یادگار بتایا جاتا ہے لیکن فصیل کی قدیم بنیادوں کی نسبت ہم زیادہ یقین کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ اُسے اہل ایتھنز پلارجی یا پلاس جوی فصیل کہتے تھے اور

کچھ عجب نہیں کہ اس لفظ نے در اصل فصیل بنانے والوں کا نام زندہ رکھا ہو جو اس مقام کے پہلے بسنے والے اور پلاس جوی قوم کے نام سے موسوم تھے ٭

مگر یہاں سے بڑھکر قابلِ دید یادگاریں علاقہ بیوشیہ میں باقی ہیں۔ اس کے مغربی ساحل پر دلدلی علاقوں میں جو لوگ بستے تھے ان کی دولتمندی ضرب المثل تھی اور اُن کے شہر ارکومنوس کو بھی مای کینی کی مثل ہومر نے "زرنگار" کے لقب سے ممتاز کیا ہے ٭ یہاں کے ایک بادشاہ نے قلعہ کی پہاڑی کے نیچے گنبددار مقبرہ بنایا تھا جسے زمانۂ ما بعد میں لوگوں نے خزانہ سمجھ لیا۔ وسعت کے اعتبار سے بھی وہ اگر برابر نہیں تو "خزانہ ات ریوس" کے قریب وسیع تھا ٭

لیکن ایجینی تہذیب کے آخری عہد فروغ میں جو شہر اس تمدن میں شریک و سہیم تھے اُن میں اُس شہر سے زیادہ وسیع کوئی نہ تھا نہ کسی کے نصیب میں اُس سے زیادہ مشہور ہونا لکھا تھا جتنا کہ آنبائے دردانیال کی جنوبی پہاڑی کا شہر ٹرواے مشہور ہوا۔ اسی پہاڑی پر پانچ شہر پہلے بس کر اُجڑ چکے تھے اور انہی کے کھنڈر برابر کرا کے نیا ٹرواے آباد ہوا تھا جس کی شہرت کے طفیل خود اس مقام کے نام کو یورپ کے شہر و دیار میں ہمیشہ کے لئے بچّے بچّے کی زبان پر ہونا، مقدّر تھا نئے

شہر کا دَور سابقہ شہروں کی نسبت کہیں زیادہ وسیع تھا۔ مضبوط سنگی فصیل کے اندر کئی کرسیاں دے کر سب سے بلند مقام پر قلعے کی عمارت بنائی تھی اور مای کینی کی طرح، ضرور ہے کہ اسی چوٹی پر یہاں کا شاہی محل ہوگا فصیلوں کے اندر جن مکانات کی بنیادیں نکالی جا چکی ہیں ان کا سیدھا سادہ طرز وہی ہے جس کا نمونہ ہم مای کینی، ترنز اور قدیم شہرِ خشت کی عمارات میں دیکھ چکے ہیں۔ فصیل میں تین یا چار دروازے چھوڑے گئے تھے اور صدر دروازہ جنوب مشرقی پہلو پر تھا جس کی حفاظت ایک بغلی برج بنا کر کی گئی تھی۔ اس کے معمار، ارگوسی قلعے بنانیوالوں کی نسبت زیادہ ہنرمند تھے اور ان کی تعمیر دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ فصیلیں کسی بعد کے زمانے کی بنی ہوی ہیں یا ابتداہی سے اہلِ ٹروائے فنِ تعمیر میں اس قدر ترقی حاصل کر چکے تھے؟ لیکن اگر جنگی استحکامات کی تیاری میں ان لوگوں کی فوقیت ظاہر ہوتی ہے تو اور کئی لحاظ سے اُن کا تمدّن آرگولس کے برابر ترقی یافتہ نہیں نظر آتا گو وہ ایجینی تمدّن سے رابطہ ضرور رکھتے تھے اور مای کینی کے روغن کئے برتن اُن کے ہاں دساور آتے تھے بایں ہمہ ٹروائے ایک حد تک "مای کینی دنیا" سے الگ اور باہر ہے۔ یعنی گو اس سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتا ہے مگر اس کے حلقے میں شمار نہیں ہوتا؛ اور یہ قدرتی

بات تھی۔ کیونکہ نسل و زبان کے لحاظ سے اہل ٹروائے
بالکل غیر تھے۔ ان کی اصلی نسل کی ہمیں پوری تحقیق ہے
اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ ملک (فرِغیہ یا) افروجیہ (شمالی
ایشیائے کوچک) کی ایک قوم تھے اور وہ زبان بولتے تھے
جو انگریزی زبان سے فی الجملہ ہم اصل تھی ÷

۳۔ تمدن ایجئینی کی باقیات سے کیا نتائج اخذ ہوتے ہیں؟

مای کینی تہذیب کے حلقہ اثر اور آثارِ خصوصی پر سرسری
نظر ڈالنے کے بعد اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا مٹی
اور پتھر، سونے اور کانسے کے ان "مکتوبات" میں کوئی ایسی
شہادت موجود ہے جس سے اس تمدن کے آغاز و فروغ
اور زوال کے زمانے کا تعین کیا جا سکے؟ پہلی بات تو
یہ ہے کہ یہ تمدن اُس عہدِ قدیم سے تعلق رکھتا ہے جبکہ
انسان کانسے کا استعمال سیکھ گیا تھا اور عصر الحدید یعنی
لوہے کے اوزاروں کا زمانہ ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ چنانچہ
تمدن مذکور کے اواخر تک لوہا ایک قیمتی اور کم یاب
دھات تھی۔ اس کی انگوٹھیاں بننے لگی تھیں مگر اسلحہ ابھی
تک اس سے نہیں بنائے جاتے تھے؛ اب جہاں تک
تحقیق ہوا، یونان میں یہ عصر الحدید دس صدی قبل مسیح
سے کچھ بہت پہلے شروع نہیں ہوتا اور اگر عصر النحاس

کا آغاز، ۲ ہزار سال قبل مسیح کے قریب مان لیا جائے تو ہم سرسری طور سے اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ مای کینی تہذیب کا عروج و زوال، اسی قبل مسیح دوسری ہزاری میں ہوا ہے۔

کریت والوں کو فنِ کتابت سے واقفیت تھی مگر ہم ان کے حروف اور زبان نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن ملک مصر میں جو شواہد ملے ہیں وہ اُس عہد کا سراغ دیتے ہیں جس میں ایجینی کمہار برتن بنا بناکر سمندر پار ملکوں میں بھیجنے لگے تھے۔ مصر کے قدیم شہر تھیبز میں، سولہویں صدی قبل مسیح کی بنی ہوئی ایک تصویر نکلی ہے جس میں ایجینی وضع کے لوگ مای کینی ظروف ہاتھ میں لئے، دکھائے گئے ہیں۔ ایک اور شہر گورب سے متعدّد صراحیاں برآمد ہوئی ہیں جو ممالک ایجین ہی سے بن کر یہاں دساور آئی تھیں۔ اور یہ گورب پندرھویں صدی قبل مسیح میں بنا اور دو تین سو برس کے بعد برباد ہوگیا تھا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ وہ صراحیاں مای کینی تمدّن کے عہدِ آغاز کی یادگار نہیں ہیں بلکہ آخری عہد میں تیار کی گئی تھیں۔

پھر یہ کہ مصر کی شہادت، خود سرزمینِ مصر تک محدود نہیں بلکہ بحیرۂ ایجین کے دونوں طرف دستیاب ہوئی ہے چنانچہ تمن چینی کے برتن ملے ہیں جن میں سے ایک پر امن ہوتب ثالث، شاہِ مصر (پندرہویں صدی ق م) کا

نام اور دو پرُاسی کے نام کی "کارٹوشی لوح" بنی ہوئی ہے ایک اُس کی بیگم کے نام کا تعویذ مای کینی کے مقبروں سے اور ایک خود اُس کے نام کا جزیرہ رودس میں قصبہ لالی سوس کے قبرستان سے نکلا ہے۔ اور ان سب کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ اگر پہلے نہیں تو کم از کم پندرھویں صدی ق م میں یہاں پٹے ہوئے اور گنبد نما مقبرے بننے لگے تھے*

غرض یہ اور بعض اُن سے بالکل جُداگانہ شواہد کو ملاکر ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمدّن جس کے مای کینی اور ناسوس بڑے مرکز تھے، سولھویں سے تیرھویں صدی قبل مسیح تک اپنے عین عروج پر تھا* اور سواحلِ ایجینی پر یہی تمدّن تھا جس میں یونانی قوم شرکت اور پھر قلبِ ماہیت کرنے کے واسطے آئی؛ اس تمدّن کو جن لوگوں نے پیدا کیا وہ مغربی نسل سے تھے اور قدیم زمانے سے کرۂ ارض کا یہ گوشہ ان کی ملک تھا۔ اور یہ اعادہ کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ انہی کا ابتدائی تمدّن، جس کی جھلک عصرالنحاس شروع ہونے سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں، یونانیوں نے اختیار کیا اور وہی بہ تسلسل ترقی پاکر "یُونانی تمدّن" کی صورت میں جلوہ گر ہوا؛ بہرحال، یہ فرض کرنے کا کوئی قرینہ نہیں کہ یہ قدیم باشندے کسی واحد و

۱؎ کارتوشی لوح سے مراد ایسا نقش ہے جس کے کنارے مڑے ہوئے بنائے گئے ہوں۔م

مشترک نام سے موسوم تھے۔ بلکہ کچھ شبہ نہیں کہ مختلف مقامات پر جو قومیں یا فرقے آباد تھے ان کے نام بھی جداگانہ ہونگے چنانچہ اتنا تو متحقق ہے کہ تھسالیہ اور اٹی کا میں پلاس جی قوم آباد تھی اور اہل ارکیدیہ کی نسبت بھی روایت کی جاتی ہے کہ وہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن الگ الگ نام ہونے کے باوجود، قیاس غالب یہ ہے کہ جزائرِ ایجین اور سرزمینِ یونان کے یہ پرانے باشندے نسلاً کسی ایک اور سانولے رنگ کی غیر آریا قوم سے تھے اور ایشیائے کوچک کے اضلاعِ میسیہ، لدیہ، کاریہ، کے باشندے (اور شاید اہلِ ساحل) بھی اسی کے ہم خاندان تھے +

اس میں کچھ شک نہیں معلوم ہوتا کہ یہ قدیم اور ماقبلِ تاریخ زمانے کے ایجینی باشندے، بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مگر ان کے باہمی تعلقات یا اُس عہد کے سیاسی واقعات کا ہمیں مطلق علم نہیں۔ البتہ یہ بات قریب قریب درجۂ یقین تک پہنچ گئی ہے کہ ان قدیم ریاستوں میں "زرنگار مای کینی" خاص امتیاز رکھتا تھا۔ اُس کے مقبروں سے جو دفینے نکلے ہیں وہ ایجین کے اور تمام دفاین سے زیادہ ہیں جس سے اپنے معاصرین کے مقابلے میں اس کی ثروت کا پتہ چلتا ہے۔ پھر یہ کہ وہاں کے سردار محض دولتمند ہی نہ تھے بلکہ اپنے قرب و جوار کے علاوہ دُور دُور تک ان کا تسلّط تھا +

۱۷



اس واقعہ کا ثبوت ان شاہراہوں سے ملتا ہے جو مائی کینی سے کورنتھ تک بنی ہوئی تھیں اور جنہیں یقیناً وہیں کے کسی بادشاہ نے تیار کرایا تھا۔ ایسے تین اننگ اور سنگین

راستوں کا سراغ لگا ہے جن میں سے دو کلیونی پر آکر مل جاتے تھے اور مشرقی یعنے تیسرا راستہ تینیہ سے گزرتا تھا۔ ان تینوں کے نیچے وہی "جناتی" طرز کا فرش بنا ہوا ہے۔ راستے کی ندّیوں پر پُل باندھے ہیں اور چٹانوں کو بیچ میں سے کاٹ دیا ہے۔ چونکہ یہ سڑکیں اتنی چوڑی نہیں ہیں کہ چھکڑے یا گاڑیاں اُن پر سے گزر سکیں لہذا گمان غالب یہ ہے کہ مای کینی کے ظروف خچّروں کی پیٹھ پر لد لد کر خاکنا ے کورنتھ تک پہنچتے تھے*

بحیرۂ ایجین میں بحری تجارت کو فروغ تھا اور مصر و ٹروائے تک جہازوں کی خوب آمد و رفت تھی لیکن مای کینی کے بحری قوّت ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور تمام قراین یہی کہتے ہیں کہ اُس عہد میں کریت ہی سمندر کا بادشاہ تھا، اور وہیں کے تاجر سواحلِ ایجین کے باربردار تھے۔ شاہِ مینوس کا تذکرہ بھی کریت کے اس بحری تفوّق کی یاد دلاتا ہے۔ اور کہانیوں میں اُسے نہایت طاقتور بحری بادشاہ بتایا گیا ہے جس نے ایجین کو بحری قزّاقوں سے پاک کیا اور سمندری سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی*

ناسوس کی پہاڑی پر زمین کھدوانے سے جو اشیا برآمد ہوی ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ یہ کہانیاں تاریخی واقعیّت سے خالی نہیں ہیں۔ وہاں کے بڑے محل کے کھنڈر، جن کا اُوپر ذکر آچکا ہے، گواہی دیتے ہیں کہ دو سو تین سو برس تک وہ ایک دولتمند خاندان شاہی کا تختگاہ رہا جو بحری بادشاہ

تھے۔ یہ سوال دوسرا ہے، کہ آیا اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ اور اس بحری بادشاہت کے بانی مبانی کا نام بھی مینوسؔ تھا یا نہیں؟ اگرچہ محض یہ حقیقت، کہ یونانی دیو مالا میں مینوس کو زیئسؔ دیوتا کا بیٹا بتایا گیا ہے، ہماری نظر میں اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم اس کے تاریخی وجود ہی سے اِنکار کردیں۔ تاہم قیاسِ غالب یہ ہے کہ در اصل مینوس، شہرِ ناسوس کے قدیم بادشاہوں کا معبود تھا اور جب یونانی حملہ آوروں نے ان بادشاہوں کو مغلوب کیا تو ان کا دیوتا بھی یونانی فاتحین کے خدا، زیئسؔ سے مغلوب اور معزول ہوگیا اور بعد میں اُس خُدائے غاصب کی فرزندی پر اُسے قناعت کرنی پڑی۔ بہر حال شاہ مینوسؔ، آدمی تھا یا دیوتا، یا دونوں، اِس میں کلام نہیں کہ بعد میں جو واقعات اُس کے افسانے کے ساتھ الحاق کردئے گئے، مقامی واقعات و حالات میں ان کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہوگی۔ مثلاً بہت ممکن ہے کہ لابیرنت (جسے افسانے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ بھول بھلیاں دِدالوس جیسے عجیب کاریگر نے مینوس کے لئے تعمیر کی تھی) اصل میں "قصر لابیر" (بمعنی تبر دو زبان) ہو اور مینوسؔ، یا اُس شخصِ اصلی کو جو اس نام سے مشہور ہوگیا ہے، یہ قصر شاہانِ متقدمین سے ترکے میں پہنچا ہو*

یونانی افسانوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مینوس نہ صرف بحری بادشاہ تھا بلکہ قوانین بھی اُسی نے بنائے تھے اور اپنے باپ زیئسؔ سے وہ ان کی تعلیم حاصل کرنے پہلے دکتی کے

غار کے اندر گیا تھا؛ یہ وکتی وہ مقام ہے جو شہر ناسوس کے
جنوب میں ایک قطعۂ مرتفعہ پر واقع تھا اور وہ مقدس غار بھی
جس میں بیان کیا گیا ہے کہ خود زئیس دیوتا کی پرورش ہوئی تھی
زمانۂ جدید کی تلاش سے نہیں بچا ہے بلکہ وہ سب چڑھاوے
جو اتنک اس کے تنگ و تار گوشوں میں مخفی پڑے تھے نکال
لئے گئے ہیں۔ یہ تحائفِ نذر و نیاز پہلی مرتبہ ناسوس کے اُسی
عہد عروج میں یہاں چڑھائے گئے ہوں گے جس عہد سے
فسانۂ مینوس کا تعلق ہے ٭ دولتِ ناسوس کے آغاز کا زمانہ
پندرھویں صدی قبل مسیح اور قیام شاید تیرھویں صدی تک
رہا۔کم سے کم یہ قیاس تو ضرور درست معلوم ہوتا ہے کہ شہر
ناسوس، مای کینی سے پہلے تباہ ہوا ٭

اُن کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے ہیں ان کی بناء پر ریاستہائے
ایجین کے سازو سامان اور قوت کے متعلق کوئی قطعی رائے
قایم کرنی دشوار ہے البتہ وسعت کے اعتبار سے ہم بیان
کرچکے ہیں کہ یہ ریاستیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ زمانہ ایسی
ریاستوں کا تھا کہ وہ کوئی چاہے تو ایک دن میں ایک سلطنت
کو طے کرسکتا تھا؛ اور گو یہاں کے بادشاہ یا رئیسوں کے ہاں
بھی مشقت کا کام کرنے کے واسطے غلام موجود تھے اور بے
شبہ اُن کے بڑے بڑے مقبرے اور قلعے انہی بندگان مجبور
کے ہاتھوں تعمیر ہوئے ہونگے، تاہم ایک ہی واقعہ یہ دکھانے
کے لئے کافی ہے کہ ان ریاستوں کی وسعت و بضاعت، مصر

یا مشرقی تاجداروں کے مقابلے میں کس قدر کم تھی ۔ وہ یہ کہ اگر یونان میں بھی بابل یا مصر کے بادشاہوں کی حکومت ہوتی، جن کے پاس بیگار کی کمی نہ تھی، تو کچھ شک نہیں کہ مشرقی اور مغربی سواحل میں آمد و رفت کا راستہ نکالنے کی غرض سے وہ خاکنائے کورنتھ میں نہر بنوا دیتے تاکہ بحری تجارت میں سہولت پیدا ہوجائے ۔

۴۔ یونانی قوم کا تسلط

یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ آریہ نسل کے یونانیوں نے تمام غیر آریہ اور ایجینی آبادی کو معدوم کردیا یا اپنا غلام بنالیا تھا۔ اوّل تو خود یہ آنے والے ہی بالکل آریہ نسل کے لوگ نہ تھے۔ اگرچہ ان کے بعض افراد کی رگوں میں آریہ خون تھا اور اُنہی سے آنے والوں نے اپنی طرزِ معاشرت، زبان، اور بعض دیوتاؤں کی پرستش سیکھی تھی۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ وہ گورے رنگ کے لوگ جو یونان کے زمانہ تاریخی میں پائے جاتے ہیں ابتدا میں باہر کے حملہ آوروں کے ساتھ آئے تھے تاہم ظنِ غالب یہ ہے کہ ان آنے والوں میں اکثر افراد سیاہ مُو اور سانولے رنگ کے تھے۔ بولی اُن سب کی آریائی تھی مگر نژاد اُن سب کا آریائی نہ تھا ۔ اس کے علاوہ، اگر قدیم (ایجینی) السنہ بالکل معدوم ہوگئیں تو اس کا

سبب جیسا کہ بعد کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے صرف یہ تھا کہ خود آنے والوں کی (یونانی) زبان میں بڑی قوت اور قدرت تھی۔ اور اسی لئے جہاں کہیں یونانی جاکر آباد ہوئے انہی کی زباں اُس علاقے بھر کی زبان بن گئی۔ چنانچہ یونان خاص میں بھی جس وقت یہ لوگ پہنچے، خواہ کثیر التعداد حریفِ غالب کی حیثیت سے، خواہ محض آباد کاروں کی مثل، ہر حال میں یہ سارا ملک انہی کے رنگ میں رنگ گیا۔ مثال کے طور پر ایٹی کا اور ارگیدیہ وہ علاقے ہیں جہاں کی اصلی آبادی میں بہت کم انقلاب ہوئے تھے اور ان دونوں کی قدامتِ نسل کا ثبوت بہت سی کہانیوں میں مرکوز و موجود ہے بایں ہمہ زبان و معاشرت کے اعتبار سے یہ دونوں علاقے بھی بالکل یونانی بن گئے تھے؛

القصہ نئے آنے والوں کا اس ملک پر ایک ہی سیلاب یا حملے میں تسلّط نہ ہوگیا تھا بلکہ حقیقت میں یہ ایک قدیم ذخیرے میں نئے کی آمیزش تھی جو رفتہ رفتہ قدیم ذخیرے میں گھُل مِل گیا اور ساتھ ہی اپنی زبان بھی لیتا آیا تھا؛ آنے والوں کا اصلی وطن جزیرہ نمائے بلقان کا شمال مغربی حصّہ تھا مگر بعض وجوہ سے وہ جانب جنوب پسپا ہو رہے تھے اور شاید اسی قسم کی وجوہ سے اُس زمانے میں جنوبی تھریس اور مغربی مقدونیہ کے بسنے والے بھی جانب مشرق اور آبنائے کے پار ایشیائے کوچک کی طرف چلے جارہے تھے۔ اور جہاں تک یونانیوں کا تعلق ہے

یہ عمل صدیوں تک جاری رہا۔ بے شبہ شمالی یونان، یعنے شمال مغربی اپیرس، اکرنانیہ اور اطولیہ میں پلوپنی سس کی نسبت سالہا سال پہلے لوگوں کی زبان یونانی ہوگئی تھی اور غالباً اسی زمانے میں مقدونیہ کے یونانی مہاجر بھی ایشیائے کوچک میں ؛ شاید افروجیہ والوں کو ڈھکیل کر رودِ اک سیوس کے دہانے اور قریبی کناروں تک پہنچ گئے تھے اور ساتھ ہی ان کے بعض گروہ ان علاقوں میں آباد ہو رہے تھے جو بعد میں تھسالیہ یا تھسلی کے نام سے مشہور ہوا۔ بایں ہمہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یونانیوں نے پہلے شمالی یونان پر تسلّط جمالیا اور اس کے بعد جنوبی جزیرہ نما کا رخ کیا تھا؛ اس جزیرہ نما میں اُن کے سب سے پہلے آنے والے ،خلیج کورنتھ کو یقیناً مغربی کنارے سے کشتیوں میں عبور کرکے آئے اور کم سے کم ابتدا میں جزیرہ نُما کے انہی مغربی علاقوں نے، جو بعد میں اکائیہ، الیس اور مسینیہ کے نام سے موسوم ہوے، مشرقی اضلاعِ لقونیہ و ارگولس سے قبل یونانی اثر قبول کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ ارگولس میں آنے والے یونانی آئے بھی دوسرے راستے سے یعنے تھسالیہ کے نئے متوطّنین نے مشرق اور جنوب کی طرف پھیلنا شروع کیا اور پہلے جزیرہ یوبیہ، سواحل ایٹی کا اور جزایر سای کلیڈیز تک پہنچے اور آخر میں جزیرہ نمائے پلوپنی سس میں مشرقی راستے سے آئے۔ اُن کے دو گروہوں نے تھسالیہ کے جنوبی کوہستان اوتیہ اور پرناسوس میں اپنا مسکن بنالیا لیکن دوسرے اسی تلاش میں پہاڑوں سے گزر کر اُس شاداب خطّے میں پہنچے جس کے ہر طرف

پہاڑ تھے اور جس کا بعد میں **بیوشیہ** نام ہوا - ان میں سے بعض شاید **مینائی** گروہ کے لوگ تھے جنھیں زمانہ شجاعت میں ہم شہر **اُرکومنوس** میں آباد پاتے ہیں - اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نام اصل میں اُنہی قدیم باشندوں کا ہو جنھیں یونانیوں نے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا ؛ اس سے اور آگے **ایٹی کا** کے ضلعے میں معلوم ہوتا ہے کہ بعض نوآبادیاں **آی اونی** یا **آیونیانی**[1] گروہ نے بسائی تھیں اور یہی علاقۂ **ارگولس** میں آکر آباد ہوئے تھے ؛

مگر یہ صورت سالہائے دراز میں اور تدریجاً وقوع پذیر ہوی کیونکہ آنے کے بعد بھی یونانیوں کو قدیم باشندوں کے ساتھ گھُل مِل جانے میں اور اپنے نوآباد ممالک کو یونانیت کا رنگ دینے میں ایک عرصہ درکار تھا۔ مشرقی یونان، ایجینی تمدن کا مولد و منشاء تھا اس لئے وہاں دونوں گروہوں کا اثر ایک دوسرے پر پڑا۔ یعنے اگر آنے والے یونانیوں نے ملک کے اصلی باشندوں کو اپنا ہمزبان بنا کے چھوڑا تو اُسی کے ساتھ خود بھی اُن سے تمدن کا سبق لیا جس میں وہ یونانیوں سے کہیں آگے تھے - اسی طرح آنے والوں کی تعداد اور قدیم باشندوں کی قوت و شائستگی کے اعتبار سے، مختلف اقطاعِ یونان میں مختلف نتائج رُونما ہوئے - بعض مقامات میں نووارد یونانیوں کی محض تعداد قلیل نے علاقے بھر کو یونانی جامہ پہنا دیا اور اپنی زبان پھیلادی۔ جیسا کہ بظاہر **ایٹی کا** میں ہوا - جس کی آبادی کا بڑا حصہ، قدیم اور

---

[1] اہل مشرق نے "یونانی" اور "یونان" کا لفظ اسی گروہ کے نام پر اس تمام ملک کو دے دیا ہے ؛ مترجم

اصلی باشندوں کی اولاد تھا مگر نو وارد یونانیوں نے اُسے بالکل اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ بعض دیگر اقطاع میں یہ نو وارد کثیر تعداد میں حملہ آور ہوئے تھے اور وہاں کے اصلی باشندوں کو مجبوراً اُنہیں جگہ دینی پڑی تھی۔ تھسالیہ میں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے پلاس جی یا قدیم باشندوں کو یونانیوں نے ایک کونے میں الگ ڈھکیل دیا تھا اور باقی سارے علاقے پر خود پھیل گئے تھے بہرحال یہ نتیجہ نکالنا بالکل بجا ہوگا کہ ایک زمانے میں یونان کا زیادہ علاقہ ایسا تھا جس میں نو وارد یونانی اور قدیم آبادی دوش بدوش زندگی بسر کرتی اور اپنی اپنی بولی بولتی تھی اور ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈال رہی تھی۔ اور وہ امتزاجِ خون جس سے زمانۂ تاریخی کی یونانی قوم پیدا ہوی اسی اختلاط و ارتباط کا نتیجہ تھا۔

سنین کا کوئی حساب ہو اس نتیجہ پر پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یونانیوں کی ایجین کے علاقوں میں آمد اسی عصر النحاس میں شروع ہوچکی تھی جب کہ ایجینی تمدّن پورے عروج پر تھا۔ (۱۵۰۰ سنہ تا ۱۰۰۰ سنہ ق م) اور اگر آنے والے تعداد کثیر میں یورش کرتے یا دو تین ہی زبردست حملوں میں سارا ملک فتح اور وہاں کی آبادی کو معدوم کردیتے یا اپنا غلام بنا لیتے تو وہ کسی طرح وہاں کے قدیم تمدّن سے مستفید نہ ہوسکتے تھے۔ یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہوئی کہ اُن کے چھوٹے چھوٹے گروہ ملک میں آتے اور گھل مِل جاتے تھے۔ یہ سوال دوسرا ہے کہ جس وقت شاہانِ مای کینی دارکومنوس وغیرہ نے کوہستانی مقبروں کی تعمیر کی، اس وقت یہ اختلاط

باہمی کس حد تک پہنچ چکا تھا۔ نیز یہ سوال کہ آیا ان بادشاہوں میں سے کوئی نو وارد یونانیوں کی نسل میں تو نہ تھا، بالکل دوسری نوعیت رکھتا ہے۔ ان دونوں باتوں کا کوئی قطعی جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔ البتہ اس قدر ہم جانتے ہیں کہ اگر پہلے نہیں تو بارھویں (۱۲) صدی قبل مسیح میں ضرور یونانی قوم سمندر کے پار، ایک نئی سمت میں پھیل رہی تھی اور ایشیا کے سواحل تک، جہاں جاتی ایجینی تمدّن کی مشعل بردار بن کے جاتی تھی۔ اور یونانی عہدِ شجاعت کی جو داستانیں ہمارے سامنے ہیں وہ بھی ہمیں اسی قدیم تمدّن کی تصویریں دکھاتی رہیں +

۵۔ یونانیوں کا مشرقی ایجین میں پھیلنا

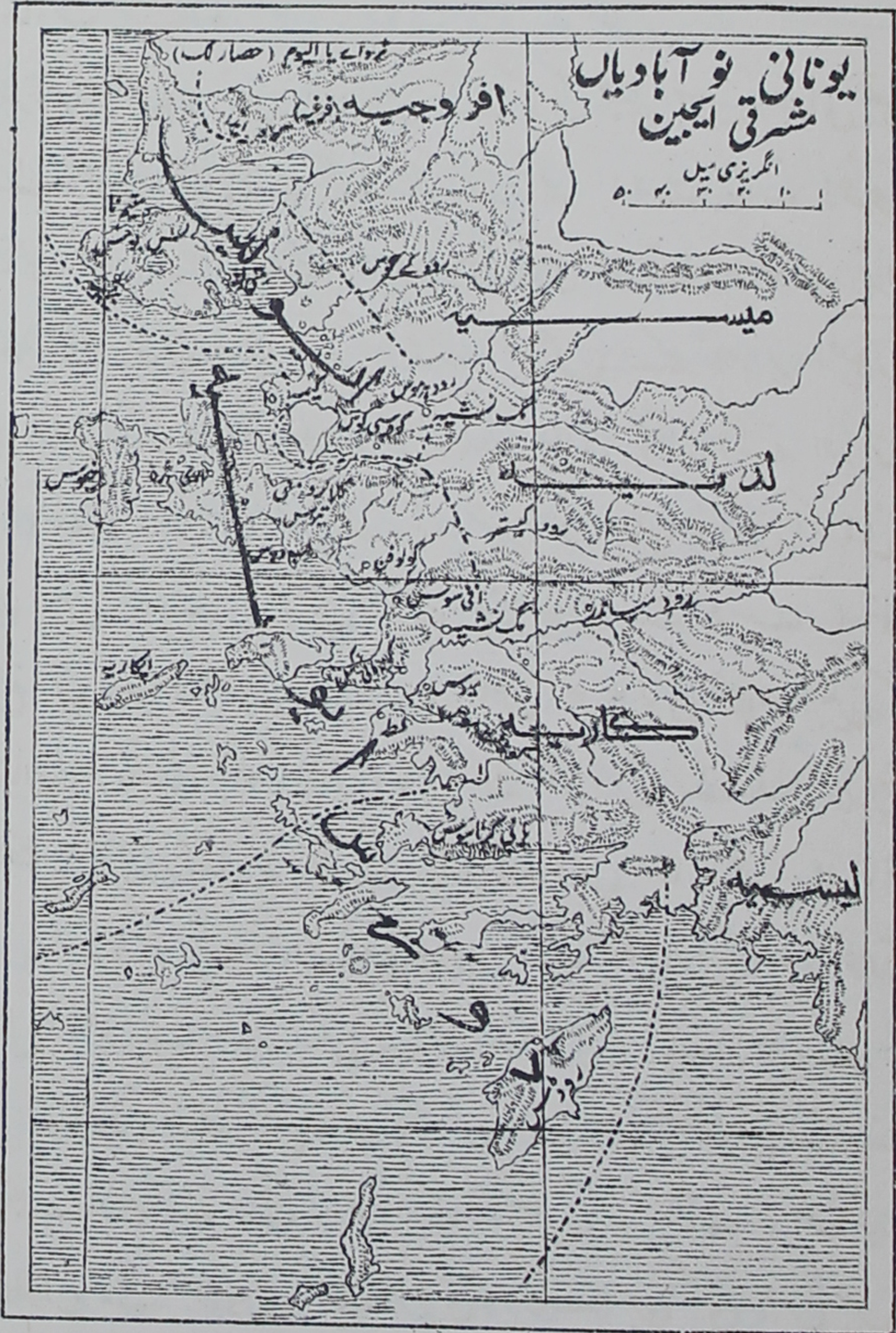
یونانیوں میں سب سے اوّل اکائیانی (یا اکائی) گروہ نے بحیرہ ایجین کو عبور کیا تھا۔ یہ گروہ تھسالیہ کے میدانوں اور پہاڑوں میں آباد تھا اور اسی کے حلیف و رفیق کی حیثیت سے یولیائی گروہ کے لوگ بھی اس کے ساتھ ہوگئے تھے؛ وطن کو خیرباد کہنے کے بعد ان اولی العزم مسافروں کی کشتیاں سب سے پہلے شمالی ایشیائے کوچک، جزیرہ لس بوس اور اس کے بالمقابل سواحل سے جا کر لگیں اور وہیں سرزمینِ ایشیا میں پہلی یونانی نوآبادیوں کی داغ بیل پڑی۔ قدرتی طور پر بھی ایشیائے کوچک کے یہ مغربی سواحل، ساحلِ یونان کی طرح ایک جہازران قوم کی سکونت کے لئے

موزوں ہیں - کیونکہ وہاں کوہستانی سلسلوں میں متعدد دریائی وادیاں
بن گئی ہیں اور خود یہ پہاڑ سمندر میں بڑھکر گہری خلیجیں بناتے ہیں،
اور انہی کے سرے جزیروں کی صورت میں سمندر سے اُوپر اُبھرے
ہوئے ہیں - ہرموس اور کیکوس ندّیوں کے شمال میں پہاڑیوں
کا جو سلسلہ ہے وہی آگے چلکر جزیرہ لس بوس میں پھیل گیا ہے
اور اسی طرح جن پہاڑوں نے کیسٹر ندّی کو ہرموس سے جدا
کیا ہے وہی آگے بڑھکر جزیرہ خیوس میں سر اُبھارتی ہیں - اور کیسٹر
و میاندر ندّی کا فاصل سلسلۂ کوہ جزیرہ ساموس میں منتہی ہوتا
ہے - الغرض یونانی حملہ آوروں نے میسیہ کے باشندوں سے
ساحلی علاقے چھین لئے اور بعض ایسے مستحکم مقامات پر (جیسے کیمہ
ایگیہ اور سمرنہ قدیم) جن کی وہ حفاظت کرسکتے تھے، قابض ہوگئے
پھر ندّیوں کے کنارے کنارے وہ آگے بڑھے اور اب ہرموس
انہوں نے کوہِ سپی لوس کے دامن میں شہر مگنیشیہ کی بنا ڈالی -
یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تمام واقعات کوئی ایک دو دن
کی بات نہ تھی اس میں سالہائے دراز صرف ہوئے ہونگے
اور یونان سے پے بہ پے یورشوں کی کمک پہنچتی رہی ہوگی
مگران واقعات کی تاریخی تفصیل پردۂ عدم میں ہے - ایک افسانے
میں سچّی روایت کا ایک ٹکڑا باقی رہ گیا ہے جس سے ہم صرف
ایک ہی واقعہ معلوم کرسکتے ہیں اور وہ لس بوس کے شہر
بریسہ کی تسخیر ہے کیونکہ بریسہ کی اُس حسین دوشیزہ کا
افسانہ جسے شاہِ اگامِمنن نے مشہور بطل یونان، اکی لیس کے

علی الرّغم چھین لیا تھا، ہماری نظر میں صرف یونانی تسخیر لس بوس کی شہادت ہے۔

سرزمینِ ترود میں یونانیوں نے کوئی بستی نہیں بسائی تھی لیکن اس کے جنوبی علاقے پر قبضہ کرنے کے باعث ملک افروجیہ کے نامی شہر ٹرواے سے بھی اُن کا تصادم ہوگیا۔ ٹرواے کا دوسرا نام شاید بانیٔ شہر، شاہ الیوس کے نام پر الیوس بھی تھا اور اسی کے ساتھ عرصۂ دراز تک یونانی لوگ اُلجھتے اور لڑائیاں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ یہ قلعہ بند شہر مسخر ہوگیا۔ اس کہانی کی صداقت میں شبہ کرنا کہ اسے یونانیوں نے فریب یا شجاعت سے فتح کیا تھا، فضول ہے۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس رفیع الشان و مقدس شہر نے یونانی حملہ آوروں کے دِل پر اپنی سطوت کا وہ نقش چھوڑا تھا جو پھر نہ مٹا۔ اور اس محاربے نے، خواہ وہ کسی پیمانے پر تھا، ان دیوتاؤں کے افسانوں اور خوارق کے ساتھ مِل کر جو پہلے سے اُن کے دماغ میں بسے ہوئے تھے، اکائیانی بھاٹوں کے تخیُّل کو جِلادی اور اس مضمون کے نئے نئے گیت گائے جانے لگے۔ انہی کے طفیل یہ جنگ، افروجیہ اور یونان والوں کے درمیان ایک قومی جنگ بن گئی جس میں یونان کا ہر گروہ شریک و سہیم بنادیا گیا۔ اور یونانیوں کے ذہن میں یہ بات جسم گئی کہ مشرق و مغرب کی دائمی کشمکش میں سب سے پہلا عظیم الشان واقعہ یہی جنگِ ٹرواے ہے!

۲۵



ملحوظ خاطر رہے کہ اس عہد میں یونان اور افروجیہ کے لوگ
بظاہر یہ محسوس نہ کرتے تھے کہ نسل و معاشرت کے اعتبار سے
اُن میں کوئی بڑا فرق یا غیریت ہے۔ دونوں حریفوں کے تمدّن

میں کوئی فرق نہ تھا اور غالباً وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اُن کی بولیاں کچھ نہ کچھ ملتی ہوئی ہیں ؛ چنانچہ ہومر کے کلام سے اسبات کی تصدیق ہوتی ہے جس میں اہل افروجیہ کی بعض مابہ الامتیاز خصوصیات کے ساتھ، پایا جاتا ہے کہ شاید اہلِ ٹروائے بھی نسلاً یونانی تھے۔ ان کے بعض مشاہیر کے نام یونانی ہیں - اور یہ اس امر کی شہادت ہے کہ اکائیانی آباد کاروں اور ان کے افروجی ہمسایوں میں برابر آمد و رفت اور باہمی ارتباط کا سلسلہ جاری تھا۔

اکائیانی مہاجرین کے بعد، دوسرا سیلاب ایونیائی یا آئی اونی تارکان وطن کا تھا جو اٹی کا و ارگولس کے سواحل سے اٹھا اور اکائی نو آبادیوں کے جنوب میں انہوں نے بستیاں بسائیں۔ ہرموس وکیستر ندیوں کے درمیان ایک دو شاخہ جزیرہ نما بن گیا ہے جس کے سامنے جزیرہ خیوس واقع ہے اور اسی طرح کیستر و میاندر کے درمیان کوہ لتموس کے جنوب میں ایک جزیرہ نما ہے جس کے بالمقابل جزیرہ ساموس واقع ہے اور یہی دونوں علاقے تھے جن کے چپّے چپّے پر نئے گروہ نے اپنی بستیاں آباد کردیں، اور پُرانے گروہ سے جو شمال میں پھیلا ہوا تھا، ایک علٰحدہ جتھا یہاں بن گیا۔ یونانی بستیوں کے ان مجموعوں کا نام بھی الگ الگ تھا۔ اور ہر چند شمالی علاقے میں سب سے نامی گروہ اکائیانی آباد کاروں کا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ علاقہ ان کے ساتھ منسوب ہونے کی بجائے یولیانی گروہ سے منسوب ہوگیا۔ بالکل اسی طرح

۱؎ مثلاً "پیرس الگزنڈر"، اس دُہرے نام کا پہلا جزو افروجیہ اور دوسرا یونان کی زبان کا ہے۔

جیسے ملک انگلستان سکسن قوم سے منسوب ہونے کی بجائے
انگل قوم سے منسوب ہوا اور انگلستان کہلاتا ہے۔ لیکن جنوبی نو
آبادیوں کا مجموعہ جو وسعت میں بھی شمالی مجموعے سے بڑا تھا، آیونیائی
گروہ کے نام سے موسوم ہوا جو پہلے "یوؤن" اور بعد میں "و" حذف
ہوجانے سے، اپنے تیئں خالی "یون" کہتے تھے۔ ان کے متعلق
ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اوّل اوّل یہ گروہ سواحلِ ارگولس
و اٹیکا پر آباد ہوا تھا۔ لیکن وہاں اس نام کا استعمال چھوٹ
گیا اور عجب نہیں کہ وہ لوگوں کے حافظے سے محو ہوگیا ہو۔ یہاں
تک کہ ایشیا کی سرزمین پر پہنچ کر اُسے شہرت و ناموری حاصل ہوئی
اور وہیں اپنے قدیم وطن کے نام کو اس نے دوبارہ زندہ کیا۔
مگر ان آیونی یا آیونیائی شہروں کی بنا، اور باعتبار سنین
اُن کی ترتیب، نیز اصلی باشندوں کے ساتھ ان یونانی مہاجرین کے
تعلقات کا حال ہمیں بہت کم معلوم ہے۔ اُس جزیرہ نما کے
پیٹے پر، جو گو یا خیوس کی پا بوسی کے لئے آگے بڑھا ہوا ہے شمال
میں کلازومینہ اور جنوب میں تیوس کی بستیاں آباد ہوئیں اور
سرے پر عین خیوس کے بالمقابل "ارغوانی" اریثرہ آباد ہوا۔
ارغوانی، اس لئے کہ وہاں سمندر کے نیلے پانی میں سرخی گھُلی ہوئی
تھی اور ماہی گیری کی وجہ سے وہ شہر صوؔر کے شامی تجّار کا مشہور
مرجع تھا۔ تیوس کے مشرق میں جہاں ساحل گھونگٹ کھا کے
پیچھے ہٹ گیا ہے، لِب دُوس اور کولوفون واقع تھے اور
جہاں ساحل کا خم، کیسؔتر کے دہانے پر منتہی ہوتا ہے وہاں

اَرتمیز دیوی کا شہر افی سوس آباد کیا گیا تھا۔ اسی کے جنوب میں کوہِ مای کیل کی شمالی ڈھلانیں اور اُن پر اہل آیونیہ یا آی اونیہ کے تیرتھ کا مقام، یعنی پوسی ڈون دیوتا کا مندر بنا ہوا تھا۔ اور جب زمانے میں آیونیہ والوں میں قومیت کا کچھ شعور و احساس اور اپنے ہم نام ہونے کا ناز پیدا ہوا تو شمال میں فوکیہ اور جنوب میں ملی طوس یا ملطہ تک تمام آیونی شہروں میں یہی مندر جذبۂ اتحاد و اشتراک کو تقویت دیتا تھا: مئیوس اور پرِیَنہ کی جائے وقوع رودِ میانَدر کے کِنارے، مای کیل کے جنوب میں تھی۔ یہاں سے پھر ساحل نے خم کھایا ہے اور جنوب میں وہ راس بن گئی ہے جس کے سرے پر ملطہ کی آبادی اور کسی زمانے میں مشہور و شاندار بندرگاہ واقع تھی۔ اندرونِ ملک میں لبِ میاندر بھی ایک بڑا شہر مگنیشیہ واقع تھا اور اس کے جاے وقوع کا بہ احتیاط لحاظ و امتیاز رکھنا چاہئیے کیونکہ ہرموس کے کِنارے اسی نام کا ایک اور یولیانی شہر بھی اندرون ملک میں آباد تھا۔

سواحل ایشیا کے یہ سب نووارد یونانی اپنے وطن کی شاعری اور طرزِ تمدّن اپنے ساتھ لائے تھے۔ اُن کے تمدّن سے بھی ہم اُن کی شاعری کے طفیل روشناس ہوئے اور اِس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ اصول میں یہ اُسی تمدّن سے مشابہ تھا جس کے آثار باقیہ مای کینی اور قدیم یونان کے دوسرے شہروں میں مدفون ملے ہیں۔ گویا اُسی عہد شجاعت کی آخری منزلیں ہیں جن کا ہومر افسانہ سنا رہا ہے۔

اُس کی نظموں میں شاہی محلات کا جو نقشہ بیان ہوا ہے وہ مجموعی طور پر وہی ہے جس پر مائی کینی، ترنز اور ٹروائے کے محل تعمیر کئے گئے تھے۔ ترنز کے دیوان خانے میں جو نیلی کانچ کے بیل بُوٹے دیواروں میں جڑے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ شاعر نے قصرِ الکی نوس[1] کے نقش و نگار بیان کرنے میں محض خیالی گُل کاری نہیں کی ہے اور نِستور[2] کے جس طلائی ساغر کی اُس نے تصویر دکھائی ہے کہ اُس کے کُنڈے پر دونوں طرف قمری بنی ہوئی تھی بالکل اُسی وضع کا پیالہ مائی کینی کے ایک شاہی مقبرے سے نکلا ہے۔ البتہ ان دونوں زمانوں کی ایک رسم میں نمایاں فرق یہ ہے کہ مائی کینی مقبروں سے کوئی سُراغ اس بات کا نہیں چلتا کہ وہاں کے لوگ اپنے مُردے جلایا کرتے تھے حالانکہ عہد ہومر کے یونانی اسی رواج کے پابند تھے، اور اس کی نظموں میں تدفین موتیٰ کا مطلق ذکر نہیں آتا۔ البتہ زمانۂ مابعد میں یہ دونوں رسمیں یونان میں جاری ہوگئی تھیں۔

پہلا نتیجہ اس تمام بیان کا یہ ہے کہ بارھویں صدی (ق م) تک یونانی قوم نے ایجینی تمدّن کو بخوبی اختیار کرلیا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ اس قدیم تہذیب و معاشرت کا وطن اصلی میں جو کچھ بھی

---

[1] الکی نوس اجزیرۂ اسکی ریا کے شہر فیاکیس کا بادشاہ تھا۔ اور قدیم افسانوں میں سامانِ عیش و تمول میں ضرب المثل مانا جاتا تھا۔

[2] نِستور شہر پیلوس کا بادشاہ اور ٹروائے کے حملہ آور یونانی بادشاہوں میں سب سے معمّر و جہاں دیدہ سردار تھا۔ ہومر نے اس کی تدبیر و دانش، علم و کارروائی اور عدل گستری کے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ مترجم

حشر ہوا ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سمندر پار اس نئے یونان میں جہاں یونانی اب آکر بسے تھے، وہی تمدّن رائج و قایم رہا، اور آیونیانی تہذیب کے جو تکلفات چند صدی بعد ہماری نظر سے گزرینگے وہ حقیقت میں اُسی مای کینی معاشرت کی ترقی یافتہ صورت ہوگی +

اس نئی تہذیب کے مرتّب ہونے سے قبل اس میں بعض نئی چیزیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ مثلاً شام وافروجیہ سے میل جول کا ضرور کچھ نہ کچھ اثر پڑا ہوگا۔ بایں ہمہ اس تصویر کا چوکھٹا وہی رہا جسے یونانیوں نے قدیم ایجینی باشندوں سے میراث میں پایا تھا +

۶۔ یونانی حملہ آوروںکی آخری یورش

جزایر و سواحلِ ایشیا پر نوآبادیاں قایم ہونے میں کئی صدیوں سے زیادہ عرصہ لگا اور بے شبہ اس میں وقتاً فوقتاً اس ہل چل سے تحریک پہنچتی رہی جو وطن اصلی میں ہو رہی تھی۔ اس تمام انقلاب کا سبب اولیٰ جس نے شمال سے جنوب تک سارے ملک یونان کو ہلا دیا، غالباً الیرّیہ والوں کی پیش قدمی تھی + اور اسی دباؤ نے جو شمال سے پڑ رہا تھا، کم سے کم اطولیہ کا ناس کر دیا۔ ہوّمر کی نظموں میں وہاں کی چند طاقتور بستیوں کا اور وہ لبِ ساحل پلوُرن اور کوہستانی کلیدُن" کا ذکر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر عہد شجاعت کی مدنی ترقی میں آگے آگے قدمزن تھے۔ اور ملیاجر کا شہر کلیدُن کے جنگلی سوّر کو مارنا، اُن

افسانہ ہائے شجاعت میں داخل تھا جو یونانیوں کا قومی ورثہ بن گئے تھے۔ برایں ہم چند صدیوں کے بعد زمانہ تاریخی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اطولیہ ایسے نیم وحشی باشندوں کا ملک سمجھا جانے لگا ہے جو اگرچہ یونانی زبان بولتے ہیں لیکن علم و فن یا تمدّن و معاشرت میں انہیں دیگر اقطاعِ یونان سے کوئی نسبت نہیں اور وہ نہایت زبون و پسماندہ حالت میں پڑے ہیں۔ اور یہی حال ان کے ہمسایہ علاقوں کا ہے۔ اپیرس کی یکایک قلب ماہیت ہو جاتی ہے وہاں کا تمدّن بھی وحشت و بدویت سے بدل جاتا ہے اور اس کی قدیم معاشرت کی یادگار میں ددونا کی عبادت گاہ کے سوائے اور کچھ باقی نہیں رہتا! تو حقیقت میں اس اُفتاد کا سبب صرف یہی نظر آتا ہے کہ الّیریہ کے وحشی ترکتاز ان اقطاع میں بلائے ناگہانی کی طرح آئے اور قابض ہوتے ہی یونانی تہذیب میں رنگ جانے کی بجائے انہوں نے اُسے خراب کر دیا۔ اور زیادہ تر انہی فتحمندوں کی اولاد ہے جسے زمانہ تاریخی میں ہم اطولیہ اور اپیرس کے علاقوں میں آباد پاتے ہیں۔

بہرکیف اِس یورش کا قدرتی نتیجہ تھا کہ کچھ یونانی باشندے وہاں سے نکل گئے اور اطولیہ والوں نے خلیج کے پار، پن یوس ندّی کے کناروں پر توطّن اختیار کیا اور اپنے تئیں الیانی (یعنی اہل وادی) کہنے لگے۔ کیونکہ ان کی یہ سکونت وادیوں کی سرزمین میں تھی اور وہ ال فیوس ندی تک پھیل کر ساحلِ بحر سے بالکل الگ ہو گئے تھے اور آئندہ بھی جہازرانی میں انہوں نے کوئی ناموری حاصل نہ کی۔

مگر اپی رس میں الّیریہ والوں کے اقدام سے جو ہل چل پیدا ہوئی اس کا اہم نتیجہ، تھسالیہ اور بیوشیہ والوں کی ہجرت ہوا۔ یہ بات کہ ان دونوں انقلابات میں کوئی باہمی تعلق تھا یا وہ ایک ہی زمانے میں واقع ہوئے قطعی طور پر کسی طرح ثابت نہیں ہوتی۔ صرف اس قدر ہمیں معلوم ہے کہ قبائل تیپالوی، جنہیں دوسری زبان والے تھسالوی کہتے تھے پہاڑوں کو اُتر کر آئے اور یونان کے اُس مغربی گوشے میں آباد ہوگئے جو کوہِ پلیوآن و پندوس کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اس تمام علاقے میں اُن کا غلبہ اور شمالی آرگس پر بھی تسلّط ہوگیا۔ اکائیانوں کو انہوں نے جانب جنوب تھَیا کے پہاڑوں میں دھکیل دیا اور ایسا ذلیل و گمنام کردیا تھا کہ آئندہ تاریخِ یونان میں اس کا کوئی نمایاں حصّہ نہیں رہا۔ اس انقلاب کے بعد یہ سارا علاقہ تھسالوی قوم کے نام سے موسوم ہوگیا اور آج کے دِن تک تھسلی یا تھسالیہ کہلاتا ہے۔ اس میں بلادِ کرائنن، پگاسہ، لاریسا اور فرایہ صدر مقامات تھے جہاں کے رئیس قرب و جوار کے اضلاع پر حکمرانی کرتے تھے۔ مفتوحہ قبایل اُن کی "رعیت" ہوگئے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی حالت قریب قریب غلاموں جیسی تھی اور اُن کا نام بھی "وِنیستای" یعنے مزدور (یا شودر) ہوگیا تھا۔ ان کا کام کاشتکاری تھا اور اُن کے مالک ایک مقرّرہ سالیانہ ان سے وصول کرلیا کرتے تھے خواہ پیداوار میں کسان کو نفع رہے یا نقصان۔ بعض دیگر حقوق کے علاوہ غلاموں سے انہیں اس امر میں بھی امتیاز تھا کہ نہ انہیں فروخت کیا

جا سکتا تھا اور نہ یہ جایز تھا کہ مالک جب جی چاہے انہیں قتل کر ڈالے۔ مگر واضح ہو کہ کل تھسالیہ کا چار اضلاع میں منقسم ہونا بہت بعد کی تاریخ سے ثابت ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے وہاں کے ملوکِ طوائف کے مفصّل و مستند حالات کا ہمیں علم نہیں ہے۔ البتہ بعد کے چار بڑے بڑے علاقوں کا ہم حال جانتے ہیں کہ شمال مغرب میں تھسالیوتی آباد تھے۔ جنوب میں اکائیانی نسل کے قبائل تیوتی کا علاقہ تھا ایک ٹکڑے کا نام، یونان کے بہت قدیم پلاس جوی باشندوں کی یادگار میں پلاس جیوتیس باقی رہ گیا تھا اور چوتھا ٹکڑا ہس تیوتیس، یعنی قبایلِ ہستیا کی زمین کہلاتا تھا جن کا تاریخ میں علاحدہ کوئی ذکر نہیں آتا۔ ملک میں جتنے رؤسا تھے اُن کی شیرازہ بندی کا نظام بہت ناقص تھا اور زمانۂ امن میں اس کی کوئی پابندی نہ کی جاتی تھی لیکن جنگ کے وقت اسی کے طفیل وہ متحد ہوکر ایک فوجی سردار کا انتخاب کرلیتے تھے جس کا لقب تاگوس ہوتا تھا۔

بایں ہمہ تھسالیہ کے تمام اکائیانی باشندے نو وارد فاتحین کی ذلیل رعایا نہ بن گئے تھے بلکہ ان کا ایک گروہ جانبِ جنوب، پلوپنی سس کے علاقے میں ہجرت کر آیا تھا اور غالباً اس کے ہمسایہ قبایلِ ہِل لنیز بھی اس کے ہمراہ ہوگئے تھے جو رود اسپرکیوس کے بالائی کِناروں پر بسے ہوئے تھے۔ انہی دونوں گروہوں نے خلیج کورنتھ کے جنوبی سواحل پر اپنی بستیاں بسائیں اور یہ ساری پٹی اکائیانیوں کے نام سے "اکائیہ" کہلانے لگی۔ اس طرح یونان میں

اکائیانیوں کے اب دو علاقے ہوگئے - ایک تو قدیم اکائیہ، جو سمٹکر
تھیا کی پہاڑیوں میں محصور رہ گیا تھا اور دوسرا جدید اکائیہ کا یہ
علاقہ، جو، پلوپنی سس میں خلیج کورنتھ کے سواحل پر اب آباد ہوا۔
لیکن سچ پوچھئے تو ان دونوں سے شان و عظمت میں کہیں بڑا
اکائیانی علاقہ، وہ ہونا چاہیئے جو ایشیاے کوچک میں تھا اور جہاں
یورپ کی شاعری کا نقش اوّل تیار ہوا - مگر اتفاق سے وہیں ایولیس
جیسے غیر مشہور نام کے آگے اکائیہ کا لفظ فروغ نہ پاسکا اور
محو و گمنام ہوگیا۔

اولمپس[1] اور اُترِیس[1] کے علاقوں میں جس طرح مذکورہ بالا
انقلاب واقع ہوئے تھے اسی طرح ہلی کن[2] اور ستھی رن[2] کی سرزمین
میں بھی اسی قسم کا بھونچال آیا اور تمام آبادی میں ہل چل پیدا ہوگئی
کیونکہ اب وہاں بیوشی قبایل آکر قابض ہوگئے - یونانی بیان کے
بموجب یہ قوم تھسالیہ میں آباد تھی اور اس کے مفتوح ہونے کے
بعد، جنوبی علاقوں میں نقل مکان کرآئی چنانچہ پہلے اُس نے مغربی
علاقوں پر تصرّف کیا جو آگے چل کر بالکل اُسی کا قومی علاقہ بن گیا۔
پھر شیرونیہ اور کرُونیہ سے بڑھ کر اس نے شہر تھِبز کو فتح کرلیا
جس پر قدیم باشندوں کے ایک گروہ، کادمی کا قبضہ تھا - اس
کے بعد یہ نو وارد سارے علاقے پر چھا گئے اور انہی کے نام پر یہ

---

[1] یہ دونوں جنوب تھسالیہ کے پہاڑ ہیں۔

[2] ہلی کن کے پہاڑوں کا برف پوش سلسلہ بیوشیہ کے وسط میں پھیلا ہوا ہے اور کوہ
ستھی رن (یا ستھران) بیوشیہ اور اٹی کا کی حد فاصل ہے - مترجم

علاقہ بیوشیہ کہلانے لگا۔ اگرچہ یہاں اتنی جلد وہ تسلّط نہ کر سکے تھے جتنی جلد کہ تھسالوی قوم نے سرزمین تھسالیہ پر اپنا عمل دخل کرلیا تھا۔ بلکہ بیوشیہ کے قدیم روسائے اُرکومینوس نے عرصۂ دراز تک اجانب سے اپنی آزادی محفوظ رکھی اور چھٹی صدی قبل مسیح سے پہلے تمام بیوشیہ کو قومی اتحاد نصیب نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ قبائلِ بیوشی کا جو فاتحینِ تھسالیہ کی نسبت تعداد میں غالباً کم تھے، طرزِ عمل بھی تھسالیہ والوں جیسا نہ تھا اور انہوں نے مغلوب باشندگانِ قدیم کو اُس طرح اپنی رعیّت یا غلام نہ بنالیا تھا۔

بیوشیہ کے مغرب میں کوہستانِ پرناسوس کا خطّہ اور قبائلِ فوسیانی کا علاقہ تھا۔ مگر یہاں کی آبادی میں کچھ زیادہ دیرپا انقلاب نہ ہوا۔ کیونکہ ڈورئین قبائل جو اس علاقے میں آئے اور غالباً یونانیوں کی اسی "شمال مغربی" شاخ میں تھے جس میں تھسالوی اور بیوشی قبائل داخل ہیں، ان علاقوں میں زیادہ نہ ٹھیرے بلکہ اُن کی بڑی تعداد اچھے علاقوں کی تلاش میں بہت دُور نکل چلی گئی تاہم ایک قلیل تعداد کوہستانِ پرناسوس اور اوئیتہ کے درمیان طاس نما قطعے میں پیچھے رہ گئی تھی جہاں انہوں نے اپنا نامی گرامی قومی نام، تاریخِ یونان کے سارے دَور میں محفوظ رکھا اگرچہ خود اس تاریخ میں انہوں نے یہاں رہ کر کوئی حصّہ نہیں لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی قبائل اپالو[1] دیوتا

---

[1] یونانی دیو مالا کا مشہور دیوتا اپالو زئیس کا بیٹا اور سورج کا مالک ہے کہانت، موسیقی، اور شہروں کے بناء و قیام کا بھی وہی محافظ مانا جاتا تھا۔ مترجم۔

کے "سنگِ آستان" یعنی دلفی (ڈیلفی) پر بھی قابض ہو گئے تھے اور یہاں انہوں نے اپنے بعض خاندان بسا دیئے تھے جنہوں نے دیوتا کی خدمت گزاری کے لئے اپنے تئیں وقف کر دیا تھا۔

مگر اقطاعِ پرناسوس سے ڈورئین قبائل کی روانگی غالباً تدریجی، اور سمندر کی راہ عمل میں آئی تھی، پہلے انہوں نے جہاز بنائے۔ اور شاید شہر نوپاک توس، جس کے معنی ہیں "جہاز سازی کا مقام" ان کی اسی صناعت کی یادگار تھا۔ اور پھر وہ سواحل پلوپنی سس کے گرد چکّر کھاکر یونان کے جنوب مشرقی اقطاع تک پہنچے۔ ان کا پہلا گروہ جزیرۂ کریت پہنچا جہاں پیشتر ہی بہت سی نسلیں آباد تھیں جن میں اس ڈورئین عنصر کا اور اضافہ ہوگیا بعض گروہوں نے جزایرِ میلوس اور تھرا میں سکونت اختیار کی۔ مگر باقی ماندہ جہازوں کا لنگر اٹھائے ہوے، جانبِ مشرق حدودِ ایجین سے گزر گئے اور ایشیائے کوچک کے جنوبی سواحل پر اُترے اور وہیں آباد ہو گئے۔ اُن کی یہ بستیاں غیر اقوام سے گھری ہوئی تھیں۔ دُوری کی وجہ سے دُنیائے یونان نے انہیں بُھلا دیا اور وہ بھی اُن سے اور یونان کے معاملات سے بالکل الگ ہو گئے؛ البتہ انہوں نے اپنی یونانی بولی کو فراموش نہ کیا اور پم فیلیانی نام بھی قایم رکھا جو ان کے ڈورئین نژاد کی شہادت دیتا تھا کیونکہ اُن تین گوت یا قبایل میں جس سے یہ قوم ہر جگہ پہچان لی جاتی تھی ایک پم فیلی تھا۔

اس کے بعد ڈورئین تارکانِ وطن نے خاص پلوپنی سس کا رُخ کیا اور ایک ایک کر کے لقونیہ، ارگولس اور کورنتھ کے علاقے

فتح کیئے۔ خداوندانِ اِمیکلی کا تختہ اُلٹ کر انہوں نے زرخیز وادئی یوروتاس پر قبضہ کرلیا اور اپنی ڈورئین نسل کو اغیار کے خون سے بالکل پاک و محفوظ رکھنے کی غرض سے، وہاں کے جتنے باشندے تھے اُن سب کو اپنی محکوم رعایا بنادیا۔ غالباً یہاں ان حملہ آوروں کی تعداد بھی اور مقامات کے ڈورئین فاتحین کی نسبت زیادہ تھی۔ اور اس قوم کی وہ خصوصیت جس کی بدولت وہ یونانیوں کی دوسری شاخوں سے امتیاز رکھتی ہے، یعنی وضعداری یا قومی سیرت بھی اسی علاقہ لقونیہ میں تکمیل و نمود حاصل کرسکی کیونکہ بظاہر یہاں یہ نو وارد ہر قسم کی آمیزش سے نسبتاً محفوظ اور آخر تک خالص ڈورئین رہے تھے۔

علاقہ ارگولس میں حالات نے دوسری صورت اختیار کی۔ حملہ آور تمی نس نامی ایک بادشاہ کی زیر ہدایت ساحل پر اُترے اور بے شبہ قدیم باشندوں سے ان کی سخت لڑائی ہوئی۔ اور پھر فتح بھی اُنہیں ایسی کامل نہ حاصل ہوئی تھی کہ اصلی باشندوں کی حکومت و آزادی مٹ جاتی۔ اس کے برخلاف، اُن کی فتح کا نتیجہ اختلاط و اتحاد کی صورت میں رُونما ہوا اور گو نظام حکومت بالکل ڈورئین ہوگیا اور ہلیّس، پم فیلی اور دی مانیس نام کے تینوں ڈورئین قبیلے بھی اس میں موجود رہے لیکن اس تبدیلی کے علاوہ اور کوئی فتح کا نشان باقی نہ رہا۔ بہر حال بہترین قراین کی رو سے یہی زمانہ سمجھنا چاہیئے کہ جس میں شہر مای کینی کی تسخیر و بربادی ہوی اگرچہ بربادی کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ شہر امیکلی کی مثل یہاں بھی

حکومت میں پہلے سے انقلاب ہو چکا تھا اور قدیم خاندانِ شاہی
کی بجائے یونانی فاتحین کی فرمانروائی تھی۔ اصلیت جو کچھ بھی ہو، اس
میں شبہ نہیں کہ مای کینی اور ترنز دونوں کو دفعتہً غارتگروں
نے برباد کیا اور آگ لگا دی تھی۔ اور اسی واقعے کے بعد سے
رفیع الشان قلعہ آرگوس اس تمام میدان کا فرمانروا ہو گیا اور اب اس
کا کوئی حریف باقی نہ رہا تھا*

ڈورئین جہازوں کی پتوار سے خلیج سارونی بھی نہ بچی رہی؛ ادھر
ایک شہزادہ مہم لایا تھا جس کا نام افسانوں میں الی ٹیس بتایا گیا
ہے۔ وہ خاکنائے پر لنگر انداز ہوا اور جزیرہ نما کی کلید یعنی اکروکورنتھ
کی بلند پہاڑی پر قابض ہو گیا۔ یہی واقعہ ریاست کورنتھ کا آغاز ہے
آرگوس کی طرح یہاں بھی اطاعت و محکومی کا سوال، یعنی فاتح و مفتوح
کا فرق نہیں پیدا ہوا؛ سمندروں کے درمیان کورنتھ کا محلّ وقوع ایسا
تھا کہ جس سے وہاں کے باشندوں کا بحری تجارت پر مایل ہونا
بالکل قدرتی بات تھی اور تاریخ سے ثابت ہے کہ ڈورئین قوم میں
تاجرانہ ہنر و حوصلہ مندی، دونوں وصف موجود تھے۔ تاہم سیاسی
اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ عرصے تک کورنتھ، آرگوس کے ماتحت
تھا، جو تین صدی سے زیادہ زمانے تک مشرقی پلوپنی سس کی دولت
عظمیٰ مانا جاتا رہا*

آرگوس کے ڈورئین فاتحین نے شمال میں اسوپوس ندی کے
کنارے دو مشہور نو آبادیاں اور بسائیں؛ جنوبی کنارے پر سکیان
اور شمال میں لیوس۔ کوہِ جرانیہ کے پار ان کا ایک اور شہر مگارا

آباد ہوا جس کے معنی "قصر" کے ہیں یہ اس بلند پہاڑی پر واقع تھا جہاں سے سلامیس کا مغربی کنارہ تک زیر نگاہ آجاتا ہے خود یہ جزیرہ سلامیس بھی جس کی مخروطی پہاڑیاں ارد گرد کے سواحل سے سمندر کے نیلے نیلے پانی میں اُبھری نظر آتی ہیں، ڈورئین قوم کی ملک ہوگیا۔ اور اس کے قریب کے دوسرے جزیرے اِجی نا کو بھی انہی کے ہم قوموں نے جو شہر اِپی دُروس میں آبسے تھے فتح کرلیا +

تمام مشرقی پلوپنی سس کو آباد کرنے کے بعد ڈورئین مہاجرین نے دوبارہ سواحلِ ایشیا کا رخ کیا اور لقونیہ، کورنتھ، ارگوس اور کریت کے متوطّن اُٹھ اُٹھ کر جزایر کوس و رودس اور بندر ہلی طوس کے جنوب میں راس ہائے بلند پر آباد ہوگئے۔ اندرون ملک میں ان کی سب سے مشہور نو آبادیاں ہالی کرناسوس کے علاقے میں تھیں مگر ان کے بسانے میں صوبہ کاریہ کے دیسی باشندے بھی اُن کے شریک ہوگئے تھے اور اس لئے انہیں "نیم کاریاوی" سمجھنا چاہیئے +

اس طرح ایشیاے کوچک کے مغربی کنارے پر یونانی نوآبادیوں کی جھالر شمال سے جنوب تک پوری ہوگئی تھی لیکن وہ ڈورس (یا ڈوریانیہ) سے کیکری بناتی ہوئی پم فیلیہ کے درمیانی شہروں تک نہ پہنچ سکی کیونکہ بیچ میں لیسیہ کی ناگزار سدّ حایل تھی جہاں کے باشندے زبان کے اعتبار سے غیر آریہ اور کاریہ والوں کے ہم خاندان تھے۔ لیکن گو یونانی آباد کاروں کا قدم لیسیہ

میں نہ آسکا، تاہم بجز شمالی حصّوں کے جہاں بحیرہ ایجین اُن کے حلقۂ اثر میں نہ آیا تھا اور آیندہ بھی اُن کی جرأت آزمائی کے لئے ایک دشوار گزار میدان بننے والا تھا، اس سمندر پر ان کا تسلط ہوجانے میں اب کوئی کسر نہ رہی تھی۔ ایشیاے کوچک کی ان ساحلی نوآبادیوں کا سلسلہ ختم ہونے نہ پایا تھا کہ پلوپنی سس کے سواحل سے مہاجرین کا ایک اور گروہ روانہ ہوا اور دُور سمندر میں قبرس (سای پرس) پہنچا جہاں بالکل قریب زمانے میں اہلِ فنیقیہ (یا کنعانی) بھی آن آن کر بسنے لگے تھے اور جس طرح ایشیاے کوچک میں یونانی اور کاریاوی آباد کار شریک ہوگئے تھے اسی طرح معلوم ہوتا ہے قبرس کے بعض مقامات بھی فنیقیہ اور یونان والوں نے ملکر آباد کئے۔ وہ ایجینی تمدّن جو یونانی مہاجرین اپنے ساتھ یہاں لیکر آے، اب بہت پُرانا ہوچکا تھا جیسا کہ یہاں کے بیشمار آثار قدیمہ سے ظاہر ہے۔ لیکن اہل فنیقیہ کے ساتھ ملنے سے بہت جلد ایک جدید تمدّن صورت پذیر ہونے لگا اور اہل فنیقیہ کے اثر میں آتے ہی یونانیوں کو افرودیت[۱] کی پوجا میں وہ غلو ہوا کہ یہ صنمِ مشرقی، عام طور پر قبرس کی دیوی مشہور ہوگیا۔

مذکورہ بالا آبادی کے انقلاب جو درحقیقت زمانۂ تاریخ کے یونان کی صورت گری کر رہے تھے، سنین سے متعین نہیں کئے جا سکتے۔ اور اس بارہ میں ہمیں صرف ظن وتخمین پر قناعت کرنی پڑیگی۔

---

[۱] یعنی حُسن وعشق کی دیوی زہرہ۔ یونانی دیو مالا میں جلاد فلک یا خداے جنگ مریخ کی بیوفا بیوی تھی جس نے اور دیوتاؤں کے ساتھ رشتہ محبت قایم کرلیا تھا۔ مترجم

اکائیائی استعمار (یعنی نوآبادیاں بسانے) کا زمانہ

تسخیر ناسوس	۱۳ تا دسئویں صدی قبل مسیح
تسخیر ٹروائے	
آیونیائی استعمار کا آغاز	
تھسالیائی فتوحات	
بیوشیائی فتوحات	
کریت و جزایر پر ڈورئین قوم کا قبضہ	
مشرقی پلوپنی سس پر "	
قبرس کی آباد کاری	۱۱ ویں صدی
آیونیائی استعمار کا تسلسل	۱۰ ویں صدی
ایشائے کوچک میں ڈورئین قوم کی نوآبادیاں	۱۰ ویں صدی

۷- ہومر

براعظم یورپ پر کسی یونانی قوم کا بارِ احسان اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ اکائیائی قوم کا، کہ بیانیہ یا رزمیہ نظم انہی کی طبعِ جدت آفرین کا کرشمہ تھی اور اس لئے یورپ کے علم ادب کا سرچشمہ اُنہی کو سمجھنا چاہیئے۔ لیکن مغربی شاعری کا یہ سوتا ایشیای سرزمین سے پھوٹا تھا۔ وہیں سے اکائیائی، مشرق کی وہ قدیم شاعرانہ کہانیاں

سیکھ کر آئے تھے جن میں دن اور رات، اور جاڑے اور گرمی کی لڑائی یا دیگر مظاہرِ فطرت کا بیان کیا گیا ہے۔ نئی جگہ میں آنے اور وہاں کے صعوبات و عجائبات دیکھنے سے اُن کی طبیعت میں وہ ولولے پیدا ہوئے کہ انہی پُرانی کہانیوں کو انہوں نے تاریخی افسانوں کا رنگ دے دیکر دُہرانا شروع کیا۔ مثلاً، یہ بیان کرتے کرتے کہ سمندر کا دیوتا اکی لیس تھا اور اُسے اکاش دیوتا اگامِمنن اور سورج دیوتا مِمنن سے دشمنی تھی چنانچہ مِمنن کو اُس نے مار ڈالا، ایک ٹکڑا حقیقی تاریخ کا بھی اسی افسانے میں الحاق کردیا ہے کہ اکی لیس کا یہ غصّہ جزیرہ لس بوس کے ایک کپتان "بریسئیس"، کی طرفداری کی وجہ سے تھا؛ جس میں تسخیر برِیسہ کا اشارہ نکلتا ہے جو ایک سچّا واقعہ تھا۔

لیکن جب افسانوں میں تاریخ کی آمیزش ہونے لگی تو آخر میں اسی کا رنگ جم گیا اور عوامل فطرت کی کہانیاں نظر انداز ہوگئیں۔ چنانچہ ٹروائے کی داستان کا اوّل اوّل خاتمہ ہکٹر[1] کی موت پر بیان ہوا کرتا تھا۔ اور ابتدا میں خود اس کہانی کا اصلی موضوع، ٹروائے کا محاصرہ نہ تھا جس کی تسخیر بعد میں داستان کا آخری باب بنگئی تھی بلکہ اِس محاصرے کی بساط پر غالباً اکی لیس اور اگامِمنن کی زور آزمائیاں اور اکی لیس و ہکٹر کی باہمی کشمکش دکھانی مقصود تھی

---

[1] پریام شاہِ ٹروائے کا سب سے شجاع اور نامی فرزند ہکٹر تھا جس کی شجاعت و شرافت کا ہومر نے نہایت دلاویز پیرائے میں بیان کیا ہے۔

ٹروائے کی تسخیر اور کاٹھ کا گھوڑا[1]، یہ سب قصّے بعد کی تصنیف ہیں +
یہ شاید گیارھویں صدی قبل مسیح کی بات ہے کہ سمرنا یا اور
کسی ایولیانی شہر میں ایک شاعر نے جسے ہم ہومر اوّل کہہ سکتے
ہیں ایلیڈ نامی مثنوی کا ڈھانچہ تیار کیا۔ اور اس کی بنیاد اُنہی پُرانی
گیتوں پر رکھی جو قدیم سے وہاں متداول تھے۔ یہ مثنوی اکائیانی
یا، جیسا کہ رفتہ رفتہ مشہور ہوگیا، ایولیانی زبان میں تھی اور اکی لیس
کا اظہار غضب اور ہکٹر کی موت اس کا موضوع تھا؛ مگر واضح ہو کہ
یہ امر زرا بھی یقینی نہیں ہے کہ اِس ابتدائی نظم کے لکھنے والے کا
نام ہومر تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک خود یہ مثنوی محض
نقش اوّل تھی اور نویں صدی (ق م) سے پہلے مکمّل نہ ہوئی تھی۔
یہ البتہ ممکن ہے کہ اس آخری زمانے یعنے نویں صدّی میں جس بلند
پرواز صاحبِ فکر نے اُسے تکمیل کو پہنچایا، اس کا نام ہومر ہو؛
بہر حال یہ بعد کی شاعری جزیرۂ خیوس کی پہاڑی سرزمین سے تعلق
رکھتی ہے اور شاعر نے سمندر سے نکلتے ہوئے سورج کی جو تصویر
اُتاری ہے وہ اس کا خاص مقامی مشاہدہ ہے؛ جدید نظم میں شاعر
نے اسی پُرانی مثنوی کے موضوع کو اُٹھایا ہے اور پھیلا کر ایلیڈ

---

[1] جب شہر ٹروئے کسی طرح فتح نہ ہوسکا تو کہتے ہیں کہ محاصر یونانیوں نے
ایک بڑا کاٹھ کا گھوڑا بنایا اور اس کے اندر بہت سے سپاہی چھپ کر
بیٹھ گئے۔ یہ گھوڑا اہل ٹروائے بطور مال غنیمت کھینچ کر شہر کے اندر لے
گئے اور وہاں یک بہ یک سپاہیوں نے اندر سے نکل کے اہل شہر پر
حملہ کیا اور آخر میں اُسے مُسخّر کرلیا + مترجم۔

کے بڑے حصّے کو مرتب و مُشکّل کیا ہے۔ اور مثنوی کی ایک نہایت دلاویز داستان، یعنے پریام کا فدیہ دے کے ہکٹر کو آزاد کرانا، اُسی کی جدّت آفرینی ہے۔ مگر روایت نے ایلیڈ کی طرح دوسری مثنوی "اُڈیسے" کی تصنیف کو بھی ہومر سے منسوب کردیا ہے جس کا کوئی قرینہ نہیں نظر آتا کیونکہ شاہِ اُڈی سیس کی سر گردانی اور اپنے رقیبوں کو قتل کرنے کے گیت[1]، بظاہر آٹھویں صدی سے پہلے نہ جمع ہوسکتے تھے اور نہ ایک بڑی نظم کی صورت میں منسلک ہوسکتے تھے۔

غرض ہومر کی نسبت اِس قدر فرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ نویں صدی کا، خیوس کا باشندہ اور ایلیڈ کا حقیقی مصنّف تھا۔ جس شکل میں یہ مثنوی بالآخر مدوّن ہوئی بعینہٖ اُس حالت میں ہومر نے اُسے نہ چھوڑا تھا۔ بلکہ اُس کے بعد کے شعرا بھی اس میں الحاق و اضافہ کرتے رہے تھے اگرچہ ان کی یہ طبع آزمائی نفسِ مثنوی کے حق میں ہر پہلو سے مُفید نہ تھی۔ بہرکیف ایک پر شوکت رزمیہ نظم لکھنے کا خیال باحوالِ ظاہر سب سے اوّل ہومر کو آیا اور اُسی نے اس کو عملی صورت دی۔ اور یہی نہیں کہ پُرانے بھجن یا گیت اُس نے محض ایک لڑی میں منسلک کردئیے ہوں۔ بلکہ حقیقت میں وہ قدیم شاعری اور منظوم افسانوں کی تہ تک پہنچا۔ اُن کی

---

[1] اِتاکا کا شہزادہ اڈی سیس یا الیاسس مہم ٹروآے کا بہت نامور سُورما ہے اور اکی لیس کی موت کے بعد وہی اُس کا جانشین مانا گیا تھا۔ لیکن تسخیر ٹروآے کے بعد واپسی میں اُسے بہت سے مصائب برداشت کرنے پڑے انہی کا "اُڈیسے" میں بیان کیا گیا ہے۔ وطن پہنچ کر اُس نے اپنے تمام رقیبوں کو قتل کیا جو اُس کی عفّت شعار بیوی پن لوپ کے عشق کا دم بھرتے تھے۔ مترجم۔

اصل و غایت کو سمجھا اور پھر اسی مسالے سے خود ایک نئی عمارت تعمیر کی۔ مگر اسی کے ساتھ وہ خدا داد ایجاد و اختراع بھی ہومر کے حصّے میں آئی تھی جس سے قدما متصّف تھے۔ اور اصنافِ شعر میں ایک ایسی بیانیہ یا رزمیہ نظم کی ایجاد کا سہرا اُسی کے سر ہے جس میں ایک ہی موضوع کو معمولی گیت سے کہیں بڑھاکر بیان کیا جائے۔ پھر جب یہ نظم، ہومر اور اس کے جانشین آیونیہ کے علاقوں میں لائے تو انہیں یہاں کے روز مرّہ میں اسی کو دوبارہ لکھنا پڑا اگرچہ وزنِ شعر کی وجہ سے کہیں کہیں مجبور ہوکر انہوں نے قدیم ایولیانی زبان کو بجنسہٖ رہنے دیا۔ لیکن اِس تجدید میں بھی انہوں نے اپنے عہد کے حالاتِ گرد و پیش سے کوئی سروکار نہ رکھا بلکہ یہی کوشش کی کہ جو کچھ لکھا جائے وہ انہی خصوصیات اور حالات کو پیش نظر رکھکر لکھا جائے جن سے قدیم گیت بنانے والے مانوس و متاثر تھے۔ مثال کے طور پر یہ متاخّرین جن لباس و اسلحہ کا ذکر کرتے ہیں وہ سب عصر النحاس کی یادگاریں ہیں۔ اگرچہ بعض بعض باتیں ان کے قلم سے بے اختیار ایسی تحریر ہوگئی ہیں جن سے اُن کا تاخّر آشکار ہوجاتا ہے، اور اُڈیسے لکھنے والے کے بعض اقوال سے جو بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گئے ہیں، کھُل جاتا ہے کہ وہ عصرِ حدید کا آدمی تھا۔ مثلاً یہی کہاوت جو اُڈیسے میں مذکور ہے "کہ محض لوہے کی چمک، آدمی کو جنگ کی طمع دلاتی ہے" اس وقت تک کہ آہنی اسلحہ عرصہ دراز سے مستعمل نہ ہوں، روز مرّہ میں داخل نہ ہوسکتی تھی۔

ایک زمانہ گزرنے کے بعد، جنگ ٹروائے نے رفتہ رفتہ ایک عظیم قومی کارنامے کی شکل اختیار کرلی۔ تمام یونانیوں کو اس پر فخر و ناز ہونے لگا اور سب کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اس عزت و نیکنامی میں شریک سمجھے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف بستیوں میں بے شمار، افسانے گھڑ لئے گئے جن کا مقصود ٹروائے کی مہم کے سلسلے میں اپنے اپنے بزرگوں کو شامل کردینا تھا۔ ساتھ ہی ایلیئڈ کی قدر بھی بیش از بیش ہوتی گئی اور محض آیونیانی مثنوی کی بجائے وہ ایک قومی نظم تسلیم کی جانے لگی۔ اور جہاں تک مقاصد و خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا تعلق ہے، اس مثنوی نے قومی اتحاد کو ترقی دینے میں ابتدا سے بڑا کام کیا۔ وجود میں آنے کے دو سو برس بعد تک اس میں برابر الحاق و اضافہ ہوتا رہا تھا اور جن امیروں یا سرداروں کے دربار میں وہ گاکر سنائی جاتی تھی انہیں خوش کرنے کی غرض سے گانے والے بھی اس میں کچھ اضافہ کردینے سے نہ چوکتے تھے۔ یہاں تک کہ ساتویں صدی میں یونانی لشکر کی وہ فہرست تیار ہوئی جس کا مقصدِ واضح یہ دکھانا تھا کہ ٹروائے کی مہم تمام یونانیوں کا ایک مشترکہ اور متحدہ کارنامہ ہے +

دوسری مثنوی، اُڈیسے، بھی جس کا ٹروائے کی داستان ہی سے تعلق تھا، قومی نظم بن گئی۔ اور حقیقت یہ کہ اہل یونان کے لئے ٹروائے کی داستان میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ اس مضمون کے سلسلے میں بیسیوں رزمیہ نظمیں اور لکھی گئیں جن میں ٹروائے کے

محاصرے کے پہلے اور بعد کے واقعات کا بیان تھا اور یا اُن یونانی سورماؤں کے حالاتِ مابعد تھے جنھیں ایلیئڈ نے معروف و مشہور کردیا تھا۔ ان نظموں کے لکھنے والوں کے نام کی کسی کو خبر نہ تھی اور اِس لئے وہ بھی عام طور پر ہومر ہی سے منسوب کردی جاتی تھیں۔ اِس طرح ایلیئڈ اور اُڈیسے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخ وار سلسلہ ان رزمیہ نظموں کا بن گیا تھا جسے بعد میں دورِ رزمیہ کے مجموعی نام سے موسوم کرنے لگے ؀

۸۔ قدیم یونانیوں کا ملکی اور تمدنی نظام

ہومر کی نظموں میں ہمیں سب سے پہلی جھلک اُن ملکی آئین و نظام کی نظر آتی ہے جو یورپ کے موجودہ آئین کی تہ بنیاد ہیں۔ ان نظموں میں **بادشاہ** کا اس طرح ذکر آتا ہے کہ وہ لوگوں کا سردار ہے۔ لیکن یہ نہیں کہ وہ محض اپنی ذاتی رائے سے حکومت کرتا ہو بلکہ یہ کہ اس کی رہ نمائی کے واسطے بزرگانِ قوم کی ایک مجلس یا جماعت موجود ہے جس سے وہ مشورہ کرتا ہے اور پھر بادشاہ اور یہ جماعت باہمی غور و بحث سے جو کچھ طے کرتے ہیں وہ ساری قوم یا کُل باشندوں کے جلسے میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور یہی تین اجزائے ترکیبی (یعنی بادشاہ، مجلس اور جمہور) ہیں جن کے ملنے سے یورپ کے تمام ملکی آئین کا نشو و نما ہوا ہے۔ اور انہی کو بادشاہی اور حکومتِ شرفا اور جمہوریت کی مختلف صورتوں کا پہلا

تخم سمجھنا چاہیئے +

مگر نہایت قدیم زمانے میں یہ ملکی نظام کمزور و ناقص تھا اور قوت کا اصلی مرکز گھر یا خاندان ہوتا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے جن یونانیوں کے حالات ہم تک پہنچے ہیں وہ انہیں خاندانوں یا برادریوں کی صورت میں رہتے سہتے تھے۔ ان کے گاوں سے بھی ایک "جی نوس" یعنی ایک بڑے خاندان یا برادری کی بستی، مراد ہوتی تھی جس کے تمام باشندے ایک ہی جدّ کی اولاد اور باہم رشتے دار ہوتے تھے۔ اوّل اوّل بزرگِ خاندان کو اپنے تمام اہل خاندان کی مرگ و زلیست کا پورا اختیار ہوتا تھا، اور یہ اختیار بتدریج اس وقت کم ہوا جب کہ سلطنت کی قوّت بڑھی اور خود خاندانوں کی وہ آزادی قایم نہ رہی۔ لیکن آزادی کے زمانے میں بھی دیہات کی یہ برادریاں بالکل خود مختار اور سب سے بے تعلّق نہ تھیں بلکہ ایک بڑی برادری کا جزو ہوتی تھیں جسے "فیل" یعنی قبیلہ کہتے تھے اور یہی بڑا قبیلہ بجائے خود ایک حکومت ہوتا تھا گویا سلطنت کی سب سے ابتدائی اور سادہ صورت یہی تھی۔ اور وہ تمام زمین جس پر یہ قبیلہ آباد ہوا اس کی "دیموس" یا "دحی" یعنی میراث قومی یا آبائی علاقہ سمجھی جاتی تھی۔ اگر کوئی بادشاہ زیادہ طاقتور ہوگیا اور اُس نے آس پاس کے بادشاہوں کا علاقہ بھی اپنے زیرِ نگیں کرلیا تو کئی کئی قبیلے ملکر ایک قوم بن جاتی تھی +

یہ بھی ایک عام دستور تھا کہ خاص خاص مراسم مذہبی کو مشترکہ طور سے ادا کرنے کے واسطے چند گھرانے آپس میں

مل جاتے اور ایک "فراترا" یا برادری میں شریک ہوجاتے تھے
اس قسم کی دینی برادریوں کا جو زور اُس زمانے میں تھا اس کا اندازہ
کسی برادری سے خارج شخص کا حال پڑھکر ہوتا ہے جیسے ہومر نے
بیان کیا ہے کہ نہ اُس کا کوئی "بھائی" ہوتا تھا نہ الاؤ۔

خاندان کو جو قوّت حاصل تھی اس کا سب سے نمایاں ثبوت
مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کا طریقہ ہے۔ یعنے اس قسم کی زمین،
افراد کی ذاتی مِلک نہ ہوجاتی تھی اور نہ تمام قوم کا مال مشترکہ۔بلکہ
ہر قبیلے یا قبیلوں کا بادشاہ اُس کی اُتنے حصّوں میں تقسیم کردیتا
تھا جتنے کہ اُس کے علاقے میں خاندان یا گھر ہوں۔ پھر قرعہ ڈالکر
ہر خاندان اُن میں سے ایک ایک حصّہ لے لیتا تھا۔اس طرح ہر
خاندان یا گھر اپنی جائداد کا مالک ہوتا تھا مگر وہ سب بھائی بندوں
کی ملکیت ہوتی تھی نہ کہ کسی فردِ واحد کی۔ اور معلوم ہوتا ہے زمین
کا حقِ ملکیت کسی حقِ فتح پر مبنی نہ تھا بلکہ ایک عقیدۂ مذہبی پر۔
چنانچہ ہر خاندان کے مُردے اپنی خاندانی زمین میں دفن کئے جاتے
تھے اور یہ اعتقاد تھا کہ جس زمین میں مُردے دفن ہوں اُس زمین
پر ہمیشہ کے لئے اُنہی کا قبضہ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا قبرستان کے آس
پاس کی زمین انہی مُردوں کے زندہ وارثوں کی اصلی ملکیت ہوسکتی
ہے جن کا فرض ہوتا تھا کہ اپنے بزرگوں کی قبروں کی حفاظت
اور نگہداشت کرتے رہیں۔

بادشاہ کی ذات میں تین حیثیتیں جمع ہوتی تھیں:۔ یعنی مذہبی
پیشوا، قاضی اور سردارِ قبیلہ وہی ہوتا تھا۔نسب کے اعتبار سے وہ

دیوتاؤں کی نسل میں ہونے کا دعوے رکھتا تھا اور اس لئے لوگوں کے خیال میں اس کا اپنی رعایا کے ساتھ ایک محافظ دیوتا کا سا تعلّق ہوتا تھا، اور اپنی قلمرو میں اس کا اسی قدر ادب و احترام ہوتا تھا جتنا کسی دیوتا کا۔ بادشاہی، باپ سے بیٹے کو ورثے میں پہنچتی تھی مگر غالب گمان یہ ہے کہ لوگ کسی ناخلف بیٹے کو جو اپنے باپ کے فرائض بجالانے کی لیاقت نہ رکھتا ہو، بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کرسکتے تھے۔ بہر حال، ایک صاحبِ عصا بادشاہ کو خاص خاص حقوقِ امتیازی حاصل ہوتے تھے۔ مثلاً ضیافتوں میں اُسے صدر پر جگہ دی جاتی۔ مالِ غنیمت میں یا نذر و نیاز کی چیزوں میں زیادہ اور سب سے اچھا حصّہ اس کو ملتا تھا۔ زمین کا ایک قطعہ بھی اُس کی ذاتِ خاص کے واسطے محفوظ کردیا جاتا اور اُس کی خاندانی املاک سے علیحدہ حد بندی کردی جاتی تھی +

لیکن جمہور کے سر گروہوں کی رضامندی کے بغیر، پادشاہ اپنی رائے سے اپنے احکام کی تعمیل نہ کراسکتا تھا اُسے ہمیشہ مجلسِ بزرگان کی صلاح اور رضامندی لینی پڑتی تھی۔ اُس زمانے میں بعض خاندانوں کا مرتبہ رفتہ رفتہ دوسروں سے بڑھ گیا تھا۔ حتّٰی کہ وہ اَمارت یا شرافت کا امتیاز رکھتے اور اپنے تیں رئیس دیوتا کی اولاد بتاتے تھے۔ انہی اُمرا سے مجلس مرکّب ہوتی تھی۔ اور اس مجلسِ بزرگاں کا یہی اقتدار خاندانی اُمرا کے آیندہ ایک ممتاز فرقہ بن جانے کی تمہید تھی +

لیکن یونان کی ترقّی کے حق میں بادشاہ اور مجلسِ اُمرا دونوں

سے بڑھکر اہم عوام الناس کا وہ **اجتماع** تھا جس سے جمہوریت کا نشوو نما ہونے والا تھا۔ قبیلے کے، یا جب کئی قبیلے مل جاتے تو قوم کے، کُل احرار جمع ہوتے۔ اگرچہ اس اجتماع کا وقت معین نہ تھا اور وہ صرف بادشاہ کے طلب کرنے پر جمع ہوتے تھے کہ اس کی اور اس کے مشیروں کی تجاویز سُنیں اور داد دیں، واضح رہے کہ اس طرح سننے اور آفریں و مرحبا کہنے کے سوا ابھی تک ان عوام کو بحث مباحثہ یا خود کوئی تجویز پیش کرنے کا منصب نہ تھا اور مصالحِ ملکی سنانے کے واسطے جو اجتماع ہوتے اُن میں اور ایک فوجی اجتماع میں کوئی امتیاز نہ کیا جاتا تھا۔ گویا مجلسِ عوام اور ایک فوج کے یک جا ہونے میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہِ **اگامَمنن**[1] نے جب اپنی قرار دادیں سنانے کے واسطے تمام لشکر کو ٹرواے کے میدان میں جمع کیا تو وہ **مجلسِ عوام** کا اجتماع کہلایا۔ استعارۃً نہیں بلکہ ٹھیک اسی معنی میں کہ وہ جمہور کا عام جلسہ تھا۔ اور اس کی صورت قریب قریب وہی تھی جیسی رومی آئین میں "کمِٹیا" یا قدیم انگلستان میں "جموٹ" کی ہوتی تھی۔

اگرچہ شخصی بادشاہی کی یہ ابتدائی صورت بالعموم مٹ گئی تھی یا مٹتی جاتی تھی، جیسا کہ ہوَمر کے اشعار خاص کر آخری زمانے کے ہوَمری گیتوں سے پتہ چلتا ہے تاہم بعض دُور دست علاقوں میں

---

[1] یہ مہم ٹرواے میں یونانی بادشاہوں کا سردار اور مای کینی کا مشہور بادشاہ تھا۔ مترجم۔

جو ملکی ترقی میں یونان سے پیچھے رہ گئے تھے، وہ بہت دن تک برقرار رہی چنانچہ رودِ اکسیوس کی وادئ زیرین میں جو مقدونوی یونانی آباد تھے ان کے ہاں آئینِ بادشاہی کا وہی ہومری نمونہ آخر زمانے تک قایم رہا اور بادشاہ کی قوّت برابر بڑھتی رہی +

بہر حال، ہومر کے زمانے میں یونانی ریاستوں کے ملکی نظام ایسے سیدھے سادے اور ناقص ہوتے تھے - نیز، بادشاہی کے آخری ایام میں ہمیں ایک اور تحریک قوت پکڑتی نظر آتی ہے جو حقیقت میں آیندہ تاریخ پر فیصلہ کُن اَثر ڈالے گی - یعنے منتشر دیہات کے مجموعے مِل ملکر شہر کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں - میدان ووادی کے بسنے والوں کو ترغیب ہوتی ہے کہ اپنے دور افتادہ کھیڑوں کی سکونت چھوڑ کر کسی ایک جگہ اکٹھے آرہیں - اور جگہ، عام طور پر قلعۂ شاہی کے زیر سایہ پسند کی جاتی تھی - بعض اوقات کئی کئی گانوں کے گرد دیوار کھینچ کر انہیں ایک احاطے میں لے لیا جاتا اور بعض اوقات محض ہمسایہ قلعے کی حفاظت کافی سمجھی جاتی تھی - اِس تحریک کو بادشاہ بھی ترقی دیتے تھے اور عجب نہیں کہ بعض طاقتور بادشاہوں نے اس بارے میں زبردستی سے بھی کام لیا ہو مگر انہیں یہ خبر نہ تھی کہ اس تحریک کو قوت پہنچانا، شخصی بادشاہت کی بیخ کنی کرنا اور خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنا تھا - کیونکہ مدنیت یا اس قسم کی شہری ریاستوں کا قدرتی میلان، جمہوریت کی طرف ہوتا ہے +

الغرض عہد شجاعت میں، بلکہ اس کے بہت آخری زمانے

تک جب کہ وہ نظمیں جو ہومر سے منسوب ہیں تیار ہوئیں، "سلطنت" یا "حکومت" پوری طرح "برادری" سے متمیز نہ ہوئی تھی۔ نہ وہ قانون بناتی تھی اور نہ ان کی پابندی کراتی تھی۔ وہ عام آداب و ضوابط جنہیں ہر شخص اپنے طریقِ عمل میں ملحوظ رکھتا تھا اور ملکر رہنے میں جن کی پابندی ناگزیر ہے، دینی عقاید کی صورت میں واجب العمل سمجھے جاتے تھے۔ بعض جرایم کی سزا دیوتاؤں کی جانب سے ملتی تھی۔ مگر قتل و خون کا قصاص لینا ساری قوم کا کام نہ تھا بلکہ قاتل کا خاندان فیصلہ کرتا تھا اور بادشاہ بھی حقیقت میں محض ثالثی یا پنچایت کے طریق پر داد رسی کرسکتا تھا باقی کسی اجنبی کو داد خواہی کا کوئی حق نہ تھا اور کسی غیر بستی یا قوم میں وہ قتل کردیا جائے تو کوئی باز پرس قاتل سے نہ ہوتی تھی، بجز اُس حالت کے جب کہ وہ اس قوم کے کسی فرد کا مہمانِ عزیز اور اُس کے ساتھ سلکِ اتحاد میں وابستہ ہو۔ اس صورت میں وہ خاص "مہمان نواز زیئس" دیوتا کے زیر حمایت آجاتا تھا۔

اس زمانے میں مال و دولت سے مُراد، گلّے اور ریوڑ ہوتے تھے۔ اور مثالاً، کسی غلام یا زرہ بکتر کی قیمت بتانی ہو تو بیلوں کی تعداد سے بتائی جاتی تھی۔ بحری قزّاقی اس عہد کا عام پیشہ تھی اور ایسی حالت میں کہ کوئی باقاعدہ قوّت اس کا انسداد کرنے کے لئے موجود نہ ہو۔ ایسا ہونا بھی لابد تھا۔ چنانچہ اس پیشے پر اتنے لوگوں کی وجہِ معاش تھی کہ اُسے کچھ مذموم نہ سمجھا جاتا تھا اور جب کبھی کوئی جہاز کسی غیر ساحل پر لنگر ڈالتا تو

ملاحوں سے وہاں کے باشندوں کا قدرتی طور پر پہلا سوال یہ ہوتا "پردیسیو! تم کہاں سے آئے؟ یا تم قزاق ہو جو سمندر چھانتے پھرتے ہو؟"

۹۔ شخصی بادشاہت کا خاتمہ اور جمہوری حکومتوں کا آغاز

جزایر و سواحلِ ایجین کو یونانیوں نے اپنے بادشاہوں کی تحتی کے زمانہ میں بسایا اور اسی عہد بادشاہی میں ان کی شہری ریاستیں عالم وجود میں آئیں یہ دونوں یونانی تاریخ میں شخصی بادشاہی کے بڑے کارنامے ہیں۔ آٹھویں صدی (ق م) میں شخصی بادشاہت کا زوال شروع ہوا اور یونان کے بیشتر حصے میں ہم انہیں منقرض اور ان کی بجائے جمہوری حکومتوں کو قایم ہوتے دیکھتے ہیں۔ اس انقلاب عظیم کے اسباب کا قطعی علم نہیں ہے اور اس کے متعلق صرف قیاس و قراین سے ہم کوئی راے لگا سکتے ہیں۔ البتہ اس میں کچھ شبہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس انقلاب کی تہ میں سب سے بڑا سبب وہی طرزِ تمدن کی تبدیلی یعنے شہری زندگی تھا؛ بعض بعض حالتوں میں ممکن ہے کہ بادشاہوں کا ظلم و ستم اُن کے جبراً معزول کئے جانے کا سبب ہوا ہو۔ یا ممکن ہے کہ کسی وارثِ سلطنت کی صغر سنی یا دنائیت نے کہیں کہیں امرا کو خود بادشاہی کے مٹا دینے پر آمادہ کردیا ہو۔ ایک اور صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کسی بادشاہ کے ناجایز اختیارات

غصب کرنے کی سزا میں اُس کے پہلے حقوق محدود کردیئے گئے
ہوں اور پھر اس حد بندی کی رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی ہو
کہ منصبِ بادشاہی محض برائے نام باقی رہ گیا اور اُسکے اختیارات
گھٹ کر معمولی عہدے دار جیسے ہو گئے اور اصلی حکومت دوسرے
ہاتھوں میں منتقل ہوگئی ہو۔ چنانچہ پہلی قسم کی محدود و مشروط
بادشاہی کی ایک یادگار ہمیں اسپارٹہ میں اور دوسری صورت
کی مثال جس میں بادشاہ محض ایک عہدے دار رہ گیا تھا، ایتھنز
میں ملتی ہے جہاں آخر میں اُس کا نام "آرکن باسی لیوس" یعنی
میعادی حاکم (یا بادشاہ) ہوگیا تھا +

اس طرح جہاں کہیں شخصی بادشاہت مٹی وہاں کی حکومت
اُس کے مٹانے والوں کے ہاتھ میں آگئی یعنی ریاست کے
شرفا یا خاندانی اُمرا کے پاس منتقل ہوگئی۔ اور حکومت کا گروہِ شرفا
کے ہاتھ میں آجانا گویا حکومتِ شرفا کا آغاز تھا۔ بعض مقامات
پر امرا کے تمام خاندانوں کی بجائے، صرف خاندانِ شاہی کے
افراد تھے جنہوں نے شخصی حکومت چھین لی۔ جیساکہ کورنتھ میں
ہوا جہاں خاندانِ باکیوس کی موروثی بادشاہت کی بجائے اسی
کے اہل خاندان نے نہایت ہی محدود قسم کی **حکومتِ خواص**
قایم کی +

تمدّن کی اس منزل میں، عام طور پر عالی نسبی کو قابلیت کا
سب سے اچھا ثبوت سمجھا جاتا تھا اور اس لئے یہ عہدِ انقلاب
شرفا کی حکومت کا نہایت عمدہ نمونہ ہے کہ صاحبِ نسب ہونے

کی وجہ سے اُن سے بڑھکر حکومت کا اہل کوئی نہ تھا۔ فنِ
ملک داری کی مشق اور تربیت انہی کو حاصل ہوتی تھی اور ان کے
یہ اوصاف پُشت در پُشت منتقل ہوجاتے تھے۔ اور ہر چند اِس عہد
میں کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہوا (اور بڑے آدمی کا پیدا ہونا
حکومت شرفا کے واسطے خطرے سے بھی خالی نہیں ہے!)
تاہم ریاست کا نظم و نسق واقفیت اور سلیقے کے ساتھ انجام
پاتا رہا۔ گو کسی محدود و پیوستہ حکومتِ شرفا کا، جیسی کورنتھ میں
تھی، جبر و تشدد کر گزرنا کچھ بعید نہ تھا، پھر بھی مجموعی طور پر
عہدِ شرفا میں جمہوریت کی نشو و نما ہوتی رہی اور عنانِ حکومت
بھی نہایت قابل اشخاص کے ہاتھوں میں رہی؛ چنانچہ اِس
دور کے دو بڑے کارنامے یہی ہیں کہ ایک تو اس زمانے میں
یونانی بستیاں بحیرہ ایجین سے دُور دُور کے ملکوں میں قایم
ہوئیں اور دوسرے آئین نظم و نسق میں وسعت و کشادگی پیدا
ہوئی۔ ان میں امرِ اوّل کو یونانی نو آبادیوں کے اُسی سِلسلے میں
داخل سمجھنا چاہیئے جو پہلے بحیرہ ایجین کے گرد پھیل گئی تھیں
البتہ شرفا کی حکومتوں نے اسی تحریک کو ترقی دے کر باقاعدہ
اور منتظم کردیا؛ باقی سیاسی شیرازہ بندی کا کام حقیقت میں اس
وقت شروع ہوچکا تھا جب کہ بادشاہی زمانے میں بکھری ہوئی
آبادیاں شہری ریاستوں میں آکر جمع ہونے لگی تھیں۔ پھر جس
وقت خود شخصی بادشاہت کا تختہ اُلٹایا اُس کے وہ ہمہ گیر اختیارات
چھنے تو نئے حکمرانوں کو ضرورت ہوئی کہ وہ اوقاتِ معیّنہ کے واسطے

ان کے بجائے نئے عہدہ دار بنائیں - اسی ضمن میں انھیں یہ طے کرنا پڑا کہ ان عہدہ داروں کا تقرر کس اصول سے ہو - اُن کے اختیارات کی حد بندی کیوں کر کی جائے اور حکومت کے علیحدہ سررشتوں کی تقسیم کیوں کر ہو؟ پس اِن اغراض کے لئے اور قدیم نظام کے اُن اجزاے ترکیبی کی بجائے جو اب غائب ہوگئے تھے، اُنھیں نئے پُرزے ایجاد کرنے پڑے *

۱۰- اہلِ فنیقیہ کے روابط، یونان کے ساتھ

اہلِ یونان کی قسمت میں ایک نامور جہازران قوم ہونا لکھا تھا لیکن بحری تجارت کے گُر سیکھنے میں انھیں بہت عرصہ لگا- جزائرِ ایجین پر جب اُن کا تصرّف ہوا تو ساتھ ہی اِن جزیروں کی اور خاص کر اہلِ کریٹ کی پہلی بحری فوقیت بھی زایل ہوگئی - اور بیچ کے زمانے میں بہت دن تک ایجین کی مشرقی تجارت پردیسیوں کے قبضے میں رہی - اس کاروبار میں سب سے زیادہ فایدہ جن لوگوں نے اٹھایا وہ سواحلِ شام یعنی صوّر و صیدا کی شہری ریاستوں کے باشندے تھے جو اُسی نسلِ سامی سے تعلّق رکھتے تھے جس کی اولاد میں یہودی، عرب اور اہلِ اشور ہیں غرض متحقّق ہے کہ یونان کے جزایر و سواحل پر ان لوگوں نے اپنی تجارتی منڈیاں بنا رکھی تھیں - اور تھریس کے شہر ابدرا میں ان کا ایک تجارتی مستقر ہونا ثابت ہے - بحیرہ ایجین میں شمال

سے جنوب تک اُن کے تجارتی جہاز برابر گشت لگاتے اور آتے جاتے رہتے تھے۔ ملک شام کی نفیس ململ، شہر سیدا کی کارگاہوں سے اور قبرص کے نقرہ گروں کے بنائے ہوئے خوبصورت ظروف اور انواع و اقسام کے سامانِ عیش و زیبائش ان جہازوں میں لدے ہوتے تھے۔ اس طرح قریب قریب دو صدی تک اِن بحری تجار کی یونانی علاقوں میں آمد و رفت رہی اور یونان پر فنیقیہ کا جو کچھ اثر پڑا اسے اتنے عرصے کے تجارتی تعلقات کا قدرتی نتیجہ سمجھنا چاہیئے +

روایتِ عام کی بموجب یونان اور اس لئے یورپ پر فنیقیہ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ تمدّن و شائستگی کا سب سے مفید آلہ یعنی فنِ کتابت، یونانیوں کو انہی مشرقی تاجروں نے عطا کیا۔ یہ روایت صحیح ہو تو غالب گمان یہ ہے کہ نویں صدی ہی کے آغاز میں فنیقی ابجد میں یونانی زبان کی ضرورتوں کے مطابق ردّ و بدل کر لیا گیا تھا۔ مگر اس نقل میں بھی اہل یونان نے بڑی طبّاعی دکھائی ہے۔ اہل فنیقیہ اور ان کی ہم نسل سامی اقوام کی ابجد بیشتر حروفِ صحیح سے مرکّب ہے۔ یونانیوں نے اِس میں حروفِ علّت اور بڑھا لئے۔ یعنی بعض فنیقی حروف کو جن کی آوازیں ان کی زبان میں موجود نہ تھیں انہوں نے لیکر اپنے ہاں کے حروف علّت قرار دے لیا؛ قیاس چاہتا ہے، کہ یہ جدّت پہلے آیونیہ کے ایشیائی علاقوں میں کی گئی۔ اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ خاص یونان والوں کی نسبت آیونیہ

کے لوگ فن کتابت سے کچھ عرصہ پہلے روشناس ہو چکے تھے اور شاید نویں صدی کے بعض شعرا نے وہاں اس فن سے کام لینا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ فنِ کتابت کا سب سے پہلے ایلیڈ میں کنایتہً ذکر آیا ہے۔ یعنی بِلیروفون کی داستان میں۔ جس کی نسبت شاعر نے لکھا ہے کہ وہ ارگوس سے لیسیہ چلا تو "ایک ملفوف لوح پر خوفناک نشانات" ساتھ لئے ہوئے تھا اس میں شک نہیں کہ قدیم زمانے میں حروفِ تصویر سے بھی یونان میں کام لیا جاتا تھا لیکن اس موقع پر قرینہ کہتا ہے کہ حروف تصویر کی بجائے یونانی ابجد میں لکھا ہوا خط شاعر کے خیال میں تھا جسے اُس نے مذکورہ بالا طریق سے بیان کیا ہے ۔

۱۱- یونانیوں کا اپنی قدیم تاریخ کو از سرِ نو ترتیب دینا

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ خود بعد کے یونانی اپنی قدیم تاریخ کی نسبت کیا خیال کرتے تھے۔ عہدِ ماضی کے متعلق اُن کے خیالات کا اثر اُن کے اپنے افکار و افعال پر پڑتا تھا۔ اور اس لئے اُن خیالات کو معلوم کرنا فایدے سے خالی نہ ہوگا۔ خاص کر اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی لوگ تاریخی زمانے میں بھی اپنے اوہام اور افسانوں کو اس قدر مانتے تھے کہ اکثر اوقات انہی قصّوں پر ان کے سیاسی معاملات مبنی ہوتے اور ملکی سرحدوں

کا تصفیہ قدیم سورماؤں کی اسی قسم کی مفروضہ فتوحات یا مقبوضات کی روایتوں پر کر دیا جاتا تھا۔

تاریخی واقعات کی تلاش و جستجو کا شوق پیدا ہونے سے قبل، جس چیز نے اہل یونان کو عہد ماضی کے حالات کی تحقیق کرنے پر آمادہ کیا وہ اُن کے اُمرا کی یہ خواہش تھی کہ اپنے انساب کا سلسلہ کسی دیوتا تک ملادیں اس غرض کے لئے وہ اپنے شجرے کسی قدیم سورما، خاص کر ہراکلیس (یا ہرقُل) یا جنگ ٹروائے کے مردانِ جنگی تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ کیونکہ جنگ ٹروائے اگر ایک قومی کارنامہ سمجھا جاتا تو اسی طرح ہراکلیس بھی تمام یونانیوں کا ایک قومی سورما شمار ہوتا تھا؛ ان کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ اہل یونان نے اپنی تاریخ کی بنیاد انہی انساب پر رکھی اور سنینِ تاریخ کا حساب بھی نسل یا پیڑھیوں پر رکھا؛ اور تین پیڑھیوں کا زمانہ ایک صدی کو قرار دیا۔ اس کے بعد ساتویں صدی میں ہسیود (ہی سیڈ) اور اس کے متبعین شعرا نے عہدِ شجاعت کے افسانوں کو ایک تاریخی سلسلے میں منسلک کرنے کی سب سے زیادہ کوشش کی۔ خود اُن کی نظمیں اب مفقود اور ناپید ہیں۔ لیکن اُن کے بعد چھٹی اور پانچویں صدی (ق۔م) کے افسانہ نویسوں نے انہی منظوم حالات کو زیادہ بسوط و مشرّح نثر میں تحریر کیا۔ اور ان میں شاید سب سے مقبول نثّار ملطہ کا ہکاتیوس اور اکوسی لوس باشندۂ آرگوس تھے۔ ان افسانہ نویسوں کی اصلی تحریریں بھی مٹ چکی ہیں لیکن اُن کے بتائے

ہوئے قصّے بعد کے لکھنے والوں کی تحریر کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں:
ان متقدّمین کو سب سے پہلے یہ طے کرنا پڑا کہ نسلِ یونانی کی مختلف شاخوں میں کیا رشتہ ہے؟ واضح ہو کہ یونانیوں کے تمام گروہ رفتہ رفتہ ایک ہی نام ہل لینز یا ہیلینی سے موسوم کئے جانے لگے تھے۔ پس اسی وقت سے انہوں نے اپنا مورث اعلیٰ محض نام کی مناسبت سے ہلن کو قرار دے لیا تھا جو تھسالیہ کا باشندہ بیان کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دوسرا سوال یہ تھا کہ اُن کی مختلف شاخوں کی تقسیم کیوں کر ہوئی؟ بحیرۂ ایجین کی دوسری طرف وہ دیکھتے تھے کہ خود انہی کی نسل کے بڑے بڑے صرف تین گروہ آباد ہیں:۔ ایولیانی، آیونیانی اور ڈورئین۔ یہ گویا ایک آئینہ تھا جس میں اُنہیں خود اپنی شکل نظر آتی تھی اور اسی کی بنا پر اُنہیں اپنی نسلی تقسیم میں دشواری نہ پیش آتی تھی۔ چنانچہ وہ بیان کرتے کہ ہلن کے تین بیٹے تھے:۔ ایولوس، آیون، اور ڈوروس۔ اور انہی کی اولاد مذکورۂ بالا تین ناموں سے منسوب و ممتاز ہوئی۔ لیکن اس میں دقّت یہ تھی کہ ہومر کے ممدوح اکائیانیوں کا کہیں ذکر نہ آتا تھا۔ حالانکہ خود آیونیانی، ایولیانی یا ڈورئین گروہوں کا ایلیڈ کی داستانوں میں کوئی حصّہ نہ تھا۔ لہذا بعد میں یہ ترتیب یوں بدلی گئی کہ ہلن کے تین بیٹے تھے ایولوس، ڈوروس اور زوتوس اور زوتوس کے دو بیٹوں کا نام آیون اور اکیوس تھا؛ اس تقسیم کے بعد یونان خاص کے مختلف فرقوں اور گروہوں کو انہی میں سے کسی کی اولاد میں داخل کرلینا، آسان بات تھی اور روایتوں اور مروجہ

السنہ کی مدد سے تمام یونانی اقوام کو اور نیز اُن کی بولیوں کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسی مصنوعی تقسیم کے ماتحت، ایولیانی، ایونیانی یا ڈورئین گروہ میں داخل کرلیا گیا تھا۔

تمام قدیم روایات اور چھوٹے بڑے واقعات کا سلسلہ جن دواہم واقعات تک پہنچتا تھا وہ جنگ ٹرواِے اور پلوپنی سس کی ڈورئین فتح تھے اس فتح کی شہرِ ارگوس میں ایک عجیب توجیہ گھڑی گئی تھی اور اسی پر لوگوں کا رفتہ رفتہ یقین جم گیا تھا۔ آرگوس میں جو تمنوسی خاندان حکمران تھا وہ، شاہِ اگی میوس کو اپنا مورث اعلیٰ بتاتا تھا۔ ۔ اور اگی میوس وہ شخص ہے جسے ڈورئین آئین و قوانین کا بانی بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بعد میں جب ہراکلیس کی شہرت و ناموری کا غلغلہ بلند ہوا تو شاہانِ آرگوس کو اُس سے اپنا نسب ملانے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اور اس عقدے کو انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ یوں حل کیا کہ اگی میوس کے جو تین بیٹے مشہور تھے[1]، اُن میں سے بڑے یعنی ہیلوس کو ہراکلیس کا فرزند قرار دیا اور یہ کہانی بنائی کہ اگی میوس کی جانب سے جو تھسالیہ کا ڈورئین بادشاہ تھا، ہراکلیس نے قوم لاپیت کے ساتھ لڑائی لڑی تھی اور ان شجاعانہ خدمات کے صلے میں یک ثلث قلمرو اُسے عطا کردی گئی تھی۔ پھر جس وقت وہ مرا تو اس کی اولاد کو اگی میوس نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اُس کے ایک بیٹے ہیلوس کو اپنا بیٹا بناکر ہراکلیس

---

[1] یعنی ہیلوس، پام فیلوس اور ڈیمان۔ اور انہی کی اولاد اور ناموں سے ڈورئین قوم کے تین فرقے جن کا پہلے کہیں ذکر آچکا ہے منسوب تھے۔

کا جانشین بادشاہی تسلیم کرلیا۔ پھر اس ہیلوس کے بیٹوں نے کوشش کی کہ اپنے دادا یعنی ہراکلیس کی اصلی میراث کو جو پلوپنی سس میں تھی غاصبین سے چھین لیں۔ لیکن اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی اور اس فتح کا سہرا ہیلوس کے پروتوں کے سر بندھا جو تمنوس، کرس فونتیس اور ارستودموس کے ناموں سے موسوم تھے۔ ہراکلیس کے انہی اخلافِ سعید نے بندرگاہ نوپاکتوس سے ایک ڈوریانی لشکر لے کر پلوپنی سس پر چڑھائی کی اور اطولیہ کے ایک یک چشم باشندے اُکسیلوس کی رہ نمائی میں، ارکیدیہ کے سوائے، تمام جزیرہ نمائے پلوپنی سس فتح کرلیا۔ اُکسیلوس کی محنت و جان کاوی کے صلے میں الیس کا علاقہ انہوں نے اُسے دیدیا۔ پلوپنی سس کے وہ اکائیانی باشندے جو سمندر کے پار ہجرت نہ کرسکے پسپا ہوتے ہوتے شمالی سواحل پر سمٹ آے یعنی اکائیہ کے تاریخی علاقے میں۔ لیکن باقی تمام جزیرہ نما انہی تین بھائیوں کے حصے میں آگیا اور قرعے کی رو سے مِسینہ، کرس فونتیس کو ملا۔ لقونیہ ارستودموس کو اور ارگوس، تمنوس کو۔ اسپارٹہ میں جو دو شاہی خاندان وقتِ واحد میں حکومت کیا کرتے تھے اُس کی توجیہ بھی آخر میں بڑھادی گئی تھی۔ وہ یہ کہ لقونیہ کا حصہ دار یعنی ارستودموس قبل از وقت مرگیا اور اس لئے وہاں کی بادشاہت اُس کے توام بیٹوں یُرس تِنیس اور پراکلیس[۱] میں تقسیم کردی گئی۔

---

[۱] اسپارٹہ کے شاہی خاندان جو اجیسی اور یوری پنٹی کے ناموں سے موسوم تھے اُن کے مورثوں کو بھی روایتوں نے انہی یورس تِنیس اور پراکلیس کی اولاد قرار دے دیا تھا۔ ۱۲

مشہور یونانی داستانیں یعنی ہراکلیسؔ کی مشقت وآزمایش - جنگ ٹرواے - ارگونات کا بحری سفر - کدموس کا قصہ - اوڈیپوس کے سوانح تھیبز کا دو مرتبہ محاصرہ وغیرہ تمام کہانیوں کی جزئیات کا تعلق یونانی دیو مالا سے ہے اور وہ ہماری پیش نہاد حدود سے باہر ہیں۔ لیکن ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ بعد کے یونانی ان تمام قصوں کو سچا جانتے تھے اور معتبر واقعات تاریخی کی طرح اُن پر بحث و گفتگو کرتے تھے - اس قسم کے افسانوں کی اختراع و اشاعت کے دو قوی اسباب تھے :- اوّل تو یہ دستور کہ ہر خاندان اور شہر کے لوگ اپنا مورث اعلیٰ کسی دیوتا کو بتاتے تھے - دوسرا سبب یہ کہ مقامات، خاص کر شہروں کو اور چشموں اور ندیوں کو ذی روح فرض کرلینا اہل یونان کی جبلت میں داخل تھا۔ پھر جب لوگوں کو اتحادِ نسل و زبان کی تمیز و قدر ہوئی اور واقعاتِ گذشتہ پر قیاس آرائی کا شوق ہونے لگا تو اپنے ملک کے متفرق افسانوں کو باہم مطابق کرنے کی کوشش کرنا قدرتی بات تھی۔ کیونکہ جب وہ سب صحیح ہیں تو ضرور ہے کہ اُن میں توافق و مطابقت پیدا کی جائے[ع۱]۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انساب کی

ع۱ - پھر بھی بہت سی بے ربط اور متناقض کہانیاں باقی رہ گئیں۔ مثلاً ایک زبان زد قصے کی بموجب تھیبز کو کدموس نے آباد کیا تھا - لیکن اڈیسے میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس کے بانی امفیون اور زیتوس تھے - یا مثلاً ایک کہانی میں کورنتھ کی بنیاد کا سُراغ سمندر کی بیٹی افیرہ تک چلایا گیا ہے اور دوسری جگہ اس واقعے کو ایولوس کے بیٹے سسی فوس سے منسوب کیا ہے *

بنیاد پر اُن کی سن بندی اور ترتیب کی گئی۔ اور اس ترتیب کے مطابق جو اُن میں سب سے زیادہ مقبول و مسلّم تھی[1]، ٹروائے کی تسخیر ۱۱۸۴ء (ق م) میں ہوئی اور ڈورئین قوم نے ہراکلیس کی سرداری میں پلوپنی سس کو ۱۱۰۴ء (ق م) میں فتح کیا۔ اور اس میں کلام نہیں کہ عام قراین سے مذکورہ بالا واقعات کا جس زمانے میں ہونا پایا جاتا ہے اُس سے یہ دونوں تاریخیں کچھ بعید نہیں ہیں بلکہ اُن کے طریقِ تعیّن کا لحاظ کیا جائے تو توقّع سے بڑھ کر مطابقت رکھتی ہیں +

---

[1] یعنی وہ ترتیب جو اُرتس تنس (۲۲۰ء ق م) نے مرتّب کی تھی۔ اس میں حسب ذیل سنین بھی شامل تھے:-

کدموس	۱۳۱۳ ق م
پیلوپ	۱۲۸۳
ہراکلیس..........	۱۲۶۱ تا ۱۲۰۹
ارگوناتوس..........	۱۲۲۵
تھیز برفوجکشی	۱۲۱۳
تسخیر ٹروائے	۱۱۸۴
فتح تھسالیہ فتح بیوشیہ ایولیانی ہجرت	ق م ۱۱۲۴
فتح پلوپنی سس	۱۱۰۴
کدروس کی وفات	۱۰۴۴
آیونیانی مہاجرت	۱۰۴۴
عہد لکرگس (اسپارٹہ میں)	۸۸۵

باب دُوم

یونان کی وسعت

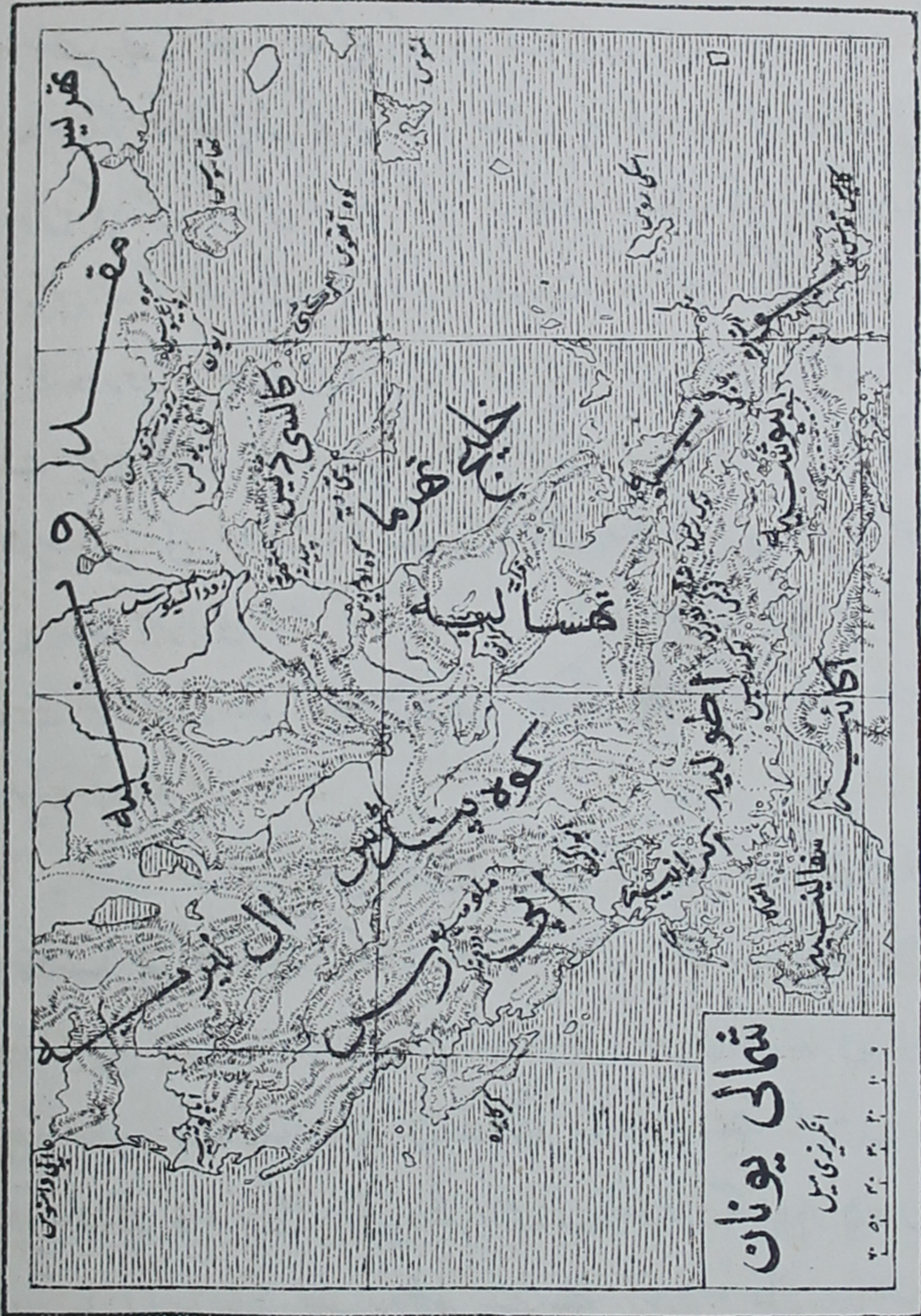
ا۔یونانی نو آبادیوں کی وجوہِ بنا اور خصوصیات

یونان خاص اور سواحلِ ایجین سے دیگر اطراف میں یونانیوں کے پھیلنے اور تھریس، بحیرۂ اسود، اطالیہ، صقالیہ (سسلی) بلکہ فرانس و ہسپانیہ کے ساحلوں تک نوآبادیاں قایم کرنے کا سلسلہ آٹھویں صدی میں شروع اور چھٹی صدی قبل مسیح میں ختم ہوا اور اگرچہ ہم دَورِ قدیم کے تفصیلی حالات سے نا بلد ہیں لیکن سچ پوچھئے تو جس طرح پہلی مرتبہ یونانی قوم جزائر، ایجین اور ایشیائے کوچک کے ساحلوں پر آبسی تھی اسی طرح اور اسی سلسلے میں، وہ اب دیگر اطراف و اکناف میں پھیلنے لگی۔ اُس کی اور اہل فنیقیہ کی نوآبادیوں میں بھی بڑا فرق یہی ہے کہ فنیقیہ والے اگر کہیں اپنی

بستیاں غیر ملکوں میں بساتے تو اس سے محض اپنی تجارت کو ترقی دینا مقصود ہوتا تھا۔ چنانچہ اُن کی نوآبادیوں میں صرف چند شہروں اور خاص کر **قرطاجنہ** کو یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ ان کی حیثیت محض تجارتی کوٹھیوں کی سی نہ رہی؛ ان کے برخلاف، یونانی آباد کار تجارتی منافع کا خیال نہ کرتے تھے بلکہ دیگر ضروریات کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اور اُن کا دُور دراز ملکوں میں پہنچنا اُس اولوالعزمی کا بھی اظہار تھا جو شاعرانہ پیرایے میں مختلف افسانوں سے مترشح ہے۔ مثلاً "ارگو کی روانگی" یا "اڈیسیس کی مراجعت" سے۔ بالفاظ دیگر یہ اسی قسم کا جوش تھا جس نے انگریزی قوم کو بعد میں مسافت ہائے بعید پر نو آبادیاں بسانے کا شوق دلایا اور جس میں تجارتی اغراض کا کوئی واسطہ نہیں ہوسکتا تھا۔

یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات بحری تجارت نے بھی یونانی آباد کاروں کو ممالکِ غیر کا راستہ دکھایا تھا۔ چنانچہ ملطہ کے سوداگر جنہوں نے بحیرۂ افشین (یا اسود) کے پُرخطر سمندر میں درآنے کی جسارت کی تھی، یہاں کے ساحلوں کی قدرتی بنادر اور نئے شہروں کے واسطے دلکش مواقع دیکھ گئے تھے اور اُنہی نے وطن آکر آباد کاروں کی جماعت کو مرتب کیا۔ ایسے ترکِ وطن کے لئے محتاج و دل برداشتہ یا اولوالعزم و دلیر اشخاص ہمیشہ آمادہ ملجاتے تھے اور کم سے کم ابتدا میں، ہجرت پر جو شے لوگوں کو مجبور کرتی تھی وہ وطنی آبادی کی بیشی نہ تھی بلکہ زمین کی تقسیم کا وہ طریقہ جو اُن میں اُس وقت مروّج تھا

۵۰



مشترکہ خاندان کا دستور ہونے کے باعث، جو آزاد اور بلند حوصلہ طبائع کے واسطے موزوں نہیں ہے، مختلف اسباب ایسے پیدا ہوتے رہتے تھے جن کی بدولت خاندان کے بعض افراد جدّی جائیداد

سے محروم اور خاندان سے الگ کر دئے جاتے۔ اور ایسے بے گھرے ممالکِ غیر میں توطن اختیار کرنے پر بالکل تیار رہتے۔ دوسرے آٹھویں اور ساتویں صدی (ق م) میں اکثر یونانی ریاستوں کے ملکی حالات بھی ترکِ وطن کے مساعد تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں، ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ بالعموم حکومتِ شرفا کا دَور دورہ تھا۔ اس حال میں اکثر اشخاص کو جن کی وطن میں کوئی پرسش نہ ہوتی، اپنا شہر چھوڑنے اور نئی بستی بسانے کی ترغیب ہوتی تھی کہ شاید وہاں جاکر حکومت و فرمانروائی کر سکیں۔ غرض اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قسم کی دل برداشتگی بھی نئی آبادیاں بسانے کا ایک قریبی سبب تھی ؛

مگر یونانی تارکانِ وطن جس مقام پر پہنچتے وہاں اپنی رسوم و زبان کو برقرار اور نئے شہر کی وضع بھی بالکل یونانی رکھتے تھے۔ گویا وہ ملکِ یونان ہی کا ایک ٹکڑا ہے جو افشین کے بعید کناروں پر یا مغربِ اقصیٰ میں فرانس یا ہسپانیہ کے دُور افتادہ ساحل پر لاکر کسی نے جوڑ دیا ہے! نیا شہر بسانا لوگوں کا ذاتی کام تھا لیکن بسنے کے بعد شہرِ مادری یا وطنِ آبائی سے رشتے داری کا تعلق قائم رکھنے کا بہت خیال کیا جاتا تھا خاص کر بڑے بڑے، سالانہ تہواروں کے موقعے پر آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا اور "بیٹی" یعنی نوآبادی کی طرف سے اپنی "ماں" کی خدمت میں مختلف طریقوں سے دخترانہ آداب و اکرام کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اور مثلاً، مگارا کی نوآبادی بای زنطہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ جب خود وہ اپنی علٰحدہ نوآبادی مسمبریہ

بساتی ہے تو اس کام کے لئے یہ بھی فرض سمجھتی ہے کہ ایک ہادی یعنی نئے شہر کی بنیاد رکھنے والا، میگارا سے بلایا جائے، علاوہ ازیں نوآبادیاں بسانے کی سیاسی ضرورت کو مذہب نے بھی مباح تسلیم کرلیا تھا اور اس لئے نئی بستی کی بنیاد رکھتے وقت اس رسم کا ادا کرنا بھی ضروری تھا کہ پہلے ڈلفی کے دیوتا سے اس کام کی منظوری لے لی جائے، اس قسم کے الہامی اور غیب کے جواب دینے والا سب سے قدیم بت ڈدونا کا رئیس تھا لیکن یہ شاہ بلوط کی خانقاہ اپیرس کی پہاڑیوں میں اتنی دور واقع تھی کہ وہ تمام یونان کا مرجع نہ بن سکتی تھی اور چونکہ اپالو دیوتا کا مندر یونان کے قریب قریب وسط میں واقع تھا لہذا ڈلفی کے عیار پجاریوں کو موقع مل گیا تھا کہ اپنے معبود کی بڑائی میں اسی کو عالم یونانی کا حقیقی اور بلند مقام رہ نما ثابت کریں ؛

ان نوآبادیوں نے دو طریقوں سے، یونانیوں میں جذبات اتحاد کو بھی ترقی دی۔ ایک تو ممالک غیر کی سرحدوں پر جاکر آباد ہونے کی بدولت انہیں یونانی اور غیر یونانی کا احساس و امتیاز ہوا اور اغیار کے مقابلے میں انہیں اپنی ہم قومی نمایاں نظر آنے لگی۔ ایشیاے کوچک کے یونانی باشندوں کو اس بات کا پہلے سے احساس تھا اور وہ اتحادِ قومی کے جو معنی سمجھتے تھے وہ اٹی کا یا بیوشیہ والوں کے خیال میں بھی نہ گزرے تھے کیونکہ یونان خاص کے یہ بسنے والے اپنے ہر طرف یونانی ہی یونانی دیکھتے اور زیادہ تر انہی میں امتیاز و تفریق کرتے تھے ؛

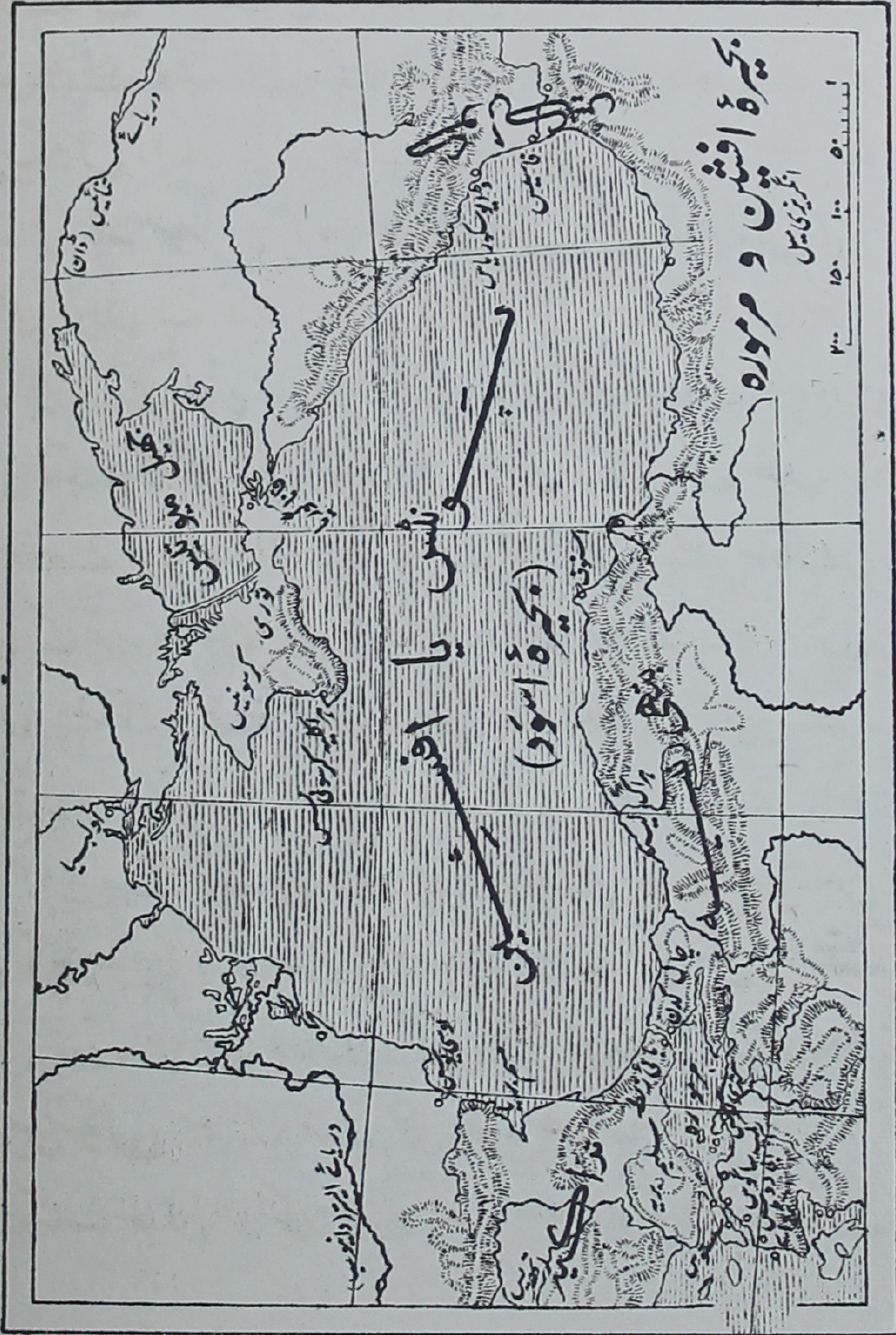
دوسری نوآبادیوں کی بدولت مختلف شہروں کے یونانیوں کو آپس میں ملنے کا موقع ملا۔ جب کوئی ہادی یعنی بانی شہر آباد کاروں کی جماعت تیار کرتا تو اکثر اُسے اپنے شہر میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی نہ ملتی تھی جو خوشی سے باہر جانے پر آمادہ ہو جائیں۔ لہٰذا وہ دوسرے شہروں سے ساتھ والوں کی بھرتی کرتا اور اس طرح بہت سی نو آبادیاں مشترکہ سعی سے قائم اور مختلف اقوام یا شہروں کے باشندوں سے مرکب ہوتی تھیں +

۲۔ سواحلِ افشین، اور شمالی ایجین کی نوآبادیاں

اوّل اوّل جو یونانی شہر بحیرۂ افشین کے کناروں پر آباد ہوئے اُن کی ابتدا کا حال پردۂ خفا میں مستور ہے۔ اس طرف رہنمائی شہر ملطہ نے کی تھی، اور ممکن ہے کہ وہیں کے سوداگروں نے جو ملیسیائی بھیڑوں کی اونی مصنوعات لاتے تھے، جنوبی ساحل پر تجارتی مستقر بنائے ہوں۔ لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ قبل ازیں کہ اہلِ مگارا نے اپنی مردانہ مساعی سے آبنائے باسفورس کو محفوظ کرلیا ہو باسفورس کے پار آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا؟ مگارا ہی نے ساتویں صدی کے شروع میں (۶۶۰ء ق م) چالکدُن اور بای زنطہ بسانے کے لئے اپنے آدمی بھیجے اور تاریخ میں اس چھوٹی سی ریاست کا نام اسی ضمن میں ہمارے سامنے آتا ہے اور سواحلِ باسفورس کو اس طرح آباد کرنا حقیقت میں ایک

ایسا کام تھا کہ اُن عظیم و جلیل نتائج و واقعات کے اعتبار سے جو آئندہ یہاں کی نوآبادیوں میں رونما ہوئے، مگارا کے کسی ہمعصر کو اتنا بڑا کام کرنا نصیب نہیں ہوا۔ پھر بآئی زنطہ کے مغرب میں بحیرۂ مرمورہ پر **سلیم بریہ** اور مشرق کی جانب بحیرۂ اسود کے کنارے **ہراکلیہ** کی نوآبادیاں بھی یہیں کے باشندوں نے بسائیں۔

۵۳



مگارا کی ان اولوالعزمیوں نے شہر ملطہ کو جوش دلایا۔ جنوبی ساحلِ اسود کی سب سے بالائی حد پر جہاں کنارہ خم کھا کر راس کی صورت میں آگے نکل آیا ہے، دو قدرتی بندرگاہیں بن گئی ہیں۔ آباد کاروں کے واسطے یہ نہایت موزوں مقام تھا اور یہیں اہل ملطہ نے شہر **اسنوف** کی بنیاد ڈالی۔ اس کے مشرق میں اور آگے بڑھکر ان کی دوسری نوآبادی **ترابزوس** (طرابزون یا طرابزندہ) قائم ہوئی۔ آبنائے باسفورس پر اہل مگارا نے پہلے ہی کوئی گنجائش نہ چھوڑی تھی لیکن ملطہ والوں نے اس کی تلافی **آبیڈوس** بساکر کی جو آبنائے دردانیال کے سرے پر **سستوس** کے بالمقابل آباد ہوا۔ اس کے علاوہ بحیرۂ مرمورہ کے جنوبی ساحل کی اُس راس پر بھی انہوں نے تصرّف کرلیا، جو سمندر میں آگے کی طرف جھکی ہوئی ہے اور جس کی پتلی گردن پر **اسنوف** کی طرح دو قدرتی بندرگاہیں بن گئی ہیں اس نوآبادی کا نام **کی زی کوس** تھا اور وہاں کے سکّوں پر مچھلی کی صورت کندہ ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کی خاص جنسِ تجارت کیا تھی۔ اس کے قریب زمانے میں آبنائے دردانیال کے سرے پر **لمپسکوس** کو جہاں پہلے اہل فنیقیہ کا تجارتی کارخانہ تھا، ایک اور آیونیانی شہر، **فوکیہ** نے آباد کیا +

افشین کے زیادہ بعید حصّے یعنی **کولکیس** کی سرزمینِ افسانہ وقصص میں **دیوسکوریاس** اور **فاسیس** کی نوآبادیاں بسائی گئیں اور **توری کرسونسوس** یا "جزیرہ نما" (یعنی موجودہ کریمیہ) میں **پنتی کاپیہ** اور جانب مغرب **ہرا کلیہ** یا **کرسونسوس** نام کے شہروں کی بنیاد پڑی +

آبنائے دردانیال کی مشرقی سمت، عالمِ یونانی کی حدود وسیع کرنے میں

اگر مگارا اور ملطہ پیش پیش تھے تو ایجین کے شمال مغربی ممالک، یوبیہ کا خاص میدان ہیں۔ اسی کے شہر چالکیس نے اُس سہ شاخہ جزیرہ نما پر جو رودِ اکسیوس وسترمین کے درمیان ساحلِ مقدونیہ سے آگے کو نکلا ہوا ہے، متعدد شہروں کی بنیاد رکھی اور یہ تمام جزیرہ نما کالسی ڈیس کہلانے لگا۔ گو یہاں کے بعض مشہور شہر دوسری ریاستوں نے آباد کئے تھے خاص کر پتی دیہ، جسے اہل کورنتھ نے جزیرہ نما کی سب سے مغربی شاخ، پالینی، پر بسایا تھا۔ جزیرہ نما کی وسطی شاخ ستھونیہ اور مشرقی شاخ جس کے سرے پر کوہ آتھوس واقع ہے، آکتی کے نام سے موسوم تھی۔ پالنی پر بعض بستیاں ارت ریہ والوں نے بسائی تھیں اور اسی کے ایک باجگزار شہر ان دروس نے آکتی کا شمالی ساحل آباد کیا تھا۔ یہ سب آبادکار، جزیرہ یوبیہ کے باشندے تھے اور اگرچہ شہر چالکیس یا کالکیس کی تخصیص نہیں کی جا سکتی جس سے یہ تمام علاقہ منسوب کردیا گیا تھا، تاہم اس مجمعٔ بلاد کو یوبیای کہا جاسکتا ہے۔ خلیج تھرمی کے مغربی کنارے پر یعنی مقدونیہ کی سرزمین میں بھی اہل یوبیہ کی دو آبادیاں، پیدنہ اور مِتھون قائم ہوئی تھیں۔

۳۔ مغربی بحیرۂ روم کی نوآبادیاں

یونانی کتابوں میں سب سے پہلے، اُڈیسے کے بعض فقروں میں ممالک صقالیہ و اطالیہ کا ذکر آیا ہے۔ اس نظم کے یہ حصے بعد کے لکھے ہوئے ہیں اور غالباً آٹھویں صدی (ق م) سے انہیں منسوب

کرنا درست ہوگا۔ لیکن ساتویں صدی گزرنے نہ پائی تھی کہ صقالیہ کے مشرقی ساحل اور خلیج تارنتم کے بازو یونانی ریاستوں سے معمور ہو گئے تھے۔ اور یہ نوآبادیاں قدرتی طور پر تین جماعتوں میں منقسم تھیں۔

(۱) یوبیائی۔ جو صقالیہ اور اطالیہ دونوں ملکوں میں تھیں۔

(۲) اکائیائی۔ جو صرف اطالیہ کی سرزمین پر آباد ہوئیں۔

(۳) ڈورئین۔ جو چند مستثنیات کے سوا سب کی سب صقالیہ میں تھیں

ان مغربی سمندروں کی سب سے پہلی سیاحی کا فخر ہراکلیس سے منسوب کیا جاتا تھا جو غروب شمس کے مقام تک پہنچا اور جس نے زمین کے کنارے پر کھڑے ہوکر اوشانوس (یعنی بحیرۂ محیط) کی روانی دیکھی۔ چنانچہ بحیرۂ روم (یا متوسط) کے مغربی سرے (یعنی آبنائے جبل الطارق) کے دونوں طرف جو پہاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں وہ اسی کے نام پر "ہراکلیس کے کھمبے" کہلاتی تھیں۔ اس کے بعد کہا جاتا تھا کہ سب سے قدیم نوآبادی جو مغربی سمندروں میں یونانی ملاحوں نے قایم کی، وہ ساحل کمپانیہ کا شہر کیمہ تھی جس کی بنا روایتوں کی رو سے ۱۰۵۰ ق م سے بھی پہلے پڑی تھی۔ لیکن ہم اگرچہ اس کا زمانۂ آبادکاری آٹھویں صدی کو قرار دیتے ہیں، تاہم یہ روایت کہ وہ اطالیہ میں یونانیوں کی سب سے پہلی نوآبادی تھی، ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ اس کام میں یونان کے تین شہر یعنی چالکیس، ارت ریہ اور کیمہ، جو یوبیہ کے مشرقی ساحل کا شہر تھا، شریک تھے اور انہوں نے مشترکہ کوشش سے ایک نئی سرزمین میں اسے آباد کرکے چھوڑا تھا۔ اس نوآبادی کی جائے وقوع ایک پہاڑی بلندی پر اس موڑ کے قریب تھی جہاں

ساحل نے یک بہ یک چکر کھا کے خلیج نیپلز کی صورت اختیار کرلی ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد راس کے اندرونی بندر پر بھی یونانیوں نے قبضہ کرلیا اور وہاں دکیارکیہ کی بنیاد رکھی جو بعد میں پُتیولی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سے آگے مشرق میں نیپلز یعنی "شہر نو" بھی انہی نے آباد کیا۔

ان علاقوں میں کیمہ ایک گوشے میں اکیلا آباد تھا کیونکہ اِترسکن قوم کے غلبے کی وجہ سے شمال میں تو یونانیوں کے پاؤں نہ جم سکتے تھے اور جنوب میں عرصہ دراز تک، یعنی پوسی دونیہ کے آباد ہونے تک کیمہ کا کوئی حریف و ہم چشم نہ پیدا ہوا تھا۔ پس یونانیوں کی اس نوآبادی کا بلا شور و شغب کے دُور دُور تک اثر پڑتا رہا۔ اسے کوئی ایسی جنگ یا کشمکش نہیں کرنی پڑی جو قابلِ تحریر ہو لیکن اُس نے جو کچھ کیا وہ مغربی تمدن کی تاریخ میں ایک ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یورپ میں جو ابجد آج مروج ہے وہ کہا جا سکتا ہے کہ اسی شہر کیمہ کے یوبیائی آبادکاروں کا عطیہ ہے جن سے لاطینی قوم نے فنِ کتابت سیکھا تھا۔ دوسرے اطالیہ کی ہمسایہ اقوام کو یونانی اصنام و عقائد کا علم بھی انہی اہل کیمہ کے ذریعے پہنچا اور ہراکلیس، اپالو، کاستور اور پولی دیوک وہاں اس قدر زبان زد خاص و عام ہوئے کہ رفتہ رفتہ انہیں اطالیہ ہی کے اصلی دیوتا سمجھا جانے لگا تھا۔ اور کیمہ کی کاہنہ (سبیل) یا اپالو دیوتا کی نبیّہ کے الہامی اقوال پر یہ عقیدہ جم گیا تھا کہ انہی میں روما کا مستقبل مرقوم و مکنون ہے۔

یوبیائی یونانیوں کی دوسری آبادی اطالیہ کی بجائے صقالیہ کی سرزمین

پر بسی - یہ جزیرہ بحیرۂ روم کا دل اور اُس کے مشرقی اور مغربی حصّوں کی حدِ فاصل ہے - اور اس طرح گویا فطرت نے اسے مختلف اقوام کے باہم دو چار ہونے کا مقام بنایا ہے اور یورپ و ایشیا کی اُس کشمکش کی جسے "نزاع دوامی" کہنے لگے ہیں، بعض میدان داریاں اسی صقالیہ کی زمین پر ہو چکی ہیں ۔ عہد تاریخی میں خود اس جزیرے میں کوئی ملکی بادشاہت قائم نہ تھی اور اس کی جس قدر شہرت و عظمت ہے وہ سب ممالکِ غیر کی نو آبادیوں کے طفیل ہے جو تارکانِ وطن نے نہیں بلکہ آباد کاروں نے نصب کی تھیں - اور ان میں یورپ و افریقہ دونوں طرف کے لوگ کھنچ کھنچ کر یہاں آئے تھے کیونکہ صقالیہ ان برّ ہائے اعظم کے بیچ کا جوڑ یا حلقۂ اتصال ہے ۔

جزیرے کے سب سے قدیم باشندے سِکان کہلاتے تھے اور انھی کے نام پر اس کا پُرانا نام سِکانیہ تھا - بعد میں یہاں قوم صِقال کے لوگ آئے اور اس روایت کی تصدیق کہ وہ اطالیہ سے ہجرت کرکے آئے تھے، ہمیں اِس واقعے سے ہوتی ہے کہ اطالیہ کے انتہائے جنوب میں بھی ہم اس قوم کے لوگوں کو آباد پاتے ہیں - سِکان اور صقال یا سکال میں جو مشابہت ہے اُس سے بالطبع یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دونوں قومیں نسل و زبان کے اعتبار سے ہم رشتہ تھیں - لیکن اس قسم کی تجنیسِ لفظی سے ہمیشہ دھوکا ہوتا ہے - اور سِکان و صقال میں یونانی لوگ ہمیشہ امتیاز اور بہ اعتبار قومیت تفریق کرتے تھے! بہر حال، صقالوں نے جزیرے کا مشرقی نصف سِکان باشندوں سے چھین لیا تھا اور اس طرح اُس کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے جن میں سے

مغربی سکانیہ اور مشرقی حصہ صقالیہ کہلاتا تھا۔ اسی عہد قدیم میں سکانیہ پر ایک اور حملہ المیانیوں نے کیا۔ یہ پُر اسرار قوم غالباً ہسپانوی نسل سے تھی اور انہوں نے جزیرے کے شمال مغرب میں تھوڑے سے علاقے پر قبضہ کرلیا تھا اور اس طرح یہ جزیرہ ایک برّاعظم کا مرقع بن گیا تھا۔ اور عنقریب یونانی اور فنیقی سپاہ کی رزم گاہ بننے والا تھا۔ مگر واضح رہے کہ اس میں سب سے کثیر و وقیع جماعت صِقالوں ہی کی تھی۔

جزیرے کے ساحل پر فنیقیہ کے سوداگروں نے بہت عرصہ پہلے سے اپنے کارخانے قائم کرلیئے تھے مگر اوّل اوّل انہوں نے یہاں اس قسم کی مستقل سکونت اختیار نہیں کی تھی کہ جسے اُن کی نو آبادی یا شہر کہا جاسکے۔ حقیقت میں صقالیہ مغربِ اقصیٰ (ہسپانیہ) کے راستے میں جہاں یہ لوگ ترشیش کے طلائی خزانوں پر ہاتھ مارنے جایا کرتے تھے، صرف سستانے کا مقام تھا اور انہوں نے اُسی آبنائے کے بیرونی رخ جو یورپ و افریقیہ کو جُدا کرتی ہے، اپنی سب سے پہلی نوآبادی گادیس (یا قادس) آباد کی تھی۔ اس کے بعد جب انہوں نے صقالیہ کے بالمقابل ساحلِ افریقیہ پر بعض شہر آباد کئے تو اسی ہمسایہ نوآبادی کا جزیرۂ مذکور کے واقعات و معاملات پر حقیقی اثر پڑا۔ خود صقالیہ میں اہل فنیقیہ کی جو مستقل بستیاں آباد ہوئیں اُن کے بانی غالباً ہپیو اور یوتیکہ والے تھے جو قرطاجنہ سے بھی پہلے آباد ہو جزیرے کے مشرقی حصے میں اہل فنیقیہ کے قدم مضبوطی سے نہ جم سکے اور یہاں ہر جگہ وہ محض سوداگروں کے بھیس میں نظر آتے

تھے - اسی لئے جب یونانیوں نے اِدھر کا رُخ کیا اور پوری توجّہ اور دِل سے، صحیح معنی میں شہر آباد کرنے شروع کئے تو فنیقیہ والے کافور ہو گئے ۔

اطالیہ کی طرح صقالیہ کی تاریخ کا آغاز بھی حقیقت میں یونانیوں کی آمد کے وقت سے ہوتا ہے۔ وہ اہل چالکیس کی رہبری اور اپالو دیوتا کی برکت و مساعدت سے یہاں پہنچے اور ان کی پہلی بستیاں قدرتی طور پر مشرقی حصّے میں آباد ہوئیں جو یونان کے رُخ واقع ہوا ہے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ صقالیہ کا یہی مشرقی ساحل اپنی ہیئت و ساخت کے اعتبار سے یونانی ساحل سے بہت کچھ مِلتا جُلتا ہے مگر چالکیس والوں نے اور اُن کے ہمراہی آیونیائی باشندگانِ نکسوس نے جو مقام پسند کیا وہ کچھ بہت دلکش نہ تھا۔ یعنی کوہِ اتنہ کے شمال میں جو قطعۂ زمین بہ صورتِ زبان واقع ہے اِس کو انہوں نے نکسوس کی بنیاد رکھنے کے لئے منتخب کیا (۷۳۵ ق م) اور جس طرح کیمہ کے معاملے میں ہم دیکھ چکے ہیں، اُسی طرح یہاں بھی نوآبادی کے نام رکھنے کا شرف، چالکیس والوں نے اپنے غیر معروف شرکا کے لئے چھوڑ دیا اور چونکہ صقالیہ میں نسل یونانی کا سب سے پہلا مسکن یہ مقام تھا لہٰذا بعد میں بھی اسے ہمیشہ ایک خاص قسم کی فضیلت و تقدس حاصل رہا۔ جس جگہ یونانی سب سے پہلے اُترے تھے وہاں اپالو دیوتا کی قربان گاہ تعمیر کی گئی۔ کیونکہ روایت عام کی بموجب اسی دیوتا کی توجہ سے اُنہیں جو بائی ہواؤں نے ڈھکیل کر سواحلِ صقالیہ تک پہنچایا تھا،

۵۹



بعد میں دستور ہوگیا تھا کہ جو ایلچی یونان سے آتے تھے وہ صقالیہ میں اُترتے ہی اس قربان گاہ پر قربانی چڑھاتے تھے ، اس کے تھوڑے ہی دن بعد ، چالکیس والوں نے جنوب اِتنہ کے شاداب

میدان میں سمندر سے متصل کتانہ اور اندر بڑھکر لیون تینی کی بنیاد رکھی اور یہ دونوں موقعے صقال قوم سے چھینے گئے تھے۔ شمال مشرقی گوشے پر بھی اہل چالکیس نے قبضہ کرلیا تھا اور اس طرح جزیرہ صقالیہ اور اطالیہ کی درمیان کی آبنائے گویا اُن کے تحت میں آگئی تھی۔ یہاں کیمہ اور چالکیس والوں نے ملکر شہر زانکلہ کو ساحل کی ایک لنگر پر آباد کیا جو درانتی سے مشابہ تھی، اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہوگئی (درانتی کو یونانی میں زائیکلو کہتے تھے) اس کے مُڑے ہوے پھلڑے نے لنگر اندازی کی گودی بنادی تھی اور جب بعد میں یہاں سکّہ مسکوک ہونے لگا تو اس میں بھی شہر کی بندرگاہ کو درانتی کی شکل میں دکھایا گیا جس کی گودی میں تیرتی مچھلی کی صورت منقوش تھی۔ آباد ہونے کے سو سال بعد یہاں کی آبادی میں بڑا انقلاب اس وقت پیدا ہوا جب کہ مسّینہ سے مہاجرین کا ایک گروہ آکر اس میں آباد ہوگیا۔ اسی کی وجہ سے آخر میں اس کا پرانا اور مقامی نام بھی اڑگیا اور اسے مسّانا کہنے لگے ؛ زانکلہ ہی سے یوبیہ والوں نے آگے چلکر ہیمرا آباد کیا تھا (۶۴۸ ق م) اور شمالی ساحل پر یونانیوں کی صرف یہی ایک بستی تھی۔ زانکلہ کے حق میں یہ ضروری تھا کہ ساحلِ مقابل یعنی جزیرہ نمائے اطالیہ کا جنوبی سرا بھی موافق اور دوستانہ ہاتھوں میں ہو چنانچہ انہوں نے اپنے وطنِ مادری کے باشندوں کو اُبھار اُبھار کر وہاں رگیون کو آباد کرایا اور اس میں مِسّنیہ والے بھی اُن کے شریک تھے ؛ جس وقت شمال مشرقی صقالیہ میں چالکیس والے یہ بستیاں بسا رہے تھے، جنوب مشرقی

علاقوں میں ڈورئین آباد کاروں نے قدم جمانے شروع کئے۔ اور اُن کی سب سے پہلی بستی ہی سب سے بڑی تھی :۔ یعنی سیراکیوز کو جس کی قسمت میں صقالیہ کے یونانی شہروں کا صدر بننا لکھا تھا، ارکیاس کی رہ نمائی میں کورنتھ کے مہاجرین نے آٹھویں صدی کے خاتمے سے پہلے آباد کیا۔ (۷۳۴ ق م) اسی کے قریبی زمانے میں ان لوگوں نے جزیرہ کرکایرا میں نوآبادی بسائی کیونکہ بحیرۂ آیونیان کے یہی جزیرے گویا مغربی ممالک کی وسطی منزلیں تھیں۔ روایتِ عام نے مذکورہ بالا دونوں مقامات کی آبادی ایک سن میں قرار دی ہے۔ لیکن ان دونوں موقعوں پر اہل کورنتھ کو پہلے آباد کاروں کا قبضہ ہٹانا پڑا تھا اور دونوں جگہ یہ آباد کار یوبیہ کے آئے ہوئے لوگ تھے۔ یعنی کرکایرا میں ارتریہ اور سیراکیوز میں چالکیس والے پہلے سے بسے ہوئے تھے جنہیں کورنتھی آباد کاروں نے آکر نکالا اور بے دخل کردیا۔

محلِ وقوع کے اعتبار سے سیراکیوز کی وسیع بندرگاہ، اُس کی پہاڑی اور ٹاپو، یہ سب صقالیہ کے مشرقی ساحل پر ایسی شئے نہ تھی کہ قدیم آباد کاروں کی توجہ کو سب سے پہلے اپنی جانب مائل نہ کرلیتی چنانچہ چالکیس والوں نے جزیرہ اُرتیجیا (مناؤں کے ٹاپو) پر قبضہ کر رکھا تھا اور عجب نہیں کہ کورنتھ والے انہیں عرصے تک یہاں سے بے دخل نہ کرسکے ہوں۔

شروع میں اہل مگارا کے ملّاحوں نے بھی نئے مسکن کی تلاش میں مغرب کا رُخ کیا تھا۔ اور کئی ناکام کوششوں کے بعد آخر

سیراکیوز کے شمال میں ہبلا کی پہاڑیوں کے قریب شہر مگارا تعمیر کیا تھا جس کے بسانے میں شاید یہاں کے صقالی باشندے بھی اُنکے شریک ہوگئے تھے (۷۲۸ء ق م) لیکن اپنے وطنِ مادری کی طرح اس ہبلائی مگارا کے نصیب میں بھی ایک اور نوآبادی بسانا تھا کہ جو شہرت و ناموری میں خود اُس سے فوق لی گئی۔ یہ بستی جو صقالیہ کے یونانی شہروں کا جانبِ مغرب سب سے آخری مورچہ بنی لبِ ساحل ایک نیچی پہاڑی پر آباد تھی اور خود رو سِلینوں (ایک قسم کی ترکاری) کے نام پر سلینوس کہلاتی تھی (۶۲۸ء ق م)۔ مگر اس اثناء میں صقالیہ کا جنوبِ مشرقی گوشہ ڈوریَن شہروں سے رفتہ رفتہ گلدستہ بن رہا تھا۔ گیلا کو رودس والوں نے جن کے ہم رکاب اہلِ کریت بھی تھے، ساتویں صدی کے آغاز میں بسایا تھا (۶۸۸ء ق م) اور ایک عرصے بعد سیراکیوز نے کمارینا کی بنیاد رکھی تھی (۵۹۵ء ق م) ڈوریَن گروہ کی سب سے آخری نوآبادی مرتبے میں صرف سیراکیوز سے کمتر تھی۔ اسے گیلا والوں نے اپنے شہر اور سلینوس کے بیچ میں آباد کیا تھا اور اس کی بنیاد رکھنے کے واسطے وطنِ مادری سے ایک ہادی کو طلب کیا تھا اور یہی بلند اور جدید شہر، اک رگاس بہت جلد سیراکیوز کا حریفِ مقابل اور یونانی صقالیہ میں دوسرے درجے کا شہر بن گیا تھا۔ ساحلِ سمندر سے متصل ایک بلند پہاڑی پر اس کی تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی لنگر گاہ تنگ اور حقیر، اور قصبے سے کسی قدر فاصلے پر واقع تھی اور "گلہ پرور اک رگاس" کو ایک بحری قوت بننے کا فخر کبھی حاصل نہ ہوا تھا ؛

صقالیہ میں ان شہروں کی بنا رکھتے وقت یونانیوں کو زیادہ تر قوم صقال
سے معاملہ پڑا تھا۔ مغرب میں ذرا اور آگے بڑھکر جو چند بستیاں تھیں انکے
بسانے میں اُن کا قوم سکان سے سابقہ ہوا۔ اور گو یہ دونوں قدیم قومیں
ساحلی علاقوں سے محروم و پسپا ہوگئیں تاہم اندرونِ ملک میں وہ اپنے
پہاڑی قلعوں میں آباد رہیں۔ یہ جزیرہ بھی اس قدر وسیع تھا اور اس کے
اندرونی حصّے سمندر سے اس قدر کافی فاصلے پر تھے کہ نووارد یونانیوں کو
اسے تمام و کمال فتح کرنے کا کبھی شوق نہ ہوا۔ اہل فنیقیہ سے بھی یونانیوں
کو کوئی ایذا نہ پہنچی کیونکہ ان کے تجارتی کارخانے اور معابد مستقل طور
پر صقالیہ میں بنے ہوے نہ تھے پس اُن پردیسیوں کے پہنچتے ہی جو یہاں
مستقل توطّن کا عزم بالجزم کئے ہوئے تھے، وہ ہنگامی کارخانے غائب
ہوگئے۔ البتہ جزیرے کے مغربی گوشے کو جہاں یونانیوں نے بسنے کی
کوشش نہ کی تھی، اہل فنیقیہ نے خیرباد نہ کہا اور تین مقامات پر قابض
رہے جنھوں نے آخر میں مستقل شہروں کی صورت اختیار کرلی یہ شہر
پنورموس، سولوس اور موتیہ تھے۔ الیمانی باشندوں کا علاقہ، پنورموس اور
موتیہ کے درمیان واقع تھا اور صدر مقام سگستا (جو یونانیوں کی زبان پر
اگستا بن گیا تھا) خاص شہر کی حیثیت رکھتا تھا ورنہ اُن کی دوسری
آبادی اریکس جو ذرا دور مغرب میں تھی محض مدافعت کی ایک فوجی چوکی
تھی۔ وہ ساحلِ بحر پر واقع نہ تھی مگر ساحل اُس کے بلند محلِّ وقوع کے
نیچے تھا۔ اس قصبے میں وہ کسی مظہرِ قدرت کو دیوی بناکے پرستش
کیا کرتے تھے جو بہت جلد یونانیوں کی افرودیت دیوی کی شکل
میں جلوہ گر ہونے لگی۔ ان لوگوں کے فنیقہ والوں سے اچھے تعلقات تھے

اور اسی لئے مغربی صقالیہ کا گوشہ اہل فنیقیہ کے تحت میں آگیا تھا
مگر وہ صرف ساحلی علاقے تھے جو اہلِ یونان و فنیقیہ کی رزمگاہ بنے ورنہ
اندرونی حصّوں پر اسی طرح اقوامِ صقال و سکان کا قبضہ باقی تھا ؛

جس نام سے بحیرۂ روم کا وسطی جزیرہ نما موسوم ہے (یعنی اطالیہ)
اُس کی شمالی حدود جولیس سیزر کے زمانے میں بھی دریائے پو تک وسیع
نہ تھیں اور اس سے پہلے، ابتدا ابتدا میں درحقیقت بہت ہی چھوٹے
رقبے پر اُس کا اطلاق ہوتا تھا۔ چنانچہ مورخ توسی ڈاڈیز نے پانچویں
صدی (ق م) میں لفظِ اطالیہ کو صرف اس حصّے کے واسطے استعمال کیا ہے
جو آجکل کلابریہ کہلاتا ہے اور اُن دو شاخوں میں سے ایک (مغربی)
شاخ ہے جن میں یہ جزیرہ نما انتہائے جنوب میں پہنچکر منقسم ہوگیا ہے
اوّل اوّل جب یونانی یہاں آئے تو اس مغربی سرے پر صقال اور
اُنوتری قوم کے لوگ آباد تھے اور غالباً انہی کے ساحل پر پلوپنی سس
کے اکائیانی مہاجرین کو، آٹھویں صدی کے اواخر میں لبنے کا میدان ملا
اُنہوں نے سب سے پہلے جو بستیاں اطالیہ میں لبسائیں (۷۲۱ ق م)
وہ شاید سی باریس اور کروٹن تھیں جن کی دولت اور باہمی رقابت
مشہور تھی۔ شہر سی باریس نے جو کراتیس ندی کے کنارے، بری
آب و ہوا مگر نہایت زرخیز میدان میں آباد تھا، اپنا علاقہ بہت جلد
وسیع کرلیا اور اس تنگ جزیرہ نما سے آگے بڑھکر مغربی ساحل پر،
لاؤس اور اس کی دروس نامی دو شہر آباد کئے اور دو سمندروں پر اپنا
تسلّط قایم کرلیا، بحیرۂ روم کے مغربی ساحل پر پہنچنے کا بڑی راستہ بھی
اُس کے قبضے میں تھا اور اسی راستے وہ اہل ملتسیہ کا، (جنھیں حاسد

اہلِ چالکیس ان سمندروں میں نہ آنے دیتے تھے) قیمتی سامان بحیرۂ ترّنی کے کناروں تک بھیج سکتا تھا۔ یہی وسایلِ رسل و رسایل اور زراعت کی ترقی اہلِ سی بارلیس کی اُس دولتمندی کا سبب تھی جس کے طفیل وہاں والوں کا عیش و نشاط ضرب المثل ہوگیا تھا۔ اسی شہر نے پوسی دونیہ نام کی ایک اور بستی مغربی ساحل پر آباد کی تھی جس کا گلاب اور مندر مشہور تھے ؎

سی بارلیس سے خاصے فاصلے پر جنوب میں شہر کروتن واقع تھا (سنہ قم) سی بارلیس کی طرح اس نے بھی اپنا علاقہ وسیع کیا اور اپنی بستیاں علٰحدہ بسائی تھیں، اور اکائیانی قوم کی سب سے جنوبی نوآبادی کولونیہ بھی، جو مغربی لوکری کے ہمسائے میں تھی، غالباً اسی شہر کے لوگوں نے آباد کی ؎

شہر لوکری کو بھی ہم آسانی سے اکائیانی شہروں میں داخل کرسکتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں قومیں ڈورئین گروہ سے اس قدر نہیں ملتیں جس قدر کہ آپس میں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں؛ اس کے بعد اگر ڈورئین اپنی ایک نوآبادی خلیج کے سب سے شمالی نقطے پر ایک تنگ و محفوظ گودی کے کنارے قائم نہ کردیتے تو جنوبی اطالیہ کی یہ سب بستیاں ایک ہی یونانی گروہ (اکائیانیوں) سے منسوب کی جاسکتی تھیں مگر اس ڈورئین شہر تاراس یا تارنتم نے جس کے نام پر وہ خلیج اب تک خلیج تارنتم کہلاتی ہے، اس یکرنگی کو مٹادیا تھا اور اس اعتبار سے کہ صرف یہی ایک شہر ہے جسے ڈورینوں کے سب سے نامور فرقے نے ایک غیر سرزمین پر بسایا، تارنتم کی وقعت اور زیادہ ہوجاتی ہے (سنہ قم)

اس مقام پر لقونیہ کے آباد کار کسی غیر معلوم زمانے میں قابض ہوئے اور انہی نے اسے ایک ڈورئین شہر بنایا تھا۔ ان کی خوش حالی کا سب سے بڑا سبب تو صنعت وحرفت تھی لیکن زراعت اور زمین کی زرخیزی بھی ایک حد تک اس میں ممد ہوئی۔ یہاں کا بنا ہوا کپڑا اور رنگا ہوا اُون مشہور تھے اور ظروفِ گلی دُور دُور تک دساور جاتے تھے۔ اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شہر تاراس حقیقت میں زرعی ریاست نہ تھا بلکہ اہل صنعت وحرفت کی آبادی بن گیا تھا۔

اس طرح خلیج تارنتم کے مغربی ساحل پر اکائیانی شہروں کی ایک قطار چنی ہوئی تھی، جس کے ایک بازو پر مغربی لوکری تھا اور دوسرے سرے پر ڈورئین تاراس۔ چالکیس اور کورنتھ کے آباد کردہ شہروں میں اور ان اکائیانی آبادیوں میں ایک عام فرق یہ تھا کہ اکائیانی شہروں کی دولت بحری تجارت پر مبنی نہ تھی بلکہ زمین سے تعلق رکھتی تھی۔ وہاں کے خوش حال باشندے زمیندار ہوتے تھے، نہ کہ تاجر اور پہلے بھی اتنی دُور مغرب میں جس چیز کی طمع انہیں اپنے گھروں سے کھینچ کے لائی وہ عمدہ زمینیں تھیں نہ کہ تجارت۔ الغرض بحیرۂ ترّنی کے یہی یونانی شہر اور ان کے ماورائے جبال مقبوضات ہیں جو بعد میں ایک مجموعہ سمجھے جانے لگے اور یہ سارا علاقہ رفتہ رفتہ "یونان کبیر" (میگنا گریسیہ) کے نام سے موسوم ہوگیا۔

۴۔ تجارت اور جہاز رانی کا فروغ

ہر چند یونانی نوآبادیاں اپنے مادری شہروں سے کوئی سیاسی تعلق

نہ رکھتی تھیں اور بالکل خود مختار ہوتی تھیں، پھر بھی مختلف ذرائع سے اُنکا اثر اُلٹ کر اپنے وطنِ اصلی پر ضرور پڑتا تھا۔ مشترکہ خاندانی ملکیت کا رواج ہونے کی وجہ سے لوگوں کو پردیس میں جاکر بسنے کی جس طرح ترغیب ہوئی اس کا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ پس قرینہ نہ تھا کہ وہ لوگ جن سے اس رواج کے طفیل گھر چھٹا تھا اپنی نوآبادیوں میں اسی طریقے کو رواج دیتے۔ اور قیاسِ غالب یہی ہے کہ زمین کی ذاتی اور انفرادی ملکیت کا آئین سب سے پہلے نوآبادیوں میں قایم اور منضبط ہوا اور یہ نظیر قائم ہونے کے بعد اُن کے مادری شہر متاثّر ہوئے جہاں اَور قدرتی اسباب بھی مشترکہ خاندان کے رواج کی آہستہ آہستہ بیخ کنی کررہے تھے یعنی اوّل تو سلطنت یا ریاست کی قوّت جس نسبت سے بڑھتی جاتی تھی اسی نسبت سے خاندان کا زور گھٹ رہا تھا، اور بزرگِ خاندان کا وقار و اقتدار غیر محسوس طور پر کمزور ہوتا جاتا تھا۔ دوسرے یہ دستور عام ہوگیا تھا کہ مشترکہ جائداد کا ایک حصّہ کسی خاندانی کے حوالے کردیا جاتا کہ وہ اس کا خود ہی انتظام کرے اور بلا شرکت اس سے متمتّع ہو۔ اور ضرور ہے کہ اس کے مرنے پر بالطبع یہ خیال آتا ہو کہ وہ جائداد انہی شرائط پر متوفی کے بیٹے کو سونپ دی جائے۔ غرض صاف نظر آتا ہے کہ یہ دستور بھی آخر میں ملکیتِ ذاتی کے اصُول کو قائم واستوار کرنے والا تھا؛ پھر یہ کہ غیر منقسم خاندانی جائدادوں کے پہلو بہ پہلو ذاتی املاک پیدا کرنا بھی جائز اور رائج ہوگیا تھا۔ اُس زمانے میں بہت سی لاوارث زمینیں جن میں "درندوں کا گزر" ہوتا تھا، خاص کر پہاڑی ڈھلانوں پر، افتادہ پڑی رہتی تھیں اور جب کوئی مستعد شخص اپنی محنت سے ایسا کوئی

قطعہ کاشت کے لئے صاف کرلیتا تو یہ نئے کھیت اُسی کی ذاتی ملک بن جاتے کیونکہ وہ کسی کے مملوکہ یا مقبوضہ نہ تھے؛ مختصر یہ کہ ان سب اسباب کو مدِ نظر رکھکر ہم اس عام نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ قدیم رواج کا مٹنا اور بڑی بڑی مشترکہ جائدادوں کا ذاتی املاک کی صورت میں تقسیم ہوجانا، کس قدر ناگزیر ہوگیا تھا +

بیوشیہ کا شاعر، ہیسیود، اُس زمانے میں یونان کے دیہات کی جو معاشرت تھی اس کی ایک تصویر ہمارے لئے چھوڑ گیا ہے (دنشہ ق م) وہ خود نواحِ اسکرا کا ایک کسان تھا جہاں اس کا باپ کیمہ سے آکر بسا اور ہلی کن کی ڈھلانوں پر ایک افتادہ زمین کاشت کرنے لگا تھا۔یہی قطعہ اس کے دو بیٹوں، پرسیس اور ہیسیود میں بٹ گیا اور ہیسیود اپنے بھائی کو الزام دیتا ہے کہ اُس نے علاقے کے رُوسا کو رشوت دیکر خود زیادہ حصّہ حاصل کرلیا تھا۔لیکن پرسیس سے نہ اپنے کھیت کیار کا کام اچھی طرح چل سکا نہ اس نے کچھ فلاح پائی۔ اسی پر ہیسیود نے اپنی نظم "کام" لکھی کہ ایسے فضول خرچ کسانوں کو زراعت اور کفایت شعاری کے اصول سکھائے۔ زندگی کے متعلّق شاعر کی رائے کچھ ایسی مایوسانہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے اُس زمانے میں بیوشیہ کی معاشرتی حالت نہایت ردی تھی۔ اور یقیناً اُس کا بڑا سبب اُمرا کا جبر و تشدد ہوگا جنھیں شاعر "نذرانہ خور" شہزادوں کے لقب سے ملقّب کرتا ہے۔ وہ عہد ماضی کو بڑی حسرت اور تاسّف سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عہد زرد نقرہ عصرِ نحاس اور وہ زمانۂ شجاعت، جس میں بڑے بڑے سورما ٹرواے پر جاجا کے لڑے، سب گزر گئے۔ اور اب نوع انسان عصرِ حدید میں

ہے اور شبانہ روز کی مصیبت و پریشانی سے کبھی نجات نہ پائیگی"۔ نظم میں کسانوں کے مقررہ کام، تخم پاشی اور درو کے اوقات اور موسم، آلاتِ زراعت، کھیتی میں محنت مشقت وغیرہ سب باتوں کے متعلق بہت تفصیلی ہدایتیں دی گئی ہیں اور دانائی کی ضرب الامثال اور کہاوتیں اُن کے ساتھ ہیں؛ اس اعتبار سے کہ **ہسیود** عوام الناس کے خیالات کا پہلا ترجمان ہے، اس کی نظم بھی خاص وقعت رکھتی ہے۔ برّاعظم یورپ کی تاریخ میں سب سے پہلے اسی نے مشقت کرنے والے گروہ سے نکلکر اپنی آواز بلند کی اور اُن کی حالت پر انسان کی توجہ منعطف کرانی چاہی ہے اگرچہ اس میں کلام نہیں کہ یہ ایک مسکین مطیع اور محکوم کی آواز ہے جو اپنے محنت کش بھائیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ بری بھلی جیسی کچھ بھی حالت ہے اسی کو اچھی طرح گزاردیں۔ گویا ابھی تک بغاوت و سرکشی کی منزل نہیں آئی ہے، تاہم حرف شکایت زبان تک آگیا ہے اور اُمرا کو جابجا تاکید کی گئی ہے کہ وہ عدل و انصاف سے کام لیں کہ ملک سرسبز اور خوش حال ہو*

بیوشیہ ہمیشہ سے کم ہمّت کاشت کاروں کا ملک تھا چنانچہ ہسیود کو بھی تجارت یا سیر و سیاحت سے رغبت نہیں ہے لیکن اِس زمانے میں جو فروغ تجارت کو حاصل ہوا وہ تاریخ میں نہایت وقیع شے ہے اور اس معاملے میں بھی اپنے شہروں پر بیرونی نوآبادیوں کا اثر پڑا تھا۔ عالمِ یونانی کی حدود پھیلاکر انھوں نے یونانی تجارت کی راہیں کشادہ کردی تھیں اور صنعت و حرفت کی ترقّی کو بڑی مدد دی تھی۔ اب تک یونانی قوم محض گلّہ بانوں اور کسانوں

کی قوم تھی لیکن اب ان میں اہلِ حرفہ کا گروہ پیدا ہوتا جاتا تھا۔
انہیں اپنی مغربی نوآبادیوں کو تیل اور اُون، ظروف و معدنیات کی
بہم رسانی کرنی پڑتی تھی اور اسی لئے اب ان کا فینقی تاجر سے شدّد
کے ساتھ مقابلہ شروع ہوگیا تھا۔

عام طور پر یونانی اسبابِ تجارت بحری راستوں سے آتا جاتا تھا
اور یونان میں سڑکیں بنانے سے جو غفلت برتی جاتی تھی وہ بھی اسی
کا ثبوت ہے۔ چنانچہ کسی درگاہ یا مندروں کے "مقدس راستوں"
کے سوائے جیسے کہ ایتھنز سے دلفی یا الیوسیس تک یا ساحل سے
اولمپیہ تک بنے ہوئے تھے، ملک میں کوئی پختہ سڑک نہ تھی۔ بایں ہمہ
یونانی لوگ ابھی تک جہازرانی میں بودے تھے اور اواخر سرما سے پہلے
ان سمندروں میں بھی جاتے ڈرتے تھے جن کا چپّہ چپّہ اُن کا دیکھا
ہوا تھا۔ سمندر سے عام خوف کا اظہار ہسیود کے اس قول سے
ہوتا ہے:۔ "انقلاب شمسی سے فصل کے ختم تک جہازرانی کے پچاس
دن ہیں۔ اس موسم میں اگر تم گئے تو جہاز نہ ٹوٹے گا نہ سمندر تمہارے
ملّاحوں کو ڈبوے گا سوائے اس کے کہ پوسیڈن یا زئیس دیوتا ہی
ان کی تباہی کا ارادہ کرلیں!"

جن ریاستوں میں لوگوں کی بحری آمد رفت زیادہ تھی، انہیں بحری
قزّاقوں سے بچنے کی خاطر جنگی جہاز بنانے بھی ضروری معلوم ہوے۔
قدیم جنگی جہاز عام طور پر "پنتی کُن تر" یعنی "پچاس چپّو" کے جہاز
ہوتے جن کا عام نمونہ یہ تھا کہ ایک لمبی اور پتلی کشتی میں پچیس
تختے جڑوئے جاتے تھے اور ہر تختے پر دو تلوار کش یا چپّو چلانے والے

بیٹھ جاتے۔ مگر اس "بچاس چپو" جہاز کا استعمال بھی آٹھویں صدی سے
پہلے شاید ہی یونان میں شروع ہوا ہوگا ورنہ عہد ہومر میں صرف
بیس چپو کی کشتیاں اُن کے ہاں مستعمل تھیں۔ لیکن آٹھویں صدی
کے اخیر حصے میں ایک تازہ جدت نے فنیقیہ کی جہاز سازی میں
انقلاب پیدا کردیا۔ یعنی اب جہازوں کے تختے ایک دوسرے کے
اوپر دوہری قطار میں جڑے جانے لگے جس سے جہاز کی لمبائی بڑھائے
بغیر پتواریوں کے واسطے زیادہ جگہ نکل آئی اور جہاز کی رفتار بھی بڑھگئی
مگر یہ "دو طبقہ" جہاز یونان میں زیادہ عام نہ ہونے پائے کیونکہ تھوڑے
ہی دن بعد فنیقیہ والوں نے اپنے جہازوں میں ایک تیسرا درجہ اُوپر
بڑھاکر انہیں "سہ طبقہ" بنالیا[1] اور یہی سہ طبقہ جہاز جنھیں ۱۷۰ پتواری
کھیتے تھے بالآخر سارے یونان میں اغراضِ جنگ کے واسطے استعمال
ہونے لگے۔ اگرچہ اوّل اوّل جب کورنتھ والے یہ نمونہ یونان میں لائے
تو اُس کے بعد بھی مدت تک بچاس چپو کے جہاز کا عام رواج رہا۔
مگر سہ طبقہ جہاز ہوں یا بچاس چپو، اُس برنجی پھالی یا کُدال سے دونوں
میں کام لیا جاتا تھا جو اسی زمانے میں ایجاد ہوئی اور جہاز کے سرے
یا مُہرے پر لگا دی جاتی تھی۔ یہ حملہ کرنے کا ایک نیا ہتیار تھا جس
نے یونانیوں کی بحری جنگ کے فن اور طریقے پر آیندہ بہت بڑا
اثر ڈالا +

یونانیوں کے نزدیک، دو یونانی طاقتوں کے درمیان سب سے

---

[1] اس قسم کی جنگی کشتی بنانے کا علم دنیا سے مفقود ہوگیا اور زمانہ حال کے جہاز ساز قدیم سہ طبقہ جہاز نہیں تیار کرسکتے۔ حالانکہ زمانہ مابعد کے یونانی پانچ پانچ دس دس بلکہ چالیس طبقے تک کے جہاز بنالیا کرتے تھے +

پہلی اور باقاعدہ بحری جنگ وہ تھی جو ساتویں صدی کے وسط میں کورنتھ اور اُس کی آباد کردہ ریاست کرکایرا میں واقع ہوئی (۶۶۴ء ق م) اگر یہ روایت صحیح ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ یہ واقعہ بھی اسی کشمکش کے سلسلے میں داخل ہے جو اطالیہ، صقالیہ اور سواحلِ اڈریاٹک سے تجارت کے متعلق ہو رہی تھی؛ مگر اس مغربی میدان میں کورنتھ کے سب سے بڑے تجارتی حریف، یوبیہ کے دو شہر چالکیس اور ارت ریہ، تھے؛ مشرقی سمندروں کی آمد رفت میں ایک نمایاں حصّہ جزیرہ اِجینا کی ریاست نے بھی لیا۔ اگرچہ اس کی اپنی کوئی نوآبادی نہ تھی۔ تاہم بحری تجارت کے ذریعے وہ بھی یونان کی سب سے دولتمند ریاستوں میں شمار ہونے لگی تھی

۵۔ سلطنت لِدیہ کا اثر یونانیوں پر

سواحلِ ایشیا کے یونانیوں کی خوش حالی یا بد حالی کا بہت کچھ انحصار اپنے اندرونی علاقے کے ہمسایوں پر تھا۔ ان ممالک سے تجارت اُن کے لئے بہت کچھ باعثِ فلاح تھی، لیکن کسی وقت بھی اگر کوئی ملیچھ[1] سلطنت زور پکڑ جاتی تو انہیں اپنی آزادی اور سلامتی کا سخت خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ بہر حال ساتویں صدی (ق م) کے آغاز میں یونانیوں کی افروجیہ اور لِدیہ (یالود) کی ہمسایہ سلطنتوں میں خوب آمد رفت اور لین دین جاری تھا۔ افروجیہ کے بادشاہ میداس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے دلفی کے مندر میں ایک تخت بھی نذر چڑھایا تھا ؛

---

[1] یونانی لوگ غیر قوموں کو "باربیرئین" کہتے تھے۔ یعنی وحشی جن کی زبان سمجھ میں نہ آتی ہو۔ اس لفظ میں حقارت و نفرت کی بھی شان ہے اور اسی لئے ہم نے اس کا ترجمہ ملیچھ کرنا درست خیال کیا ؛ مترجم۔

لدیہ کے علاقوں میں بھی اہل افروجیہ کی کافی جماعت پہنچ گئی تھی اور اس نے وہاں اقتدار حاصل کرلیا تھا۔ لیکن افروجی حکمرانوں میں انحطاط اور کمزوری پیدا ہوگئی اور گیجیس نامی لدیہ کے ایک باشندے نے شاہ کندولیس کو مارکر سلطنت پر اپنا قبضہ جمالیا تھا اور یہی وہ انقلاب ہے جس کے بعد سلطنت لدیہ میں ایک نیا دور شروع ہوا یعنی گیجیس نے اپنی قلمرو کو شمال میں بحیرۂ مرمورہ تک وسیع کرنے کے بعد ساحلِ ایجین کو اپنی مغربی سرحد بنانے اور یونانی شہروں کو مطیع و منقاد کرنے کا منصوبہ باندھا اور وادئی ہرموس کی طرف سے سمرنا پر، وادئی کیسترَ سے کلوفن پر اور وادئی میاندر کے راستے ملطہ اور میگنشیہ پر دباؤ ڈالا۔ ان میں سے ممکن ہے کہ کلوفن اور شاید میگنشیہ کو اُس نے تسخیر کرلیا ہو لیکن دیگر بلادِ یونانی کے مقابلے میں غنیم کامیاب نہ ہوسکا اور مار کے ہٹادیا گیا۔ منرموس شاعر اسی زمانے کے ایک جنگ آزما کی (جو شاید خود اس کا دادا تھا) بہادری کے گیت گاتا ہے کہ کس طرح ہرموس کے میدان میں اس یونانی شمشیرزن نے لدیہ کے سواروں میں کھلبلی ڈالدی تھی۔

لیکن گیجیس کے ارادوں میں وحشی قوموں کی یورش نے یکایک خلل ڈالدیا یہ وحشی اقوام، یعنی کیمیر واسکیث یا سیتھی اپنے مسکن اصلی سے نکالدی گئی تھیں جو میوتیس جھیل کے قریب تھا (جہاں کریمیہ ابھی تک ان کے نام کی یاد دلاتا ہے) اور بحیرۂ اسود کے جنوبی کناروں پر اُٹھ آئی تھیں جہاں انہوں نے اسنوف کے ملیسی آباد کاروں کو مغلوب کرلیا تھا۔ اسنوف سے نکلکر اب انہوں نے لدیہ پر حملہ کیا اور گیجیس نے مجبوراً اسوربنی بال شاہ اشور (اسیریہ) کی امداد وحمایت چاہی۔ اس طرح پہلے حملے کا تدارک ہوا

اور گیجیس نے حملہ آوروں کے سرداروں کو پابہ زنجیر تینوہ بھیج دیا تھا۔ لیکن کمیریوں نے پھر یورش کی اور اس دفعہ گیجیس مارا گیا اور اس کا پایہ تخت ساردیس مفتوح ہوگیا۔ یہاں سے وحشی فتحمندوں نے یونانی شہروں پر تاخت کی اور گو افی سوس نے اُن کا حملہ روک لیا مگر شہر پناہ کے باہر ارتمیس دیوی کے مندر کو انہوں نے جلادیا اور لب میاندر، شہر میگنشیہ کو بھی تاراج کرڈالا۔ بہرحال یہ بلا ٹل گئی اور گیجیس کے جانشین اردیس نے نہ صرف کمیریوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا بلکہ شاید اپنی قلمرو کو کپادوسیہ میں دریائے ہالیس تک وسیع کرنے میں کامیابی پائی

اسی اثنا میں لدیہ نے وہ ایجاد کی جس نے تجارتی لین دین میں بہت بڑا انقلاب پیدا کردیا۔ اور حقیقت میں اسی لدیہ کے طفیل زر مسکوک یورپ میں رائج ہوا ہے۔ بابل، فنیقیہ اور مصر کے لوگ سونے چاندی کو تول کر بطور زر مبادلہ پہلے سے استعمال کرتے تھے اور ان دونوں دھاتوں کی قیمت میں ایک خاص تناسب معیّن تھا لیکن دھات کا تُلا ہوا ٹکڑا سکّہ اسی وقت بن سکتا ہے جب کے اس پر سلطنت کی مہر ثبت ہو اور اوس کی صحت وزن اور کھرے ہونے کی تصدیق ہوجائے۔ اور یہی کام تھا جسے اول لدیہ میں انجام دیا گیا جہاں سب سے قدیم روپیہ غالباً گیجیس نے ساتویں صدی کے اوائل میں مسکوک کرایا۔ تھوڑے ہی دن بعد اس جدّت کی ملطہ اور ساموس نے تقلید کی اور پھر وہی طریقہ دیگر بلادِ ایشیا میں رائج ہوگیا۔ اس کے بعد اجینا اور یوبیہ کے دو بڑے شہروں نے اپنے ہاں سکّے کا آئین جاری کیا اور رفتہ رفتہ تمام یونانی ریاستوں نے وہ ابتدائی طریقہ کہ مویشی کی راس سے قیمت کا تعیّن کرتے

تھے، ترک کر دیا اور ان میں سے اکثر نے اپنے اپنے دارالضرب علٰحدہ قائم کیے۔ یونان میں سونا بہت کمیاب تھا اور جزائر سیف نوس و تھاسوس کے سوا اور کہیں نہ پایا جاتا تھا، لہٰذا یونانیوں نے چاندی کے سکّے بنائے تھے۔ چونکہ سکّے کی ایجاد خاص اُس زمانے میں ہوئی جب کہ اہل یونان کی تجارتی سرگرمی کا وسیع پیمانے پر آغاز ہونے والا تھا اس لئے وہ نہایت ہی مفید اور اہم ثابت ہوئی کہ ایک طرف تو سکّے سے تجارتی لین دین میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی اور دوسرے اس کی بدولت سرمایہ جمع کرنا ممکن ہوگیا۔

۶۔ مصر سے تجارت کا اجرا اور شہر سیرنہ کی بنا

ملطہ کے تاجر اور اُن کے شرکائے کار اس وجہ سے دولتمند ہوگئے کہ بحیرہ رُوم اور لِدیہ کی تجارت انہی کی وساطت سے ہوتی تھی۔ اور لِدیہ والے یونانی اشیا کو اور آگے ایشیائے کوچک کے اندرونی اور بعید مشرقی حصّوں تک، پہنچا دیتے تھے۔ مغرب میں اور نیز سواحلِ اکشین پر ان کے جہاز دُور دُور تک پہنچتے لیکن اُسی کے بالکل قریب زمانے میں جب کہ سکّے کی ایجاد نے اہل تجارت کے لئے اُمید و ترقی کا ایک نیا میدان کھول دیا تھا، حصول دولت کی بھی ایک نئی راہ ان کے واسطے کشادہ ہوگئی، یعنی ملک مصر کے دروازے جن کی سخت پاسبانی ہوتی تھی، یونانی تجارت کے لئے کُھل گئے۔

ملک مصر کی فتح، اسارہدون، شاہ اشور کا سب سے بڑا کارنامہ تھی (تخمیناً ۶۷۲ ق م)، اسوقت یہ ملک بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں

میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا اور ان کے بادشاہ، اشور کے باج گزار بنکر حکومت کیا کرتے تھے۔ تخمیناً ۶۴۵ قم میں انہی ملوک طوائف میں سے مصر صعید کے ایک بادشاہ بسامتی کوس والی سئیز نے، جو غالباً لدیہ کے دودمانِ شاہی سے تھا، اسوربنی بال شاہِ اشور کے خلاف علمِ سرکشی بلند کیا اور آیونیہ و کاریہ کے اجیر سپاہیوں کی مدد سے سارے ملک پر مسلّط ہوگیا۔ بسامتی کوس اور اس کے وارثوں نے فراعنۂ مصر کی متعصبانہ حکمت عملی کو ترک کیا اور مصر کے دروازے دنیا کی تجارت کے لئے کھول دئے اور یونانیوں کو ملک میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے کی اجازت دی۔

چنانچہ شہر سئیز سے قریب ہی دریاے نیل کی مغربی یا کنوبی شاخ پر ملیسیہ والوں نے تجارتی کوٹھی بنائی اور اسی کے گرد ایک یونانی بستی بس گئی جو نوکراتیس، یعنی ملکۂ بحر کے نام سے موسوم ہوئی۔ اور یہی نوآبادی تھی جو یونانی تاجروں کی مرجع عام بن گئی تھی۔ آبادی میں ملیسیہ، ساموس اور اجینا والوں کے الگ الگ محلّے اور مندر تھے مگر باقی سب یونانیوں کا مشترکہ احاطہ ہلینیون کہلاتا تھا اور اس کے گرد موٹی اینٹ کی دیوار چنی ہوئی تھی اور اندر ۵۰ ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی اسی احاطے میں اُن کی منڈی اور معابد بنے ہوے تھے۔ مگر واضح ہو کہ اہل اجینا کے سواے، نوکراتیس کے تمام یونانی متوطن سواحلِ ایشیا کے رہنے والے تھے۔

ہم اوپر اشارۃً لکھ چکے ہیں کہ نہ صرف تاجروں کے واسطے بلکہ منچلے سپاہیوں کے واسطے بھی ملکِ مصر قسمت آزمائی کا عمدہ میدان تھا۔

بالائی مصر کے شہر ابوسمبل میں اُن یونانی سپاہیوں کی یادگار موجود ہے
جو حبشہ کی ایک مہم میں (۵۹۴ تا ۵۸۹ ق م) شاہ بسامتی کوس
ثانی کے ہمرکاب تھے، ان میں سے بعض نے اپنے نام، مندر کے
دیو ہیکل بتوں پر کھرچ دئے تھے؛ اور اس یادگار کا اتنا حقیر اور اسی
کے ساتھ اتنا قدیم ہونا ہی شاید اس کو زیادہ دلچسپ بنا دیتا ہے ؛

یونانی تجارت کا مصر میں افتتاح ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ
ان کا ایک نیا شہر مصر کے مغرب میں آباد ہوا؛ اصل میں جزیرہ
تھرا میں باہمی نزاع کی وجہ سے کچھ لوگ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے
تھے (۶۳۰ ق م) ان خانہ بربادوں میں کریت کے جانبازوں کا ایک گروہ
اور آکر مل گیا اور انہوں نے سواحل بارکا کی جانب جہازوں کے بادبان
کھول دئے۔ ان کی مستقل آبادی سمندر سے تقریباً آٹھ میل دور، دو
سفید پہاڑیوں پر قائم ہوئی جہاں پانی کا ایک وافر چشمہ موجود تھا اور
جہاں سے گرد کے میدان کی پاسبانی کی جا سکتی تھی۔ شہر کا نام سیرینہ
(یا سایرین)، تھا اور ساحلِ افریقہ پر یہی ایک یونانی نوآبادی تھی جس نے
فلاح و ناموری پائی۔ اہلِ جزیرہ کی جس شخص نے اس نئے مقام تک
رہنمائی کی تھی وہی ان کا بادشاہ بن گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی
نام ارستوتلیس تھا لیکن اب اس نے باتوس کا نرالا لقب اختیار
کیا اور کہتے ہیں کہ لیبیانی زبان میں اس کے معنی "بادشاہ" کے ہیں
مگر یونانی میں اس کے مشابہ لفظ کا مفہوم "ہکلانا" ہے اور اسی بنا
پر یہ افسانہ مشہور ہوا ہے کہ باتوس بولتے میں ہکلایا کرتا تھا ؛
باتوس کے بیٹے کا نام ارکسی لااس تھا۔ اور اس خاندان شاہی میں

یہی دو نام ہیں جن کے مسمّیٰ، ایک دوسرے کے بعد سپیرٹنہ کے تخت پر متمکّن ہوتے رہے۔

۷- یونان میں طبقۂ عوام کی دل برداشتگی

یونانیوں کی تجارتی اور صنعتی ترقی نے، ان کے سیاسی اور تمدّنی ارتقا کے حق میں بہت سے اہم نتائج پیدا کئے، مصنوعات کے واسطے مزدوروں کی ضرورت تھی اور آزاد مزدوروں کی کافی تعداد میسر نہ آتی تھی پس غلاموں سے یہ کام لینا ناگزیر تھا اور وہ کثرت سے تھریس و ایشیائے کوچک اور سواحلِ افشین سے لائے جاتے تھے۔ اس بردہ فروشی میں معقول نفع تھا اور خیوس والوں نے اُسے اپنا خاص پیشہ بنالیا تھا۔ گھر کے معمولی کاروبار میں غلاموں کا ہونا، جیسے کہ ہومر کے زمانے میں ہمیں نظر آتے ہیں اور جو عام طور پر اسیرانِ جنگ ہوتے تھے، ایک بے ضرر دستور تھا جس سے کبھی خطرناک نتائج پیدا نہ ہوتے لیکن ساتویں صدی میں جو باقاعدہ غلاموں کی بھرتی کا طریقہ جاری ہوا اسے یونانی ریاستوں کے حق میں ایک مہلک سببِ زوال ثابت ہونا لکھا تھا۔

افزونیٔ تجارت سے اوّل اوّل حکومتِ شرفا کے اعلیٰ طبقوں نے فائدہ اُٹھایا کیونکہ یہی خاندانی اُمرا سب سے بڑے بیوپاری تھے لیکن تجارت سے جو دولت انہوں نے حاصل کی اسی نے اُن کے سیاسی اقتدار کا ناس کیا۔ کیونکہ اوّل تو اُن کا اثر بہت کچھ اُن کی زرعی املاک پر مبنی تھا اور جب صنعت و حرفت نے زراعت کے

مقابلے میں سر نکالا تو خواہ مخواہ زمین کی قدر و منزلت گھٹ گئی۔ دوسرے یہ کہ دولت کی وجہ سے مراتب کا ایک نیا معیار وجود میں آگیا۔ یعنی امرا کا عام میلان یہ ہونے لگا کہ اپنی امارت کو، نسب کی بجائے دولت پر مبنی کیا جائے۔ اور چونکہ امارتِ نسبی کے برخلاف، اس قسم کی امارت ہر شخص حاصل کرسکتا ہے لہذا یہ تبدیلی قوموں کو ہمیشہ جمہوریت کی طرف لے جاتی ہے +

اوّل اوّل نقصان میں وہ آزاد باشندے رہے جن کے پاس روپیہ نہ تھا۔ اور اسی پریشان حالی اور دِل برداشتگی نے انہیں کابِل مساوات کے لئے جدو جہد پر آمادہ کیا۔ اور اکثر حالتوں میں ان کی جدو جہد بھی کامیاب ہوئی! یونان کے اکثر حصّوں میں ساتویں صدی ق م کے نصف آخر میں سب سے قابِل لحاظ واقعات اسی قسم کی کشمکشیں ہیں جو آبادی کے مختلف طبقوں میں ہو رہی تھیں اور خود امرائے خاندانی میں بہتر اور زیرک افراد کو نظر آنے لگا تھا کہ دیگر اہلِ وطن کو مراعات ملکی میں شریک بنانا ضروری ہے! پھر، صنعت و حرفت کی ترقی اور زراعت کی قدر گھٹنے سے، شہروں کی کشش بڑھ گئی تھی اور اب وہاں ایک نئی شہری آبادی بن رہی تھی جس سے یقینی طور پر جمہوری تحریک کو تقویت پہنچی +

اس پُر آشوب زمانے میں **ارکی لوکوس** پاروسی ایک بڑا طبّاع شاعر ہوا ہے۔ اور یہ قول بالکل بجا ہے کہ معمولی ”گوشت پوست کا“ پہلا یونانی شخص جس کی صورت، قدامت کی دھند میں ہمیں نظر آسکتی ہے، **ارکی لوکوس** ہے! وہ لونڈی کے پیٹ سے ایک امیر

باپ کا بیٹا تھا اور قسمت آزمائی کرنے اُن جانبازوں کے ساتھ ہولیا تھا جو اطالیہ میں شہر سیرلیس بسانے نکلے تھے۔ لیکن جب اسے بحری سفر کا وہ ناگوار تجربہ حاصل ہوا جس نے اُسے پوسیدن دیوتا کی "کڑوی نعمت" کے گیت اور "وطن شیریں" کے لئے جہازیوں کی مناجات گانی سکھائی، تو اُلٹا پھر آیا۔ مگر پھر اہلِ پاروس کے ساتھ جزیرہ تھاسوس آباد کرنے گیا اور وہاں ان فرقہ بندی کے جھگڑوں میں پھنس گیا جن کی بدولت اس جزیرے کے کئی ٹکڑے ہوگئے تھے! نصف النہار میں وہ کسوف شمسی جس کی کیفیت اُس نے بیان کی ہے، اُس نے ضرور تھاسوس کے زمانہ قیام میں مشاہدہ کیا ہوگا۔ اور یہ ۶ر اپریل ۶۴۸ء قبل مسیح کا واقعہ ہے اور تھاسوس میں اُسکے زمانۂ قیام کا پتہ دینے کے علاوہ قدیم تاریخ یونان کے متعلق پہلی یقینی اور ٹھیک تاریخ ہے جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے؛ ارکی لوکوس مدعی ہے کہ وہ "خدائے جنگ کا خادم اور ملکاتِ[1] ربانی کے نفیس عطیات سے بہرہ مند ہے"۔ لیکن ایک موقع پر جب اہل جزیرہ کی ساحلِ مقابل کے تھریس والوں سے جنگ ہوئی تو ہمارا شاعر ڈھال چھوڑ کر میدان سے بھاگ نکلا تھا۔ مگر کہنے لگا "کچھ مضایقہ نہیں۔ مجھے ویسی ہی اچھی دوسری ڈھال دستیاب ہوجائیگی"!

ارکی لوکوس، ذات کا ہیٹا، محتاج و پریشان روزگار اور مصائب کی وجہ سے ایک دِل جلا شاعر تھا جس نے ان جذبات کا اپنی نظموں میں دل کھولکر اظہار کیا ہے اور اپنے دشمنوں کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے۔ چنانچہ انہیں دشمنوں میں ایک لیکامبیس پاروسی ہے جس نے ارکی لوکوس کو اپنی بیٹی نوبولی کے دینے سے انکار کردیا تھا؛

---

[1] میوزز۔ یعنی نغمہ و شعر کی وہبی قوتیں، جن کو قدیم یونان میں دیویاں بنا کے پوجتے تھے؛ مترجم۔

باب سوم

اسپارٹہ کا فروغ۔ شرفا کا زوالِ حکومت

۱۔ اسپارٹہ اور اس کا نظامِ حکومت

ڈورئین نووارد جو شمال سے اُتر کر وادیٔ یوروتاس پر قابض ہوے اس سرزمین میں بہت سے گانوں بنا کے رہنے سہنے لگے تھے اور اُنکا نام لک دِمونی ہوگیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد ان کے درمیان ایک شہری ریاست کو فروغ ہوا اور وہی سب پر مسلّط ہوگئی۔ اس شہر کا نام اسپارٹہ تھا اور علاقۂ لقونیہ میں اس نے وہی ممتاز مرتبہ پالیا تھا جو دورِ گزشتہ میں یہاں امیکلی کو حاصل تھا۔ قوم لک دمونی کی اور بستیاں اب "پری اویکی" یعنی "اہل مضافات" کے نام سے موسوم تھیں۔ اور گو وہ آزاد اور مقامی معاملات میں خود مختار تھیں لیکن ریاستِ اسپارٹہ

ہیں انہیں ملکی حقوق حاصل نہ تھے اور جنگی خدمت اور بادشاہی زمینوں کی کاشت کرنے کا بارِاُن کی گردنوں پر تھا ؛

اہلِ اسپارٹہ کی قدامت پسندی ہمیشہ سے مشہور تھی ۔ اور اسی کا سبب ہے کہ ہم ان کے نظامِ حکومت میں بعض یادگاریں اُس وضع قدیم کی دیکھتے ہیں جو ہومر کے زمانے میں رائج ہو گی ۔ ان میں سب سے زیادہ قابل لحاظ یادگار بادشاہی کا آئین ہے کہ اسپارٹہ میں اب تک ، برائے نام شخصی بادشاہوں کی حکومت باقی تھی؛

اہلِ اسپارٹہ کی طبیعت میں یہ قدامت پسندی اس قدر سمائی ہوئی تھی کہ انہیں بڑا فکر اس بات کا رہتا تھا کہ زمانہ تاریخی میں اُن کے نظامِ حکومت کی جو صورت بن گئی تھی اُسے جس طرح ہو یہی باور کریں کہ بہت زمانے سے وہ ایسا ہی چلا آتا ہے اور اس میں سرِمو کوئی تفاوت نہیں ہوا ہے ؛ حالانکہ اس میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ اکثر دیگر ریاستوں کی مثل ریاستِ اسپارٹہ بھی بادشاہی کے بعد حکومتِ شرفا کی منزل سے گذری تھی اور اس کے نظام حکومت کی آخری صورت شرفا اور جمہور کی کشمکش کا نتیجہ تھی ۔ البتہ یہ خاص بات لائقِ ذکر ہے کہ ان سب تبدیلیوں میں وہاں موروثی بادشاہت سلامت رہی تھی ؛

بہر حال ، اسپارٹہ کی ملکی کل کے چار پرزے تھے :۔ بادشاہ ۔ مجلسِ شرفا مجلسِ عوام اور وہ عمّال جو اِفور کہلاتے تھے ۔ ان میں سے پہلے تین ، قدیم اور تمام نسلِ یونانی کی ریاستوں میں مشترک ہیں ۔ مگر یہ چوتھی جماعت بعد میں شامل ہوئی اور اسپارٹہ سے مخصوص تھی ؛

ہومر کے آخری عہد میں ہم اختیاراتِ شاہی کی حد بندی ہوتے دیکھ چکے ہیں جس کے بعد خود یہ بادشاہی نابود ہوجاتی تھی اگرچہ بعض حالتوں میں، اُس کے آثار شاید ایسے عمّال کی صورت میں، جیسے کہ ایتھنز کے "آرکن بادشاہ" تھے، باقی رہ جاتے تھے۔ البتہ چند مقامات پر بادشاہی کا آئین برقرار تھا اور انہی میں اسپارٹہ شامل ہے۔ مگر یہاں بادشاہی اختیارات کی دو گونہ حد بندی ہوگئی تھی۔ یعنی نہ صرف سلطنت کے دیگر آئین و قوانین کی وجہ سے بلکہ وقتِ واحد میں دو دو بادشاہ ہونے کے سبب سے بھی بادشاہی اختیارات محدود ہوگئے تھے۔ کیونکہ انسان کی یاد میں اسپارٹہ پر ہمیشہ سے دو بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ اور علٰحدہ علٰحدہ ان دو اجَیی اور یوری پنی خاندانوں میں، بادشاہت باپ کے بعد بیٹے کو پہنچ جاتی تھی؛ باقی اُن مذہبی، جنگی اور عدالتی اختیارات میں سے، جو پہلے اُنہیں اور تمام یونانی بادشاہوں کو حاصل تھے، بعض اختیارات شاہانِ اسپارٹہ سے چِھن گئے تھے اور بعض ابھی تک اُن کے پاس تھے۔ مثلاً خاص خاص مذہبی مناصب اُن سے مخصوص تھے۔ شہر کی جانب سے ہر مہینے اپالو دیوتا کے نام پر فوجی مہمّات اور لڑائیوں سے قبل تمام واجب الاحترام قربانیوں کی وہی انجام دہی کرتے تھے۔ گویا وہ بھی قوم کے مذہبی پیشوا ہوتے تھے۔ اگرچہ یہ منصب صرف انہی سے مخصوص نہ رہا تھا۔

ان بادشاہوں کا ایک حق، فوجوں کی سپہ سالاری کرنا تھا۔ اس بات کی تحریری شہادت موجود ہے کہ اوّل اوّل انہیں جس ملک سے چاہیں جنگ کرنے کا اختیار حاصل تھا اور اگرچہ زمانۂ تاریخی

میں جنگ وصلح کا فیصلہ بادشاہوں کی بجائے جمہور کرنے لگے تھے۔ تاہم میدانِ جنگ میں اُنہیں کا راج تھا اور لوگوں کی مرگ وزیست بالکل ان کے اختیار میں ہوتی اور سو آدمیوں کی ایک فوج خاصہ ان کے پاس رہتی تھی؛ مگر یہ ظاہر ہے کہ اسپارٹہ میں بوقتِ واحد دو بادشاہوں کا آئین کسی نہ کسی حد تک اُن کے ہمہ گیر اختیارات کو ضرور محدود و منقسم کردیتا ہوگا۔ پھر پانچویں صدی ق م سے کچھ ہی پہلے یہ بات قانوناً طے کردی گئی تھی کہ زمانہ جنگ میں صرف ایک بادشاہ جسے ہر موقع پر جمہور ہی منتخب کریں اسپہ سالار کے فرائض انجام دے اور وہی قوم کے سامنے انتظامات جنگ کا ذمہ دار و جواب دہ ہو۔

اس طرح گو بادشاہ ابھی تک دین کے مقتدا اور فوج کے سپہ سالار تھے، لیکن مقدمات کے فیصل کرنے کا منصب اب بمشکل اُن سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ صرف خاص خاص معاملات میں انہیں عدالتی یا قانونی اختیارات حاصل تھے، ورنہ عہد ہومر کے بادشاہ اگامِمنن کی مثل، احکامِ ناطق صادر کرنے کا حق ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا بادشاہوں کی اراضی جس سے وہ مالگزاری وصول کرتے تھے، پری اوئیکی لوگوں کے سوانے (یا علاقے) میں ہوتی تھیں اس کے علاوہ قوم کی قربانیوں میں بھی ان کا خاص حصّہ مقرر تھا۔ اس قسم کے موقعوں پر وہ (دہومری بادشاہوں کی مثل) صدر پر بٹھائے جاتے اور سب سے پہلے کھانا انہی کے سامنے چُنا جاتا۔ ہر چیز کا انہیں دُہرا حصّہ ملتا اور قربانی کی کھالیں بھی انہی کو دی جاتی تھیں۔ ورثے

کے اعتبار سے ، بادشاہی، باپ کے بعد بیٹے کو پہنچتی تھی اور لاولد ہونے کی صورت میں سب سے قریبی رشتہ دارِ نرینہ کو۔ اور بادشاہ کا بیٹا صغیرسن ہوتو بھی ایسا رشتہ دار اُس کا ولی ہوتا تھا +

ہومر کی نظموں میں ہم "بزرگانِ قوم" کا حال پڑھ چکے ہیں کہ وہ مقدمات کے پنچ اور بادشاہ کے مشیر ہوتے تھے۔ انہی کی اسپارٹہ میں ایک باقاعدہ جماعت بن گئی تھی جس میں بادشاہوں سمیت تیس رکن ہوتے تھے۔ بادشاہوں کو بحیثیت بادشاہی رکنیت کا حق حاصل تھا مگر باقی ۲۸ ارکان کے واسطے یہ لازمی شرط تھی کہ اُن کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو۔ گویا "مجلسِ بزرگان" لفظاً و معناً بڑے بوڑھوں کی ایک جماعت ہوتی تھی اور اس کے رکن مرتے دم تک اپنے عہدے پر قائم رہتے تھے۔ اس مجلس کی رکنیت کو "نکوئی کا صلہ" کہا جاتا تھا اور جس کی نسبت جلسۂ عام میں جمہور کی عام آواز اور صدائے احسنت بلند ہو، اسی کو اخلاقی اوصاف میں سب سے فائق مان لیا جاتا تھا؛ یہ مجلس تمام معاملات کو مجلسِ عوام میں پیش ہونے سے پہلے مرتّب کرتی تھی اور ایک مشورہ کار جماعت کی حیثیت سے ، ملکی معاملات میں اس کو بڑا دخل تھا۔ اور جرائم کی تحقیقات میں وہ عدالت کے فرائض بھی انجام دیتی تھی +

لیکن گو ارکان کا انتخاب عوام کرتے تھے ، مگر خود ارکان طبقہ عوام سے نہ ہوتے تھے بلکہ رکنیت کا حق شرفا کو حاصل تھا۔ اور اس طرح اسپارٹہ کے نظام حکومت میں حکومت شرفا کا عنصر موجود تھا۔

البتہ اسپارٹہ کا ہر تیس سالہ شہری "اپلا" یعنی مجلس عوام کا

رکن ہوتا تھا، جس کے اجلاس، ماہانہ ہوا کرتے تھے ؛ بے شبہ زمانۂ قدیم میں یہ اجتماع بادشاہوں کے ایما سے ہوتا ہوگا لیکن تاریخی زمانے میں یہ اختیار افوروں (عمّال) کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا تھا۔ بحث مباحثے کا حق اس مجلس کو ابھی تک حاصل نہ تھا اور وہ صرف بادشاہ یا افوروں کی تجاویز سُن کر باآواز بلند اپنی منشا ظاہر کردیتی تھی اگر اس ہنگامے میں صاف طور پر یہ نہ معلوم ہوا کہ کثرتِ رائے کدھر ہے تو الگ الگ رائیں لے لی جاتی تھیں ؛ گروسیہ (یعنی مجلس بزرگان) افور اور دیگر عمّال کا انتخاب عوام ہی کی رائے سے ہوتا تھا۔ صلح و جنگ اور معاملات خارجہ کا فیصلہ اور منصب بادشاہی کی متنازعہ وراثت کا تصفیہ وہی کرتے تھے۔ اور اس طرح اصولاً دیکھئے تو اسپارٹہ کا نظامِ حکومت جمہوری تھا۔ وہاں کا کوئی فرد، مجلسِ عوام سے خارج نہ تھا، اور جمہور ہی کا منشاء اس مجلس میں قولِ فیصل کا حکم رکھتا تھا۔ ایک قدیم ضابطے میں بھی مرقوم ہے کہ "اختیار و فیصلہ جمہور کا حق ہوگا" مگر اسی کے ساتھ یہی ضابطہ "بزرگوں اور عمّال" کو یہ اختیار تفویض کرتا ہے کہ اگر "جمہور کے کسی فیصلے میں کجی ہو تو (وہ) ساتھ چھوڑ دیں" جس سے جمہور کی وہ ظاہری فضیلت و برتری باقی نہیں رہتی ؛ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک انتظامی حکّام ہی مجلسِ عوام کے باضابطہ منتشر ہونے سے پہلے اقرار و اعلان نہ کریں جمہور کی منشاء قانون کا حکم نہ رکھتی تھی۔ اور اگر بزرگانِ قوم، عوام کی کثرت رائے سے متفق نہ ہوتے تو وہ جلسے کی کارروائی کا اعلان ہی نہ کرتے تھے اور بادشاہ یا افوروں کے باضابطہ جلسے کو ختم کرنے سے پہلے، خود "ساتھ

چھوڑ دیتے ،، جس سے جلسہ منتشر اور اس کی کارروائی کالعدم ہوجاتی تھی
اسپارٹہ کے پانچ افوروں کی جماعت وہاں کے نظام حکومت سے
مخصوص تھی - یہ تحقیق نہیں کہ اس کی ابتدا کب ہوئی اگرچہ لوگوں کا
گمان تھاکہ اس کی بنیاد آٹھویں صدی (ق م) کے نصف اوّل میں
پڑی تاہم افوروں نے جو عظیم سیاسی قوّت حاصل کرلی تھی وہ کسی طرح
ساتویں صدی سے پہلے انہیں نہ مل سکتی تھی - اور یہ قوّت انہیں
ضرور اُس کشمکش کے طفیل ملی ہوگی جس میں ایک طرف خاندانی اُمرا
تھے جو بادشاہوں کے ساتھ ملکر حکومت کرتے تھے اور دوسری طرف
عوام ، جن کا حکومت میں کوئی حصّہ نہ تھا - اس نزاع میں بادشاہ
شرفا کے طرف دار تھے اور افوروں نے عوام کی وکالت کی تھی - اس
کی شہادت اُن معاہدوں سے ملتی ہے جن کی ہر مہینے بادشاہ اور
افوروں کے درمیان تجدید ہوتی رہتی تھی - یعنی بادشاہ قسم کھاتا تھاکہ
فرائضِ شاہی کی انجام دہی میں وہ قوانینِ سلطنت کا پابند رہیگا - اور
افور قسم کھاتے کہ جب تک بادشاہ اپنے قول کا پابند ہے وہ
بادشاہی قوّت و اختیارات میں کوئی کمی نہ آنے دینگے - اسی رسم کی
تہ میں ہمیں سلطنت اور جمہور کی ایک شدید نزاع کا نشان ملتا ہے
اور عہدۂ افور کا جمہور سے خاص تعلّق اسی بات سے ظاہر ہے کہ
اس عہدے کے لئے اسپارٹہ کا ہر شہری منتخب ہوسکتا تھا - اور یہ
انتخاب بھی قریب قریب ایک طرح کی قرعہ اندازی ہوتا تھا ؂
افور ، تقویمی سال کے شروع سے اپنے عہدے کا جائزہ لیتے تھے
اور چونکہ انہیں جمہوری حقوق کی نگہبانی کے واسطے مقرر و منتخب

کیا جاتا تھا اس لئے اُن کا بڑا فرض یہ تھا کہ بادشاہوں کے طرزِ عمل
سے ہوشیار رہیں۔ اس غرض کے لئے جنگی مہمات میں ہمیشہ دو افور
بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے اور اس بات کے مجاز تھے کہ بادشاہ
سے باز پرس کرنے کے لئے اسے اپنے سامنے طلب کریں؛ اُن
عدالتی اختیارات میں بھی، جو بادشاہوں سے لے لیے گئے تھے، بعض
افوروں کے ہاتھ میں چلے گئے اور بعض مجلسِ بزرگان کو منتقل ہو گئے
تھے۔ لیکن مجلس، جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں صرف فوجداری مقدمات
کی تحقیقات کرسکتی تھی ورنہ دیوانی کی عدالتِ عالیہ افوروں کی جماعت
تھی اور پری اوئیکی لوگوں کے معاملات میں فوجداری مقدمات کی بھی وہی
سماعت کرتے تھے۔ افوروں کا ایک اور فرض یہ تھا کہ ریاست
اسپارٹہ میں نظم اور ضوابط و شعائر کو قائم رکھیں اور اپنے عہدہ کا کام
ہاتھ میں لیتے ہی وہ اہل شہر کے نام ایک اعلان جاری کرتے تھے
کہ وہ سب "اوپر کی لبیں مُنڈوائیں اور قوانین کے پابند رہیں"

۲۔ اسپارٹہ کا تسلّط مسینیہ پر

مسینیہ کی فتح، اسپارٹہ کے عہدِ فروغ کی پہلی اور سب سے اہم منزل
تھی۔ واضح ہو کہ جزیرہ نمائے پلوپنی سس کے جنوبی حصے کو کوہ تے گتوس
نے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اس میں سے مشرقی حصّے کے
بھی کوہِ پارنُن کے بیچ میں آجانے سے دو قطعے ہوگئے ہیں، یعنی
یوروتاس ندی کی وادی اور دوسرے پارنُن سے لیکر ساحل تک
کا سنگستانی قطعہ۔ لیکن کوہ تے گتوس کا مغربی حصّہ نسبتاً زیادہ

زرخیز ہے اور اس کی زمین بھی اس قدر سنگستانی نہیں اور قدرت نے آب و ہوا بھی اُسے زیادہ معتدل عنایت کی ہے - ای تھومہ کی بلند چٹان اسی حصّے کا قدرتی قلعہ تھی ⁛

اسپارٹہ کی میسنیہ سے پہلی جنگ کے متعلق، جس کا زمانہ آٹھویں صدی (ق م) کو قرار دینا پڑیگا، ہمیں کوئی یقینی بات معلوم نہیں ہے بجز اس کے کہ اسپارٹہ کے اُس بادشاہ کا جس کے ماتحت یہ جنگ ہوئی نام تھیوپمپوس تھا - نیز یہ کہ ای تھومہ کے قلعے کی تسخیر نے اس جنگ کا فیصلہ کردیا اور مشرقی علاقہ اہلِ اسپارٹہ کے قبضے میں آگیا تھا ⁛

چونکہ اسپارٹہ والوں کا مقصد یہ تھا کہ اپنے ہم وطنوں کے واسطے اور قطعاتِ زمین بڑھالیں اس لئے انہوں نے اکثر مفتوحین کو ہیلوٹ (ہیلواٹ) یعنی رعیت یا غلام بنالیا اور کئی نسل تک وہ بھی اس ذلّت کو خاموشی کے ساتھ برداشت کئے گئے - لیکن اُس وقت جب کہ فتحمند اس طرف سے مطمئن ہوگئے تھے، وہاں بغاوت کی سازش ہوئی - (اخیر ساتویں صدی ق م) باغیوں کو ارکیدیہ اور پساتیس کی ہمسایہ ریاستوں سے مدد ملی اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا سردار بھی ارسٹومنیس جیسا قابل و پرجوش اور میسنیہ کے ایک قدیم خاندان کا آدمی تھا - اوّل اوّل یہ بغاوت کامیاب ہوئی اسپارٹہ والوں پر بُری بنی اور اُن کے جوانوں کو شکست کا داغ کھانا پڑا - مفتوحین کے حوصلے بڑھ گئے اور اسپارٹہ کو اس علاقے کے واپس ملنے سے مایوسی ہوگئی - لیکن اس حال میں اُن کی سرداری کے لئے ایک عجیب

اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور منقول ہے کہ اسی لنگڑے تیرتیوس نے اپنے ہموطنوں میں وہ جنگی جوش بھرا کہ لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور اسپارٹہ اپنے نقصانات اور ذلّت کی تلافی کرنے لگا۔ شہنائی کی آواز پر اس شاعر کے "بڑھو بڑھو" کے گیت گاتے ہوئے اسپارٹہ کے شمشیرزن میدان جنگ میں نکلتے تھے اور جب شام ہوتی تو کھانے کے بعد اسی کے پرجوش مرثیے پڑاو میں بیٹھ کر گائے جاتے تھے۔ لیکن خود اس کا بیان ہے کہ اس کی جنگی تدبیر اُس کی شاعری سے کم کارگر نہ تھی اور تھوڑے ہی دن بعد اہل مِسینیہ کو بڑی کھائی کی جنگ میں شکست ہوئی اور وہ نیدَن ندی کے کنارے اپنے شمالی قلعے ایرا میں ہٹ آے، جسے مِسینیہ کی دوسری جنگ میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو پہلی جنگ میں ایتھومہ کو تھا، افسانوں میں بیان کیا گیا ہے کہ آخر یہ قلعہ بھی گیارہ سال کے محاصرے کے بعد، تسخیر ہوگیا۔ محصورین کی روح رواں ارستومنیس تھا اور اسی کا عجیب عجیب طور سے بچ بچ کر نکلنا ایک ولولہ انگیز داستان کا موضوع ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اپنے پچاس اسیر ہموطنوں کے ساتھ وہ بھی ایک گہرے غار میں پھینک دیا گیا تھا؛ اور زندگی سے بالکل مایوس ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی سب ہلاک ہوگئے لیکن ارستومنیس کو ایک لومڑی کے کھوج پر چلتے چلتے آخر کار اس پہاڑی قید خانے کا ایک راستہ مل گیا اور وہ دوسرے ہی دن ایرا آپہنچا۔ پھر اسپارٹہ والوں نے جب اچانک ہلّہ کر کے اس قلعے کو فتح کیا تو اس وقت بھی ارستومنیس زخم کھا کے اُن کے ہاتھ سے نکل گیا اور ارکیدیہ پہنچ گیا *

ملک میں جو مینوی باشندے باقی رہ گئے تھے وہ پھر غلام بنا لئے گئے۔ لیکن ساحلی بستیاں اور نیز دو چار اندرونی علاقے والے اب بھی پری اوئکی بنکر آزاد اور اپنی زمینوں پر قابض رہے ۔



اس زمانے میں یونان کی دوسری ریاستوں کی طرح اسپارٹہ بھی اندرونی خلفشار میں مبتلا ہوا۔ مگر مسینیہ کا پورا علاقہ فتح ہونے سے تقسیم اراضی کا مسئلہ ایک حد تک حل ہوگیا تھا دوسرے کوئی شبہ نہیں کہ یہی زاید آبادی کی سہولتِ معاش کے واسطے اس زمانے میں شہر تاراس (جنوبی اطالیہ) کی بنیاد رکھی گئی تھی ؛

جنگ مسنیہ کا جو حال تیرتیوس نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقِ جنگ میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی جس نے اسی وقت سے طبقہ اعلیٰ کے اثر و اقتدار کو مٹادیا تھا۔ کیونکہ یہ لڑائی زرہ پوش، اور پیادہ نیزہ برداروں نے جیتی تھی جو گنجان صفیں باندھ کر بڑھتے اور فریق مقابل پر ملکر حملہ کرتے تھے۔ یونانیوں کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ ایسے پیادے جنھیں وہ ''ہپ لیت'' کہتے تھے، سوار فوج سے بہتر اور زیادہ کارآمد ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی اصلی قدر سب سے اوّل اسپارٹہ میں پہچانی گئی اور وہیں کی فوجی ترتیب میں انہیں جزوِ اعظم بنایا گیا تھا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب شہر کا لڑائی کے وقت اُمرا پر انحصار نہ رہا بلکہ تمام باشندوں پر ہوگیا۔ یاد رکھنا چاہئیے کہ فن حرب میں یہ انقلاب صرف اسی وقت ممکن ہوا جبکہ عام صنعی ترقّی کے ساتھ ساتھ یونان میں دھات کی چیزیں بھی اچھی تیار ہونے لگیں [1]، اور اب ہر خوش حال شہری کے لئے گویا راہ نکل آئی کہ چاہے تو سر سے پاؤں تک زرہ بکتر پہن کر میدان جنگ میں جائے [2]۔ پس یہ تبدیلی عین مساوات وجمہوریت پیدا کرنیوالی

[1] چنانچہ دھات کا چار آئینہ، زانوبند اور پابکتر استعمال کیا جاتا تھا۔ اور زمانہ شجاعت کی بدقطع ڈھال کی بجائے جو پہلے شانے پر لٹکائی جاتی تھی، اب ہاتھ کی گول سپر مروج ہوگئی تھی۔

تھی کیونکہ اُس نے اُمرا اور معمولی شہریوں کو میدان جنگ میں بالکل ہمرتبہ بنادیا تھا ؛

۳-اسپارٹہ اور اس کے آئین و قوانین کا ارتقاء

جس وقت اسپارٹہ پوری طرح تاریخ کی روشنی میں آتا ہے تو اُس وقت ہم اُسے ایسے سخت قوانین کے ماتحت پاتے ہیں جن کی ہمہ گیری سے آدمی کی زندگی کا کوئی حصّہ بچا ہوا نہیں ہے اور جو پیدائش سے لیکر موت تک اس کے تمام افعال پر حاوی ہیں نیز یہ کہ ہر شئے پر فنِ جنگ مسلّط ہے اور حکومت کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اپنی رعایا کو سرفروش اور جرّار سپاہی بنادے ؛

اسپارٹہ کی کُل آبادی ایک جنگی برادری بن گئی تھی اور وہاں کا ہر شہری خدمتِ قومی کے لئے وقف ہوتا تھا۔ اور اس غرض سے کہ یہ خدمت وہ خاطر خواہ انجام دے سکے، ضرورت تھی کہ وہ اپنی اور اہل و عیال کی معاش کی طرف سے بے فکر ہو۔ امرا کے پاس اپنی اپنی خاندانی جائدادیں ہوتی تھیں۔ لیکن اسپارٹہ کی آبادی شاملات کی زمین پر قابض تھی جس کے بہت سے قطعات کردئے گئے تھے اور ہر شہری ایک قطعے کا مالک ہوتا جو باپ سے بیٹے کو ترکے میں پہنچ جاتا لیکن اس کی بیع یا تقسیم نہ ہوسکتی تھی اس طرح کسی شہری کے تنگدست ہونے کا کوئی احتمال نہ تھا کیونکہ وہ ایک قطعۂ زمین کا ضرور مالک ہوتا تھا۔ ملک کے اصلی باشندے جنھیں لکدِمونی قوم نے بے دخل اور اپنی غلام رعیت بنادیا تھا،

اب ان فتحمند مالکوں کے لئے زمین کاشت کرتے تھے اور مالکِ زمین کا حق تھا کہ وہ اپنے کاشتکار سے ستر مِدِمنی[1] گیہوں اپنے واسطے اور بارہ مدِمنی اپنی بیوی کے واسطے، اور شراب و فواکہ کی ایک مقررہ مقدار سالانہ وصول کرلے۔ اس کے سوا زمین میں جو کچھ پیداوار ہو وہ ہلوت (ہیلوٹ)، یعنی بونے والی رعیت کا مال تھی؛ اگرچہ ہلوتوں سے قیدیوں کی طرح ہر وقت سر پر کھڑے رہ کر کام نہ لیا جاتا تھا۔ بلکہ انہیں ذاتی املاک پیدا کرلینے کی آزادی تھی بایں ہمہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی حالت بہت خراب تھی۔ کم سے کم وہ نہایت بیزار و تنگدل ضرور تھے اور موقع ملنے پر، بغاوت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے؛ لوگوں کو اس طرح رعیّت بنا کے رکھنے کا طریقہ اوّل ہی سے مخدوش تھا لیکن مسنیہ کی فتح کے بعد سے وہ اور بھی خطرناک بن گیا تھا اور اسپارٹہ کے لوگ جو برابر جنگی تیاریوں میں مصروف رہتے تھے اس کی بھی وجہ ایک حد تک انہی لوگوں کا خطرہ تھا جنھیں وہ مارِ آستین سمجھتے تھے۔ اسی خطرے کے تدارک کی غرض سے "کرپ تیہ" یا خفیہ پاسبانوں کی جماعت (اگرچہ اس کے قیام کا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں) قایم کی گئی تھی۔ جس میں اسپارٹہ کے نوجوان شہری داخل ہوتے تھے اور انہیں یہ اختیار دے کر دیہات میں بھیجدیا جاتا تھا کہ جو، ہلوت انہیں مشتبہ معلوم ہو اُسے قتل کرڈالیں۔ اس تدبیر سے یہ نوجوان بغیر وسواس و بلا خوفِ گناہ مخدوش ہلوتوں کی جان لے سکتے تھے؛ لیکن ان ساری احتیاطوں کے باوجود

---

[1] ایک قدیم یونانی وزن جو ہمارے ایک من سے کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ مترجم

وہاں بار بار خطرناک بلوے اور فساد ہوا کئے ؛

بہر حال حصولِ معاش کی ضرورت سے اس طرح بے فکر ہوکر اہل اسپارٹہ قوم یا سلطنت کی خدمت کے لئے وقف ہوگئے تھے اور سلطنت کا مقصد یہ تھا کہ لوگ فنِ جنگ میں مہارت تامّہ پیدا کریں۔ چنانچہ شہر اسپارٹہ ایک بہت بڑا جنگی مدرسہ تھا جس میں تعلیم، شادی، اور معاشرت کی تمام جزئیات کے ضابطے بندھے ہوے تھے تاکہ بہتر سے بہتر فوج تیار رکھی جائے۔ شہر کا ہر باشندہ سپاہی ہوتا تھا اور پیدائش کے وقت سے فوجی ضوابط کی پابندی شروع ہوجاتی تھی۔ جب بچّہ پیدا ہوتا تو پہلے بزرگانِ قبیلہ کے روبرو پیش کیا جاتا۔ اور اگر وہ اسے ناتندرست یا کمزور جانچتے تو اُسے کوہِ لٹے گتوس کی سنسان ڈھلانوں پر ڈالدیا جاتا تھا کہ ہلاک ہوجاے۔ سات برس کی عمر کو پہنچتے ہی ہر لڑکا ایک سرکاری افسر کی نگرانی میں دے دیا جاتا تھا اور اس کی تعلیم اوّل سے آخر تک صرف اس مقصد پر مبنی ہوتی تھی کہ وہ مشقتیں جھیلنے کا عادی ہوجائے۔ اُسے نہایت سخت ضوابط کی پابندی سکھائی جاتی اور اس کے دل میں قوم کی محبت جاگزین کردی جاتی تھی؛ لڑکوں کو بیس برس کی عمر تک فوج کے نمونے پر ایک وسیع مدرسے میں قواعدِ جنگ بھی سکھائی جاتی تھی ؛

عمر کے بیس برس پورے کرنے کے بعد اسپارٹہ کا باشندہ فوج میں داخل ہوتا اور اُسے شادی کی اجازت دی جاتی تھی مگر ابھی تک وہ "گرہستی" نہیں ہوسکتا تھا بلکہ اُسے اپنے

ساتھیوں میں مل کر "بارکوں" میں رہنا پڑتا تھا اور اپنی بیوی کے پاس وہ صرف چوری چھپے آسکتا تھا۔ البتہ تیس برس کی عمر میں اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد وہ پورا "آدمی" بن جاتا اور تمام حقوقِ شہری حاصل کرلیتا تھا۔ ایسے شہری اسپارٹہ میں "ہموئیو" یعنی برابر والے، کہلاتے تھے۔ اور ہیاکن توس بازار میں ملکر رہتے اور خیموں میں کھانا کھاتے تھے۔ خیمے کے ہر شریک کو اپنے قطعۂ زمین کی پیداوار سے جَو پنیر، شراب اور انجیر کی ایک مقررہ مقدار ہر مہینے لانی پڑتی تھی۔ اور ہر خیمے کے ہانڈی وال یعنی شرکائے طعام کا میدانِ جنگ میں مشترکہ خیمہ ہوتا تھا۔ بادشاہ کی فوجِ خاصہ کے لئے اسپارٹی نوجوانوں میں سے تین سو "شہ سوار" چن لئے جاتے تھے۔ گو اوّل اوّل جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے، وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے مگر بعد میں وہ بھی پیادہ لڑنے لگے تھے؛ اور نیم مسلّح پیدل فوج کی بھرتی پری اؤیکی اور ہلوتوں سے کی جاتی تھی۔

غرض اسپارٹہ کی بستی ایک فوجی چھاؤنی تھی جس میں ہر شخص کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ پوری مہارت وطاقت کے ساتھ ہر ساعت اپنے شہر کے لئے لڑنے پہ تیار رہے۔ تمام قوانین کی غایت، اور معاشرت کے سارے نظام کا اصلی مدّعا یہی تھا کہ اچھے سپاہی بنائے جائیں۔ اسی لئے گھر میں عیش کرنے کی وہاں سخت ممانعت تھی اور اسپارٹہ کی سادگی ضرب المثل ہوگئی تھی۔ ہر فرد کا وجود، قوم کے وجود میں جذب

ہوگیا تھا۔کسی کی ذاتی یا انفرادی زندگی نہ تھی۔بلکہ کسی کو ایسے ذاتی جھگڑوں کے سمجھنے سلجھانے کی ضرورت ہی نہ تھی جو آدمی کے دم کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اہل غور و فکر یا قیاس دوڑانے والوں کا اسپارٹہ میں کچھ کام نہ تھا وہاں آدمی کا فرضِ واحد اور زندگی کا سب سے بڑا نصب العین یہی تھا کہ قوانینِ شہر کے مطابق عمل کیا جائے؛

ان شدید قیود کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے لوگوں کی اِس قانون پرستی میں فرق آے اور بعض اشد ضوابط کی پابندی نہ کرنے پر باہم چشم پوشی سے کام لیا جانے لگے اور وہ رفتہ رفتہ متروک ہوجائیں؛معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت پہلے سے جایز ہوگیا تھا کہ اپنے اصلی قطعۂ زمین کے علاوہ اگر کوئی شہری چاہے تو اور زمین بھی حاصل کرلے۔ اور چونکہ ایسی زمین مقررہ قطعات کی مثل ناقابلِ انتقال نہ ہوتی تھی بلکہ اُس کی بیع و تقسیم جایز تھی، لہٰذا اُن میں مساواتِ دولت کا ہمیشہ قایم رہنا محال تھا۔چنانچہ وہ "مساواتِ برادرانہ" (کمیونزم) جس کا ہمنے اُوپر ذکر کیا، حقیقت میں سطحی چیز تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سونے چاندی کی صورت میں مال کا جمع کرنا اہل اسپارٹہ کے لئے قانوناً اور بہ تاکید ممنوع قرار دیا گیا تھا لیکن اس کے مواخذے سے بچنے کی بھی لوگ اوّل اوّل یہ تدبیر کرتے کہ وطن سے باہر اپنا روپیہ مندروں میں امانت رکھوادیتے تھے۔ اور ہوتے ہوتے آخر میں یہ قانون محض "درکتاب" رہ گیا تھا۔حتیٰ کہ اسپارٹہ کے

لوگ حرص و طمع کے معاملے میں سارے یونان میں انگشت نما ہو گئے تھے۔

اس میں کچھ کلام نہیں کہ اسپارٹہ کا یہ نظام تربیت درجہ بدرجہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ لیکن اس کی پوری بناوٹ میں ایسا لطیف تناسب اور موزونیت پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی اُسے شخصِ واحد کا نتیجۂ فکر سمجھے تو کچھ تعجب نہیں۔ چنانچہ تھوڑے دن پہلے تک ایسا ہی سمجھا جاتا تھا، بلکہ بعض کا تو اب بھی یہی عقیدہ ہے۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ اسپارٹہ کے تمام سرشتے اور قوانین نویں صدی (ق م) کے آغاز میں **لگرگس** نامی ایک شخص نے بنائے اور جاری کئے تھے۔ لیکن اس نام کے کسی مقنن کا وجود ماننے کے لئے جو دلیلیں دی گئی ہیں۔ وہ بہت ضعیف ہیں۔ **ہیروڈوٹس** کا بیان ہے کہ اسپارٹہ والے **لگرگس** کو اپنے ایک قدیم بادشاہ کا اتالیق یا ولی بتاتے تھے اور دعوی کرتے تھے کہ اُس نے یہ قوانین **کریٹ** سے لاکر اسپارٹہ میں جاری کئے! لیکن اس مورخ کے معاصرین کے (جنھوں نے **لگرگس** کا ذکر ہی چھوڑ دیا ہے) متضاد بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا قول بھی منجملہ اور قیاسات کے، ایک قیاسی بات تھی اور اسے مسلمہ روایت کا درجہ کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔

یہ قیاس قدرتی طور پر یوں پیدا ہُوا کہ جزیرۂ کریٹ میں جو بُعدِ ارضی کی بدولت تاریخِ یونان کے سلسلۂ واقعات سے دُور ہٹا ہوا تھا ڈورئین نسل کے لوگ آباد تھے اور اُن میں بھی

بہت کچھ اسی قسم کے قوانین و نظام معاشرت کا رواج تھا۔ یعنی اُن کی آبادی میں بھی ایک گروہ سپاہیوں کا تھا اور ایک رعیت یا نیم غلام کسانوں کا۔ اسپارٹہ کے افوروں کی مثل وہاں دس عمّال (کوسؔ موی) کی جماعت ہر سال منتخب ہوتی تھی اور گروسیہ کی طرح ایک مجلسِ بزرگان بھی موجود تھی۔ لیکن یہاں بادشاہ کوئی نہ تھا اور ارکانِ مجلس یا عمّال صرف خاندانی اُمرا ہو سکتے تھے۔ مگر اسپارٹہ سے بڑی مماثلت، لڑکوں کی فوجی تربیت کے معاملے میں پائی جاتی ہے کہ یہاں بھی اُس کی یہی غایت مدِّنظر رکھی گئی تھی کہ یہ نوجوان اچھے سپاہی بن کر نکلیں۔ اسی غرض سے انہیں فوجی چھاونی میں رکھکر یکساں قسم کی معاشرت کا جبراً عادی بنایا جاتا تھا اور اسپارٹہ کی طرح شدید سرکاری ضوابط کی پابندی کرائی جاتی تھی۔ بلکہ تقسیمِ املاک میں جس قدر کامل مساوات کریٹ میں تھی اس کے برابر اسپارٹہ میں نہ تھی ؛

۴۔ آرگوس کا عروج و زوال ؛ اولمپیہ کا میلا

ساتویں صدی (ق م) میں آرگوس جزیرہ نمائے پلوپنی سس کی سر برآوردہ ریاست تھا۔ لیکن ادھر اسپارٹہ کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مسّنیہ کی قوت ٹوٹی اور اُدھر آرگوس کی قوّت میں زوال آیا۔ چنانچہ تسخیرِ مسنیہ کے پچاس سال بعد وہ پست ہوکر ایک ادنیٰ درجے کی طاقت رہ گیا تھا اور اگرچہ اپنی آزادی قایم رکھنے کی اس میں قوّت موجود رہی اور اسپارٹہ کے پہلو میں وہ ہمیشہ کانٹے کی طرح

چبھتا رہا، لیکن اسے امتیاز و فوقیت کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اس فوقیت کے لئے جو جدو جہد ان ریاستوں میں ہوتی رہی اس کے مدارج فتح و شکست کا حال مشہور اولمپی تہوار کی صدارت کے ردّو بدل سے ظاہر ہوتا ہے ؛

الفیوس ندی کے کنارے ریاست پیزا واقع تھی اس نے مسّنیہ کی بغاوت میں اعانت کی اور اسپارٹہ کی دشمن ہوگئی تھی۔ اس ریاست کے علاقے میں، کوہِ کرونوس کے درختوں کے نیچے اور اُس زاوئے میں جو رودِ کلادیوس کے الفیوس میں آملنے سے بن گیا ہے اولمپیہ کا "آلتیس" یعنی واجب الاحترام کُنج واقع تھا۔ یہاں زئیس دیوتا کے نام پر ہر چوتھے سال، گرمی کے دوسرے مہینے اور پورے چاند کے زمانے میں ایک مذہبی میلا ہوتا تھا جس میں مردانہ کرتب اور کھیل دکھائے جاتے تھے اور یہ اس میلے کی بڑی خصوصیت تھی۔ مگر اوّل اوّل صرف پیدلوں کی دوڑ، تکہ بازی اور کُشتی ہوا کرتی تھی، رتھ کی دوڑ اور گھڑ دوڑ بعد میں اضافہ ہوئیں؛ اس قسم کے کرتب اور مقابلے یونان میں قدیم سے مروّج تھے اور ایلیڈ میں پاتروکلوس کی موت پر جو کھیلوں کا حال بیان کیا گیا ہے، اس سے ہمارا یہ اخذ کرنا جائز ہوگا کہ اس قسم کی ورزشیں نویں صدی (ق م) میں بھی آیونیانی معاشرت کا جزو تھیں؛ بہر حال، اولمپیہ کے معبد پر، جو یقیناً پہلے پیزا کے علاقے میں داخل ہوگا، اُس کے شمالی ہمسائے، الیس نے متصرّف ہونا چاہا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

اسپارٹہ کی تائید پاکر، تہوار کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا؛ لیکن ساتویں صدی کے وسط میں فیڈن شاہِ ارگوس فوج لیکر جانب مغرب چلا اور اولمپیہ پہنچ کر اُس نے مذکورہ بالا انتظام الیس والوں سے لیکر دوبارہ اہل پیزا کے حوالے کردیا۔ واضح ہو کہ فیڈن آخری بادشاہ ہے جس کے زمانے میں ریاست آرگوس پلوپنی سس کے معاملات میں نمایاں حصّہ لیتی رہی۔ اس موقع پر یہی بادشاہ یہاں کے کھیلوں میں صدر نشین بنا۔ بلکہ تاریخ میں ان کھیلوں کا ذکر ہی پہلی مرتبہ اس واقعے کے ساتھ آیا ہے۔ مگر اس کے بعد جب اسپارٹہ نے مسنیہ کو فتح کرلیا تو کچھ عرصے میں اس کے اقتدار و اثر سے پھر وہ انتظام اہل الیس کے پاس آگیا۔ (۶۶۲ ق م)

افسانوں میں، ان کھیلوں کی ابتدا، پلوپون یا ہراکلیس سے منسوب کی جاتی تھی۔ اور جب الیس والوں نے ان کی صدارت دوبارہ غصب کی تو رفتہ رفتہ یہ کہانی بن گئی کہ لکرگس اسپارٹی اور ایفی توس باشندۂ الیس نے ۷۷۶ ق م میں ان کھیلوں کو دوبارہ رواج دیا۔ اور یہی سن اولمپی تہوار کا پہلا سال شمار کیا جاتا تھا، اور اہل الیس کہتے تھے کہ اُس وقت سے فیڈن کے آنے تک پہلے بھی ان کھیلوں کی صدارت ہم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا یہی قول عام طور پر لوگ باور کرنے لگے۔

مگر چھٹی صدی کے شروع ہوتے ہوتے، اس تہوار نے جو قبولِ عام پایا وہ صرف پلوپنی سس کی حدوں میں محدود نہ رہا

بلکہ جہاں کہیں یونانی زبان بولی جاتی تھی وہاں وہاں عالمِ یونانی کے
ہر گوشے سے لوگ اس میں کھنچنے لگے اور ہر چوتھے سال تہوار
کا موسم آتے ہی الفیوس کے کناروں پر پہلوانوں اور شہسواروں
اور عام تماشائیوں کا انبوہِ کثیر جمع ہونے لگا۔ تہوار کا زمانہ بھی
محترم سمجھا جانے لگا جس میں جنگ و قتال حرام تھے اور الیس
والے دعویٰ کرتے تھے کہ اس زمانہ میں ان کا سارا علاقہ پاک
اور واجب الاحترام ہو جاتا ہے۔ بازیوں میں جیتنے والے کو جنگلی
زیتون کا ایک تکٹ (یا تاج) انعام میں ملتا تھا لیکن جب
وہ فاتحانہ شان سے اپنے وطن میں پہنچکر اس تاج کو شہر کے
بڑے مندر میں نذر کرتا تو وہاں اُس کو بہت سے تحائف و
ہدایا ملجاتے تھے۔ بہر حال، اولمپیہ کے میلے نے ایک مرکز کی
صورت اختیار کرلی تھی جہاں ہر گوشے کے یونانی جمع ہوتے
اور باہم تبادلۂ خیالات و مشاہدات کرتے تھے۔ پس یہ بھی
انہی شعایر قومی میں داخل ہوگیا تھا جن کے ذریعے نسلِ
یونانی کے منتشر افراد میں احساسِ ملّی تازہ اور نمایاں ہوتا تھا۔ اس
کے سوا جیسا کہ آگے آئیگا، یہ میلا ایک نمونہ بن گیا تھا اور اسی
کے مطابق اور بھی میلے قومی اتحاد کے خیالات کو ترقی دینے کی
غرض سے بعد میں قایم ہوئے ؞

۵۔ جمہوری تحریک مقنّنین اور جابرین

یہ ظاہر ہے کہ جب تک وہ قوانین، جن کے مطابق کوئی

قاضی یا منصف فیصلہ کرتا ہے، ہر شخص کی دسترس میں نہ ہوں اس وقت تک اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہوسکتی کہ سب کے ساتھ مساوی عدل ہوگا۔ پس قدرتی طور پر، یونانی ریاستوں میں جمہور نے سب سے پہلے اپنے امیر حکام سے بہ اصرار یہ مطالبہ کیا کہ قوانین کو قلمبند کرادیا جائے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ قدیم زمانے میں ایسے افعال جن سے کسی فرد کو نقصان پہنچے مگر جن کا دین یا سلطنت سے تعلق نہ ہو، خاندانوں کے مواخذے سے باہر تھے اور اس کی تلافی خود افراد پر چھوڑدی گئی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں اس کا فیصلہ کرلیں۔ سلطنت اس میں کوئی دخل نہ دیتی تھی۔ حتیٰ کہ خون کے معاملات میں بھی قاتل سے انتقام لینا، مقتول کے صرف اعزا کا فرض تھا۔ لیکن بعد میں تمدن کی ترقیوں کے ساتھ دادرسی بھی ایک حد تک سلطنت کے فرائض میں داخل ہوگئی اور ضرر رسیدہ اس بات پر مجبور ہوگیا کہ مجرم کو خود سزا دینے سے پہلے اپنا معاملہ عدالت میں پیش کرے جہاں سزا تجویز کی جاتی تھی۔ بایں ہمہ، قتلِ انسان کے سوا سرکار کسی معاملے میں خود دست اندازی نہ کرتی تھی اور جب تک شخصِ ضرر رسیدہ استغاثہ نہ کرے عدالت میں کوئی مجرم تحقیقات کے لئے پیش نہ ہوسکتا تھا۔ البتہ خونی کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ نہ صرف خود نجس ہے بلکہ اس نے قوم کے دیوتاؤں کو بھی ناپاک کردیا۔ پس قتلِ انسان کی ہر صورت دینی جرائم کی ذیل میں داخل کرلی گئی تھی ۔

لیکن قوانین کو قلمبند کرنے اور رواجوں کو قانونی صورت میں لانے کا جب کام شروع ہوا تو غالباً اسی کے ضمن میں انکی اصلاح بھی ہوتی گئی اور اس طرح ساتویں صدی کے بڑے بڑے جامعانِ قوانین ایک لحاظ سے واضعانِ قوانین بھی تھے۔ ان میں سب سے زیادہ جن کی شہرت ہوئی وہ شہر ایتھنز کے ڈریکو اور سولن دانا، ہیں ؛

کئی جگہ وضعِ قوانین کے ساتھ ساتھ جمہور کو سیاسی مراعات دی گئی تھیں۔ اور نظامِ حکومت کی ترمیم بھی مقنّن کے فرائض میں داخل تھی۔ لیکن اکثر شہروں میں قوانین کا تحریر میں آجانا ایک طویل سیاسی جد و جہد کی پہلی منزل تھی۔ اور جمہوری حکومت کے واسطے ہاتھ پاؤں مارنے پر جس شے نے عوام کو مہمیز کیا وہ معاشی تکالیف تھیں۔ بعض بعض صورتوں میں اس جد و جہد کا انجام یہ ہوا کہ جمہوری حکومت قایم ہوگئی ؛ لیکن کامیابی نے بیشتر اُمرا کا ساتھ دیا اور حکومتِ خواص (اولی گارکی) نے لوگوں کو دبالیا اور بحالِ خود قایم رہی۔ بایں ہمہ شاید سب سے زیادہ مقامات ایسے تھے جہاں اس کشمکش کا نتیجہ ایک دایمی تلاطم کی شکل میں رونما ہوا کہ کبھی خواص برسرِ اقتدار ہوجاتے اور کبھی جمہور۔ گویا انقلاب پیہم کا ایک سلسلہ تھا جن میں اکثر کشت و خون تک نوبت پہنچ جاتی تھی ؛ لیکن گو جمہوریت ہر جگہ فتحمند نہ ہوسکی اور گو جہاں وہ نہایت مضبوطی سے قایم ہوئی وہاں بھی اُمرا کی سازشوں سے محفوظ و بے خوف نہ تھی۔ تاہم دیکھنے

کی بات یہ ہے کہ ہر جگہ لوگوں کو اس کی خواہش و تمنّا تھی۔ اور یہ کہنا کچھ بیجا نہیں ہے کہ یونان کے بہت سے شہر ایسے تھے جن کی تاریخ کا ساتویں صدی (ق م) کے بعد سے نہایت نمایاں واقعہ یہی جہد وسعی ہے کہ وطن میں جمہوری حکومت قایم کی جائے ؛

ان مساعی میں عام طور پر، یا کم سے کم بارہا، یہ ہُوا کہ خود دشمن کے گروہ میں جمہوریت کے مددگار پیدا ہوگئے۔ یعنی دِل برداشتہ اُمرا اپنے گروہ سے نِکل نِکل کے ادھر آملے کہ دل برداشتہ عوام کی رہبری کریں۔ لیکن جب حکومتِ شرفا کا تختہ اُلٹا تھا تو انقلاب کے بعد عام طور پر وہاں کچھ عرصے کے واسطے پھر شخصی بادشاہت عود کر آتی تھی کیونکہ عوام الناس ابھی تک عنانِ حکومت اپنے آپ سنبھالنے کے قابل نہ ہوے تھے اور اس لئے خوشی سے یہ منصب اسی شخص کے حوالے کردیتے تھے جس نے ظالم اُمرا کی حکومت کو تہ و بالا کرنے میں ان کی دستگیری کی ہو۔ اس طرح ایک نئی قسم کی بادشاہی کا آغاز ہوتا جو حقوقِ وراثت کی بجاے زور و قوّت پر مبنی ہوتی تھی ایسے بلاحق بادشاہ بن بیٹھنے والوں میں اور موروثی بادشاہوں میں فرق کیا جاتا تھا اور بادشاہی کی اس نئی صورت کا نام حکومتِ جابرہ ہوگیا تھا۔ واضح رہے کہ خود اس لفظ سے یہ مفہوم نہ لیا جاتا تھا کہ بادشاہ ظالم یا بد ہے۔ اور کسی اچھے بادشاہ کو بھی جابر کہنے میں کوئی تناقض نہ تھا۔ بلکہ بہت سے

جابر واقع میں نیک دِل تھے۔ لیکن چونکہ ایسے بادشاہوں کو حقوقِ وراثت کا سہارا حاصل نہ ہوتا تھا اور ان کی بادشاہی کا دارو مدار محض مسلّح افواج پر ہوتا تھا اس لئے وہ سب سے الگ الگ رہتے تھے اور یہی علیحدگی اکثر انہیں ایسا شکّی اور ظالم بنادیتی تھی کہ "ٹایرنٹ" (یعنی جابر) کی اصطلاح میں وہ بُرے معنی پیدا ہو گئے جن میں کہ یہ لفظ اب یورپ کی جدید زبانوں میں بولا جانے لگا ہے۔ حالانکہ خود یونانی، حکومت جابرہ سے نفرت کرتے تھے تو اس کی بڑی وجہ جابروں کا آزار رساں ہونا نہ تھی بلکہ اصل یہ ہے کہ حرّیت کے دلدادہ یونانی، خود شخصی حکومت یا مطلق العنانی سے بالطبع بیزار تھے؛

جس زمانے میں شرفا کی حکومتوں کا خاتمہ ہوا ہے اُسے اکثر جابروں کا زمانہ کہدیتے ہیں کیونکہ اس قسم کی شخصی حکومت سب سے پہلے اسی زمانے میں وجود میں آئی۔ اور قریب قریب ایک ہی زمانہ تھا جب کہ یونان کے مختلف حصوں میں جابروں کا ظہور ہوا۔ پھر یہ کہ بِلا استثنٰی ان سب نے حکومتِ شرفا کو تہ و بالا کرنے کا کام انجام دیا اور متعدّد مقامات پر جمہوریت کا راستہ تیار کیا؛ پس اس زمانے کو جابروں سے منسوب کرنا بے جا نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی تاریخ یونان کے ہر زمانے میں کہیں نہ کہیں ایسے شاہانِ جابر ضرور ظہور کرتے رہے کیونکہ شخصیت کی ہوس ہمیشہ یونان میں موجود رہی۔ اور یہ چیز اور نیز اُمرا یا خواص، وہ بلائیں ہیں جن سے اُن کی جمہوری

حکومتوں کو ہر زمانے میں خطرہ لگا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت جابرہ کا اصلی وطن آیونیہ تھا اور ممکن ہے کہ لدیہ کے مطلق العنان بادشاہوں کی شان و شوکت دیکھکر ہی وہاں کے بعض باشندوں میں شخصی حکومت کی ہوس پیدا ہوئی ہو۔ بہر حال ان میں سب سے مشہور آیونیانی جابر تھراسی بلوس ملطی گزرا ہے جس کے عہد حکومت میں شہر ملطہ کو وہ نمایاں رتبہ ملا جو اور کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ (قیاساً ۶۱۰ ق م) جزیرہ لس بوس کے شہر متی لنہ میں حکومت جابرہ کے ساتھ ہم ایک صورت اس سے محفوظ رہنے کی بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ جابروں کی حالت یہ تھی کہ پے در پے خروج کرتے اور پھر نابود ہوجاتے تھے شاعر الکایوس کی بعض غزلوں میں آج بھی اُن جذباتِ نفرت و مسرت کی گونج باقی ہے جو کسی جابر کی فتح اور شکست پر دل میں موجزن ہوتے ہیں مثلاً لکھتا ہے کہ "آ۔ آج اتنی پئیں کہ لڑکھڑا جائیں کیونکہ مرسی لوس مرگیا!" الکایوس خود جنگ آزما اور ایک خاندانی امیر تھا مگر دردانیال کے ساحل پر اہل ایتھنز سے جب جنگ ہوئی تو ارکی لوکوس کی طرح وہ بھی اپنی ڈھال چھوڑ کر بھاگا، جو فتح پانے والوں کے ہاتھ آئی اور بطور یادگار قلعہ سی گیوم میں لٹکادی گئی تھی؛ مگر جنگ میں پتاکوس نے بڑی مردانگی دکھائی اور وہی اپنے وطن کا مشکلکشا ثابت ہوا۔ یعنی جب لوگوں میں اس کا اعتبار بڑھا تو دس سال کے واسطے وہ حاکم شہر منتخب کیا گیا کہ شہر میں جو خرابیاں تھیں اُن کا دفعیہ کرے؛

ایسے حاکم کو جو ایک معیّن وقت کے واسطے اختیاراتِ کُلّی رکھتا ہو "ازیم نِتیس"، کہتے تھے۔ پِتاکوس کو جب یہ منصب ملا تو اس نے نہایت اعتدال اور قوّت کے ساتھ حکومت کی اور نیز ایک دُور اندیش واضعِ قوانین کی شہرت پائی۔ جن اُمرا نے اس کی مخالفت کی انہیں اس نے جلا وطن کردیا اور اُنہی میں لس بوس کے دو نہایت مشہور باشندے یعنی الکایوس اور سافو نامی شاعرہ بھی تھے۔ پھر دس سال پورے ہونے کے بعد وہ اپنے عہدے سے دست بردار ہوگیا اور اپنی وفات کے بعد یونان کے "عقلائے سبعہ" میں شمار کیا جانے لگا۔

۶- وسطی یونان کی جابر حکومتیں

اس قسم کی تین حکومتیں، خاکنائے کورنتھ کی حوالی یعنی ریاست کورنتھ سکیان اور مگارا میں، ساتویں صدی کے تقریباً وسط میں قایم ہوئیں۔ ہر مقام پر جداگانہ اسباب سے یہ نوبت پہنچی تھی اس لئے تینوں جگہ کے حالات کا مطالعہ فایدے سے خالی نہیں۔ سکیان کی حکومت نہایت پُرتحمّل و فیّاض تھی کورنتھ کی پُرتجمل و آزار دہ۔ مگارا کی عارضی اور چند روزہ جس کے جلو میں خانہ جنگیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔

پہلے اُمرا کا خاندانِ باکیوس کورنتھ میں حکومت کرتا تھا (۶۵۷ قم) جبے کِپ سلوس نے عوام کا رہنما بن کر درہم برہم کردیا۔ باکیوسی اُمرا شہر سے نکال دیئے گئے۔ اُن کی

املاک ضبط کر لی گئیں۔ خطرناک اشخاص بھی قتل کر دیئے گئے اور
اب کپ سلوس نے عنانِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لی۔
اس کے عہدِ حکومت کا حال بہت کم معلوم ہے۔ قدیم
تحریروں میں کہیں تو اُسے سخت بتایا گیا ہے اور کہیں نرم
البتہ اُس کے بیٹے پریان ڈر (پیری انڈر) کی نسبت کچھ زیادہ
حالات موجود ہیں۔ مگر اس کپ سلوسی خاندان کے عہدِ جابری
کی ایک عام خصوصیت یہ تھی کہ یہ بادشاہ بیرونی تجارت اور
نوآبادیوں کے بڑے حامی اور صنعت و فن کے قدردان تھے۔

کپ سلوس کی غالباً ایک پہلی کامیابی یہ تھی کہ اُس نے
کرکایرا کو مطیع کیا۔ یہ جزیرہ کورنتھ کی نوآبادی تھا مگر اب اپنا
بیڑا الگ بنا کر، اُدھر کے سمندروں میں اپنے مادری شہر کا
ہم چشم و حریف ہوتا جاتا تھا۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ دو یونانی
ریاستوں کے مابین جہازوں کی پہلی لڑائی اُسی جنگ کو مانا
جاتا تھا جو کرکایرا اور کورنتھ میں ہوئی اور اس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ درحقیقت شہر کورنتھ اپنی نوآبادیوں کو محکوم بنا کے رکھنا
چاہتا تھا۔ گویا اس بارے میں کپ سلوس کے خیالات
ہمارے جدید آئین سے مطابقت رکھتے تھے اور قدیم یونانیوں
کی طرح اپنی نوآبادی کو آزاد و خود مختار چھوڑ دینے کی بجائے وہ
یہ چاہتا تھا کہ نوآبادیوں کا اپنے مادری شہر سے محکومانہ تعلق
قایم رہے۔ اُس کا یہ نیا اُصول محض بُعدِ مسافت کی وجہ سے
شہر سیراکیوز پر نہ چل سکتا تھا پھر بھی کرکایرا پر فتحیابی کا فوری

نتیجہ یہ ہوا کہ یونان کے شمال مغربی علاقوں میں کورنتھ کا اثر بڑھ گیا اور لیوکاس پر قبضہ ہوگیا جس کی تنگ خاکنائے کو کاٹ کر انہوں نے اُسے جزیرہ بنالیا۔ خلیج امبراکیہ کے جنوبی اور شمالی پہلو پر بھی اُن کی دو نوآبادیاں، اناک ترین اور امبراکیہ آباد ہوگئیں اور اپیرس کے ساحل پر اپالونیہ۔ اوپر شمال میں کرکایرا والوں نے کورنتھ کی زیر سرپرستی اپی دامنوس کی بستی بسائی اور دنیا سے یونان کے دوسرے حصے میں شاہ پریان ڈر کے بڑے بیٹے نے جزیرہ نمائے کالسی ڈیس پر شہر پٹی دیہ آباد کیا۔

شہر کی تجارتی ترقی میں بھی کپ سلوس اور پریان ڈر نے کوشش کا کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا تھا۔ ساتویں صدی کے وسط میں تمام یونانی ریاستوں مین ارتریہ اور چالکیس سب سے مشہور تجارتی شہر تھے۔ پچاس ہی سال کے بعد ہم انہیں رُوبہ زوال اور کورنتھ وا اجی نا کو ان کی جگہ پیش پیش ہوتا، دیکھتے ہیں۔ مگر اُن کے زوال کی وجہ خود اُن کی باہمی رقابت تھی جو ایک طویل و بربادکُن جنگ کی صورت میں رُونما ہوئی۔

وہ شاہانِ جابر جو پریان ڈر کی مثل نہایت اقبال مند بادشاہ مانے جاتے ہیں اگر ایک طرف رفاہِ عام کے لئے کوشاں ہوتے تھے تو اسی کے ساتھ اکثر ذہنی اور دماغی مشاغل سے بھی اپنی دلچسپی ظاہر کرتے اور صناعت و فنون کی ترقی میں بھی کچھ نہ کچھ حصہ لیتے تھے؛ چنانچہ کورنتھ میں "دِتی رام بوس" نام نظم کے نشوو نما پانے کا یہی زمانہ ہے۔ یعنی وہ لے ہنگم راگ جو

انگور کی فصل کے تہواروں میں ڈایونی سیئس دیوتا کی تعریف میں گائے جاتے تھے، اب ایک موزوں صورت میں جوڑے جانے لگے۔ یہ ایجاد آریَن مطرب سے منسوب کی جاتی تھی جس کی نسبت یہ افسانہ مشہور تھا کہ اُسے ملّاحوں نے لوٹ لیا اور اس قدر مجبور کیا کہ وہ سمندر میں کود پڑا تھا اور پھر "ڈلفن" مچھلی کی پشت پر سوار ہو کر کورنتھ پہنچا تھا اور یہ مچھلی ڈایونی سیئس دیوتا کی خاص بیرہے +

فن عمارت بھی اہل کورنتھ کی ہنرمندی نے، خاص کر مندروں کی تعمیر میں ایک مفید اضافہ کیا تھا۔ ساتویں صدی (ق م) میں اینٹ اور لکڑی کی بجائے پرانے مندروں میں لوگ پتھر لگاتے تھے اور دنیائے یونان کے ہر گوشے میں اس قسم کی متعدد سنگین عمارتیں تیار ہو گئی تھیں۔ ان میں کسی قدر نازک وضع "آیونیانی" تھی جس کا آیونیہ میں رواج تھا اور ذرا بھدّی "ڈوریانی" کہلاتی تھی جو قدیم یونان میں عام تھی۔ اب کورنتھی کاریگروں نے کھپریل (کویلو) ایجاد کی جس میں ڈھلان رکھا جاسکتا تھا اور ہر مندر کے سامنے، دیواروں سے چھت کے بالائی حصّے تک جو سموسہ چھوٹ جاتا تھا اس میں پتھر لگا کر سنگتراش اپنا ہنر دکھا سکتا تھا بس یہ سموسہ بھی جسے یونانی "ایروس" یعنی عقاب کہتے تھے، کورنتھ ہی کی ایجاد مانا جاتا تھا۔

پریان ڈر کی وفات کے بعد (قیاساً ۵۸۶ سنہ ق م) اُس کا بھتیجا لبسامتی گوس جانشین ہوا مگر چند ہی سال کی بادشاہی

کے بعد قتل کردیا گیا۔ اسی کے ساتھ خاندان کپ سلوس کی حکومت جابرہ کا بھی خاتمہ ہوا اور کورنتھ میں سوداگروں کی حکومتِ خواص استحکام کے ساتھ قایم ہوگئی۔ اسی زمانے میں وہ تسلط بھی جو خاندان کپ سلوس نے نو آبادیوں پر حاصل کرلیا تھا، برقرار نہ رہ سکا کیونکہ کرکایرا خود مختار اور کورنتھ کا دشمن بن گیا اور امبراکیہ والوں نے اپنے ہاں جمہوری حکومت قایم کرلی۔ البتہ اپنی دوسری نوآبادیوں پر کورنتھ کا اثر اور اُن سے دوستانہ تعلقات ابھی تک باقی تھے ؛

جس زمانے میں کپ سلوس کی حکومتِ جابرہ کا آغاز ہوا ہے، اس کے تھوڑے عرصے بعد اسی قسم کا انقلاب مگارا میں بھی واقع ہوا تھا اور ان دونوں شہروں میں دوستانہ مراسم پیدا ہوگئے تھے ؛ واضح ہو کہ مگارا میں جہاں کی پارچہ بافی مشہور تھی، تجارت کے فروغ نے اُمرا کو مالا مال کردیا تھا۔ ریاست کا نظم و نسق سب انہی کے اختیار میں تھا اور کسانوں سے وہ بڑی فرعونیت اور ظلم و ستم کے ساتھ پیش آتے تھے۔ انہی مظلوموں کی دستگیری کے لئے تھیاجنیس اٹھا اور خود بادشاہ بن گیا (قیاساً ۶۴۰ق م) پہلے اُس نے ایک فوجی دستہ رکھنے کی اجازت لی تھی اور پھر اچانک اُمرا پر حملہ کرکے انہیں قتل کرادیا تھا۔ اس شخص کے عہد حکومت کی ایک یادگار، پختہ تالاب کی تعمیر تھی۔ مگر وہ اپنی جگہ پر قایم نہ رہ سکا اور اس کے ہٹتے ہی عوام اور شرفا میں، جو تھیاجنیس کی جگہ دوبارہ

ریاست پر قابض ہوگئے تھے، ایک سیاسی کشمکش شروع ہوئی۔ مجبور کرکر کے لوگوں نے حکومت سے مراعات حاصل کیں اور سرمایہ داروں سے زبردستی وہ سُود کی رقوم واپس دلوائیں جو اُنھوں نے قرض داروں کا گلا گھونٹ گھونٹ کے وصول کی تھیں۔ ساتھ ہی کاشتکاروں کو مجلسِ عوام میں شرکت کا حق اور دیہاتیوں کو بھی برابر کے مُلکی حقوق حاصل ہوگئے حالانکہ اب تک وہ ان سے بالکل محروم تھے؛ یہ کشاکش اور تمدّنی تبدیلیاں تھیوگ نیس کے اشعار میں صاف جھلکتی ہیں جو ان پر غور و خوض اور پھر افسوس کرتا ہے۔ وہ خود اپنے طبقہ شرفا کی نا عاقبت اندیشی اور طامعانہ طرز عمل کی سخت نکتہ چینی کرتا ہے اور اُسے نظر آتا ہے کہ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غالباً پھر حکومتِ جابرہ قایم ہوجائیگی؛ بایں ہمہ خود اس کا میلان خاطر حکومت شرفا کی طرف ہے اور جمہوری خیالات کی روز افزوں اشاعت دیکھ دیکھکر وہ نہایت ہراساں ہے۔ ایک جگہ وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ:۔

اشعار "دیواریں نہیں بدلیں۔ مگر لوگوں کی قلب ماہیت ہوگئی! وہ پنچ جو کل تک قانون سے واقف تھا نہ حق سے اور جو بکری کی کھال اوڑھے ہرن کی طرح رہتا سہتا تھا آج شریف بن گیا ہے۔ اور حیف صد حیف کہ خود شریف سب کی نظروں میں پنچ ہوگئے!"

تجارت پیشہ اہل کورنتھ میں حکومتِ جابرہ قایم ہوئی تو بظاہر اس کے بالکل قریب زمانے میں سکیان کے مزارعین میں بھی اسی قسم کا انقلاب حکومت واقع ہوا۔ یہاں کے جابروں میں سب

سے پہلا شخص جس کے تاریخی حالات ہم تک پہنچے ہیں کلیس تنیس ہے۔ وہ چھٹی صدی کے آخری ربع میں حکمران اور اہل آرگوس سے برسر جنگ تھا جو سکیان کو اپنا باج گزار بتاتے تھے؛ اسی دشمنی میں اُس نے حکم دیدیا تھا کہ شہر میں کوئی بھاٹ ہومر کی نظمیں بھی نہ پڑھے کیونکہ ان میں آرگوس کا بہت ذکر ہے۔

کلیس تنیس نے اپنی بیٹی اگارستا کی شادی شہر ایتھنز کے امیر مگاکلیس کے ساتھ کردی تھی اور یہ مگاکلیس وہاں کے نامی خاندان ال کمیونی کا رکن تھا؛ اگارستا کی خواستگاری کا ایک قصہ بہت مشہور ہے جس سے اس کے باپ کی مہمان نوازی، کثرتِ مال اور اس عہد کی رسوم معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اولمپیہ کے ایک میلے میں جس میں کلیس تنیس رتھ کی دوڑ جتیا تھا، اس نے عام اعلان کیا کہ جو یونانی اس کی بیٹی کا خواستگار ہو وہ آج سے ساٹھ دن کے اندر سکیان آئے اور سال بھر تک اس کے دربار میں مہمان رہے۔ اور سال بھر کے بعد وہ فیصلہ کریگا کہ اس کی بیٹی کے لئے سب سے موزوں کون شخص ہے؛ اس اعلان پر تمام یونانی جو اپنی یا اپنے خاندان کی ناموری کا زعم رکھتے تھے سکیان میں جمع ہوئے اور کلیس تنیس ایک سال تک اُنکی قابلیت جانچتا رہا۔ اُس نے مردانہ فنون میں بھی ان کا امتحان لیا لیکن سب سے زیادہ اخلاق اور آداب مجلسی پر نظر ڈالی۔ ان میں اُسے دو ایتھنز کے اُمیدوار سب سے زیادہ پسند آئے یعنی ہیپوکلیڈاس اور مگاکلیس۔ اور اُن میں بھی اس کا زیادہ

رُجحان ہیپوکلیڈیس کی طرف تھا۔ غرض اب انتخاب کا آخری دن آپہنچا اور اس روز کلیس تنیس نے سو بیل کی قربانی اور عام ضیافت کی جس میں شادی کے اُمیدوار اور سکیان کے تمام باشندے مدعو تھے۔ کھانے کے بعد عام گفتگو اور فنِ موسیقی میں مقابلہ شروع ہوا۔ ہیپوکلیڈیس کی طبّاعی اس وقت بھی سب سے نمایاں تھی اور چونکہ اُسے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہوگیا تھا لہٰذا عالم سرخوشی میں بانسری والے کو بجانے کا حکم دے کے وہ ناچنے لگا۔ یہ حرکت دیکھکر کلیس تنیس کو بڑی حیرت اور وحشت ہوئی اور جب ہیپوکلیڈیس نے، جس کے نزدیک اب اپنے منظور ہونے میں کوئی کسر نہ رہ سکتی تھی، ایک میز منگائی اور اس پر اسپارٹہ اور ایتھنز کے ناچ، ناچ کر بھاؤ بتانے شروع کئے تو میزبان کی حیرت مبدّل بہ اکراہ ہوگئی اس پر بھی وہ ضبط کئے رہا لیکن جب ہیپوکلیڈیس نے سر کے بل ناچنا شروع کیا تو اس کا میزبان ضبط نہ کرسکا اور پکار اٹھا کہ "تسانڈر کے بیٹے، ناچ ناچ میں تمہاری دُلہن اُڑگئی!" مگر پھر بھی اُس نے یہی جواب دیا کہ "ہیپوکلیڈیس کو اس کی پروا نہیں" اور برابر ناچے گیا۔ تب شادی کے لئے کلیس تنیس نے مگا کلیس کا انتخاب کرلیا اور باقی ناکام امیدواروں کو بہت سے قیمتی تحایف وہدایا دے کر رخصت کیا۔

۷ جنگ مقدس۔ یونانیوں کے قومی میلے

کلیس تنیس کی سب سے بڑی کامیابی جس نے تمام دنیائے یونان

میں اس کو مشہور کردیا، مندر دِلفی (ڈیلفی) کی حمایت تھی۔ یہ مندر (یا پیتھو) علاقۂ فوکیس کے شہر، کرلیسیا کی زمین میں واقع تھا۔ اور کوہ پرناسوس کی سب سے بالائی اور سلامی دار چٹانوں کے ذرا ہی نیچے، پہاڑ کی ڈھلان پر اس مقدس عمارت کی کرسی تھی جہاں سے پلیس توس کی گہری گھاٹی بالکل پاؤں کے نیچے نظر آتی ہے۔ غرض مجموعی طور پر اس منظر میں وہ ہیبت و شان تھی کہ الہاماتِ ربانی کے نزول کے واسطے اس سے موزون کوئی مقام نہ ہوسکتا تھا۔ اہل کرلیسا اس مندر پر اور دِلفی کے رہنے والوں پر اپنا حق جتاتے تھے اور جو لوگ دیوتا سے استخارہ کرنے یہاں آتے اُن سے محصول وصول کرتے تھے؛ کرلیسا کی اسی حکومت سے اہل دِلفی نے آزاد ہونا چاہا اور بالطبع شمال کی اُن متحدہ ریاستوں کی طرف رجوع ہوئے جن میں فوکیس کے قدیم دشمن یعنی اہل تھسالیہ سربرآوردہ مانے جاتے تھے۔ مذکورہ بالا اتحاد مذہبی نوعیت رکھتا تھا اور اس میں وہ لوگ شریک تھے جو دِمیتر دیوی کی درگاہ واقع اِن تِلا کے "ارد گرد" آباد تھے۔ (اِن تِلا درۂ تھرموپلی کے متصل واقع تھا) اور اسی لئے اہل اتحاد کا نام "ام فیک تیون" یعنی ہمسائیگانِ اَن تِلا تھا اور اس میں لوکریس، فوکیس، بیوشیہ، اور ایتھنز کی ریاستیں، نیز ڈوریانی، مَلیانی، دلوپیانی، اینانی، تھسالیانی، پَرھی بیانی اور ماگ نِتی قومیں شریک تھیں۔

امداد کی درخواست پر اہل اتحاد نے اپالو دیوتا اور اسکے

دلفی خدام کی بڑے جوش کے ساتھ حمایت کی اور کریسا کے خلاف جس نے اُس مقدس زمین کی توہین کی تھی، جہاد کا اعلان کردیا۔ مگر شمالی علاقوں کے علاوہ دلفی کا سب سے بڑا حامی جنوب سے پیدا ہوا۔ یعنی سکیان کے شاہ جابر نے خلیج کو عبور کرکے بے دین اہل شہر پر حملہ کیا۔ چونکہ شہر کریسا نہایت عمدہ موقع پر واقع تھا اور سمندر سے مندر کو جانے کا راستہ اس کی زد میں تھا، لہذا یہ بات عیاں تھی کہ جب تک شہر بالکل تاراج و برباد نہ کردیا جائے، دلفی کی آزادی خطرے سے محفوظ نہ ہوسکتی تھی۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر لڑائی شروع ہوئی اور اتحاد ہمسائیگاں، کے شرکا اور اہل سکیان نے ایک تلخ و تند کشمکش کے بعد آخر کار شہر پر قبضہ کرلیا۔ اس کے باشندے قتل اور شہر توڑ کے زمین کے برابر کرادیا گیا۔ کریسا کا یہ تمام میدان دیوتا کے نام پر وقف، اور جو اس میں آیندہ زراعت کرے، اسے خدا کی لعنت اور سخت عذاب کا سزاوار قرار دیا گیا *

اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمسائیگانِ ان تلا اور اہل دلفی میں روابطِ اتحاد قایم ہوگئے اور شرکائے اتحاد کا ایک اجلاس دلفی کے مندر میں منعقد ہونے لگا۔ بلکہ خود اس اتحاد کو اکثر دلفی سے منسوب کرنے اور "دلفیک ام فیک تیونی" کہنے لگے۔ یہاں کا مندر اسی اتحاد یا انجمن کی حمایت میں آگیا اور اوقاف کا انتظام "ہیروم نمونی" یعنی مشیران دین کی ایک جماعت کو

تفویض ہوا جو سال میں دو مرتبہ، خزاں اور بہار کے موسم میں اِن تِلا اور دلفی دونوں جگہ اپنے اجلاس کرتی تھی - اور ہر ایک ریاست یا قوم کی طرف سے جو اتحاد میں شریک تھی، دو نائب اس جماعتِ انتظامی میں لئے گئے تھے ؛ اس طرح دلفی اور اسکے مقتدر خدام نے خود مختاری حاصل کی اور اب ان کے اوج و فلاح کا زمانہ شروع ہوا - وہاں کے میلے کو از سرِ نو شاندار پیمانے پر ترتیب دیا گیا (۵۸۲ ق م) جس کے کھیلوں کا انتظام "انجمن ہمسائیگان" کے خاص فرائض میں داخل تھا - اور وہ ہر اولمپیاد[1] کے وسط میں اولمپیہ ہی کے میلے کی مثل چار سال میں ایک مرتبہ ہوا کرتا تھا ؛

قریب قریب اسی زمانے میں یونانیوں کے اور دو قومی تہواروں کی بنیاد پڑی - ان میں ایک تو خاکنائے کورنتھ پر ہوتا تھا اور دوسرا مقام نمیہ میں - اور یہ دونوں دو سالہ میلے تھے - گویا اب چھٹی صدی (ق م) کے شروع سے یونان میں اس قسم کے چار قومی تہوار منائے جانے لگے تھے۔ دو پلوپنی سس میں - ایک خاکنائے کورنتھ پر اور ایک شمالی یونان میں دلفی پر؛ اور انھوں نے جو وقعت حاصل کر لی تھی وہ آیندہ تاریخ یونان کے کسی عہد میں کم نہ ہوئی ؛

یہ چاروں تہوار تمام یونانیوں میں ہم جنسی کا

---

[1] اولمپیہ کے دو میلوں کے درمیان جو چار سال کی مدت ہوتی تھی اُسے ایک اولمپیاد کہتے تھے - اور اسی سے قدیم اہل یونان تاریخ و سنین کا حساب کرتے تھے - مترجم -

احساس تازہ رکھتے تھے اور دلفی کی بدولت دور دراز کے شہروں میں باہم تعلق و اتصال پیدا ہوتا تھا کیونکہ یہ وہ مقام تھا جہاں دنیائے یونان کے ہر گوشے سے ایلچی اور زایرین آ آ کر جمع ہوتے تھے۔ انہی دو قوتوں نے اہل یونان میں اس خیال کو ترقی دی کہ وہ سب ایک ہلینی نسل سے ہیں اور نسل ہی کی بھلائی میں سب کا بھلا ہے۔

ساتویں صدی (ق م) کے وسط کے قریب "بین الہلینی" کی ترکیب ارکی لوکوس نے اپنی ایک نظم میں استعمال کی تھی اور جہازوں کی اُس "ہومری فہرست" میں بھی، جو کہ ساتویں صدی میں مرتب ہوئی، قریب قریب تمام یونانی ریاستوں کو جنگ ٹروائے کی عظیم مہم میں شریک و سہیم بنالیا گیا تھا۔

اوپر بیان ہوا کہ شمالی اتحاد میں بیوشیہ والے بھی شریک تھے، خود اس علاقے میں متعدد ریاستیں تھیں۔ لیکن یہ سب ایک حلقۂ اتحاد میں آگئی تھیں اور شہر تھیبز ان کا سرگروہ یا شریک غالب تھا۔ مگر اس اتحاد میں نقص یہ تھا کہ اس کا قیام تھیبز کی قوت و چیرہ دستی پر منحصر تھا، اور بعض شرکا دِل سے شریک اِتحاد نہ تھے۔ شہر ارگومنوس ہی اپنی خود مختاری پر عرصۂ دراز تک اڑا رہا اور محض زبردستی ساتویں صدی کے اواخر میں شریک اتحاد ہوا تھا۔ مگر سب سے زیادہ ناخوش ریاست پلاٹیہ تھی۔ اس نے بیوشیانی آباد کاروں کی آمیزش سے اپنی آبادی کو بالکل پاک رکھا تھا۔ اور اس کی تمام

تاریخ (جس کے بعض دلچسپ مناظر ہمارے سامنے سے گزرینگے) گویا اُسی طویل کشمکش کا ایک علیحدہ بچا ہوا سلسلہ ہے، جو ابتدا میں قدیم یونان کے اصلی باشندوں اور نووارد یونانی فاتحین میں ہوتی رہی تھی ؛



باب چہارم

اتحادِ ایٹی کا اور جمہوریۂ ایتھنز کی بنا

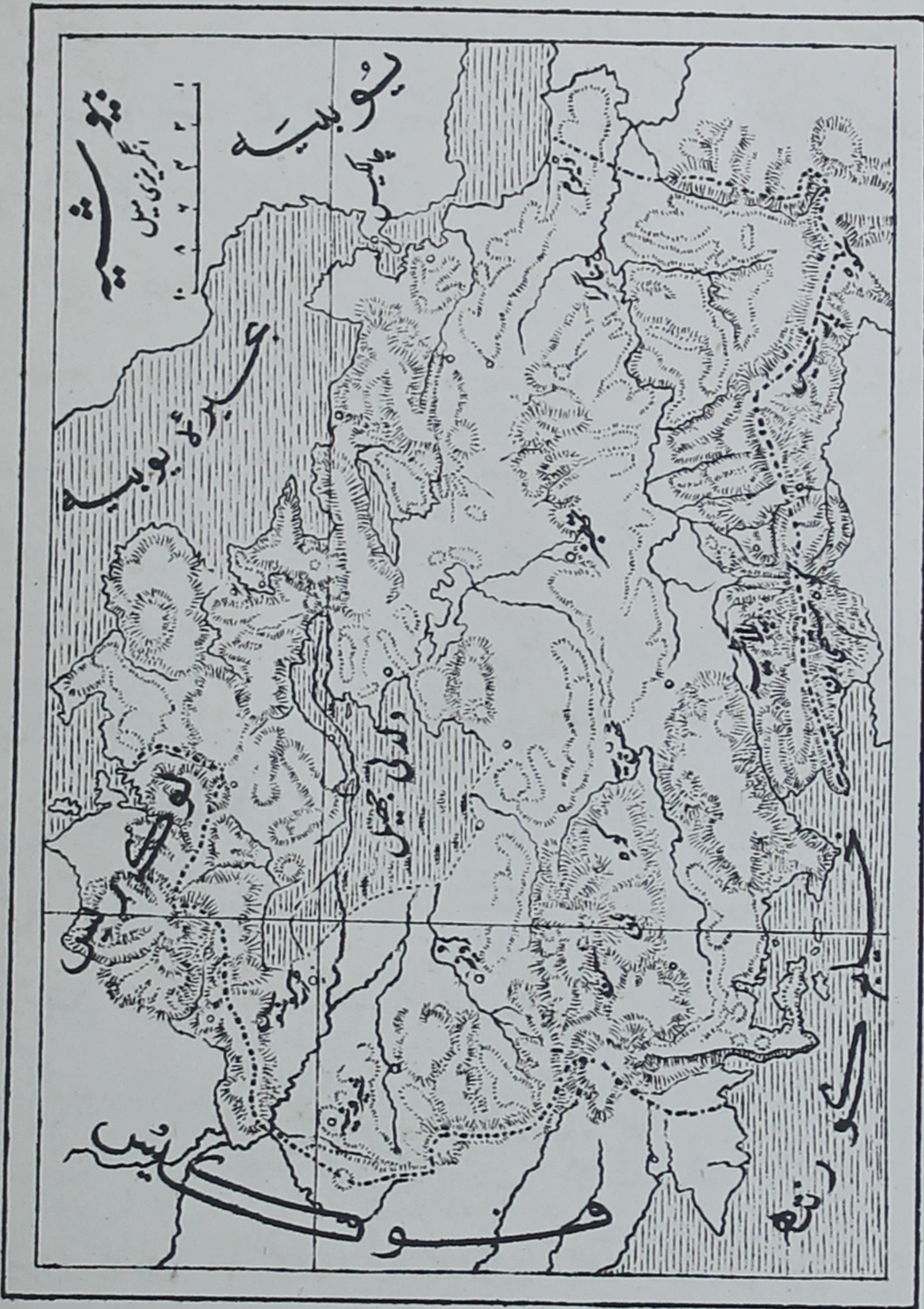
۱- اتحادِ ایٹی کا

اپنے ہمسائے بیوشیہ اور یونان کے دیگر علاقوں کیطرح ایٹی کا میں بھی ایک زمانے میں بہت سی خود مختار ریاستیں الگ الگ قایم تھیں ۔ مگر کوہِ سیتھی رُن اور راس سنیئوم کے درمیان یہ جتنی ریاستیں تھیں اُن میں سب سے نامی الیوسیس اور ایتھنز تھے آخرالذکر قلعہ سمندر سے پانچ میل کے فاصلے پر رود سفی سوس کے میدان میں واقع تھا، اس میدان کا جنوبی پہلو خلیج سارونی کی جانب کُھلا ہوا ہے لیکن اس کے مغرب میں ایکالیوس، شمال مغرب میں پارنیس اور مشرق میں ہی متوس کی پہاڑیاں

کھڑی ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں جو فصل تھا اُسے
پن تلی کوس کے زاویہ نما ٹیکروں نے بھر دیا ہے۔ سفی سوس
ندی بھی ایتھنز کے مغرب میں کچھ بہت دور نہیں بہتی لیکن
اس کے قلعے، اکروپولس کے گرد اُس سے بھی چھوٹی دو ندیاں
گزری تھیں۔ اری دانوس اور الی سوس ؛ یہ قلعہ عصرِ نحاس
میں یونان کے بڑے مستحکم مقامات میں شمار ہوتا تھا اودے
چونے سے اس کے قدیم مالکوں نے جو دیوار پہاڑی کے
گرد کھینچ کر اس کے پھسلواں کنارے کو قلعے کے اندر لیا تھا،
اس کے ٹکڑے اب بھی باقی ہیں اور دوسری جانب ایک
اونچا ٹیکرا قلعے کو آریو پاگوس (ایریوپیگس) کی پہاڑی سے ملاتا ہے
جو اس کا قدرتی دروازہ تھا۔ مگر اس طرف فصیلوں کو اِس طرح
بنایا گیا تھا کہ خاص قلعے کے مغربی دروازے میں داخل ہونے
سے پہلے یکے بعد دیگرے نو پھاٹک طے کرنے پڑتے تھے۔

اس پلاس جی قلعے پر اوّل مرتبہ جن یونانیوں کا قبضہ ہوا
وہ غالباً "کِک روپ" قوم کے لوگ تھے۔ اور بعد کے
ایتھنزی جب پوچھئے، اپنے تئیں شاہ کِک روپ کی اولاد ثابت
کرنے پر تیار رہتے تھے۔ یہ شخص زمانۂ ماقبلِ تاریخ کے فرضی شاہانِ
ایتھنز میں داخل تھا (روایتی ۱۵۸۱ ق م) اور کِک روپ قوم
کا فرضی مورث اعلیٰ مان لیا گیا تھا۔ لیکن ایک زمانہ آیا جبکہ
ایٹی کا کے دیگر یونانی باشندوں نے گروہوں پر غلبہ حاصل کرلیا
اور اُنہی کی بدولت اتھینہ (ایتھینا) دیوی کی پرستش یہاں رائج ہوئی

۱۰۱



اکروپوس بھی ایتھنی (ایتنی) بن گیا اور گکروپ یا پلاس جی، غرض
جو باشندے بھی اس کے اردگرد گانوؤں میں الی سوس و
اری دانوس کے کنارے، بستے تھے وہ سب "ایتھی نیائی"

کہلانے لگے۔ مگر وہ صحیح معنی میں ابھی نیانی اس وقت ہوئے
جب کہ ان کی تاریخ میں "سنوی سس موس"، یعنی علٰحدہ علٰحدہ
دیہات کے ملنے کا واقعہ پیش آیا۔ جس کی یادگار میں سالانہ
"سنوسیا" کا تہوار منایا جاتا تھا۔ اس کے بعد سے ایتھنز
بہت سی متحدہ ریاستوں کا سرگروہ نہ رہا جیسے کہ بوشیہ میں
تھبنز تھا۔ اور نہ اٹی کا کی اور بستیوں میں اس کی حیثیت
حاکمانہ رہی۔ بلکہ اب میراتھاں یا اور کسی گانوں کا رہنے
والا بھی بالکل وہی سیاسی حقوق رکھتا تھا جو خاص ایتھنز کے
بسنے والوں کو حاصل تھے؛ یہ تحقیق نہیں کہ یہ کام کب
اور کس کے ہاتھوں انجام پایا۔ لیکن زمانۂ مابعد میں ایتھنز
والے یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اس اتحادِ ملکی کا بانی
تھی سی اس نامی سورما تھا جسے انہوں نے اپنے قدیم
بادشاہوں[1] کی فہرست میں داخل کرلیا تھا۔

۲۔ جمہوریہ ایتھنز کی بنا

دوسری یونانی ریاستوں کی طرح ایتھنز میں بھی پہلے بادشاہی
تھی جو حکومت شرفا اور پھر حکومت جمہوری کی صورت میں
مبدّل ہوئی۔ شاہی اختیارات کی سب سے پہلی حد بندی
پولی مارک یا عہدہ سپہ سالاری کا قائم ہونا تھا۔

---

[1] اٹی کا کی پرانی روایت میں، جسے ہیروڈوٹس نے محفوظ رکھا ہے، تھی سیس کے پہلے صرف چار بادشاہوں کے نام گنائے گئے ہیں:۔ گکروپ، ارک تیوس، پاندین اور ایجیس۔ ۱۲

۱۰۳



اور دوسری ، ایک آرکن یا اتالیق کا تقرّر جس نے بہت سے بادشاہی فرائض اپنے قبضے میں کر لئے تھے۔ پہلا اتالیقِ حکومت اکاس توس ہوا ہے جسے اس کے میدونتی خاندان والوں نے

اس مرتبے پر پہنچایا تھا۔ وہ تا حیات اپنے عہدے پر برقرار رہا
اس کے بعد جتنے آرکن ہوئے وہ بھی قسم کھاتے تھے کہ ہم
اکاس توس کی مثل اپنے حلف کے پابند رہینگے۔ اس کے
بعد یہ عہدہ بھی صرف دس سال کے لئے میعادی کردیا گیا
اگرچہ یہ شرط ابھی تک باقی تھی کہ آرکن اُسی مدونتی خاندان کا
فرد ہو۔ بعد میں یہ خاندان کی قید بھی اُٹھ گئی لیکن سب سے
پہلی ٹھیک ٹھیک تاریخ جو ہم تک پہنچی ہے وہ ۸۳-۶۸۲ ق م
ہے کہ اس وقت آرکنی یا اتالیقی محض ایک سالانہ عہدہ رہ گیا۔
واضح ہو کہ بادشاہی کو علانیہ منسوخ نہ کیا گیا تھا۔ بلکہ تقریبات
اور رسوم ادا کرنے کے لئے آخر تک ایک آرکن "باسی لیوس"
(یعنی بادشاہ) کے نام سے مقرر ہوتا رہتا تھا۔

انہی تغیرات کے اثنا میں اٹی کا میں وہ "سنوی سس موس"
یا اتحاد ملکی صورت پذیر ہوا تھا جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے
ہیں۔ اور اسی کے بعد یہاں کے اضلاع اور دیہات کے متحدہ
باشندے چار قبیلوں میں تقسیم کردئیے گئے تھے جن کے نام
(گلیون تیس، ارگادلیس، اے جی کوریس اور ہوپ لیتیس)
شہر ملطہ کے ناموں سے نقل کئے گئے تھے اور معلوم ہوتا ہے
کہ ان کو خاص خاص بتوں سے انتساب تھا جیسے
گلیوتیس کو ذئیس گلیون سے۔ ہر قبیلے کا سردار ایک
"شیخ قبیلہ" ہوتا تھا اور قبیلے کے ماتحت تین تین برادریاں،
گویا کل بارہ برادریاں، ترتیب دی گئی تھیں۔

۳۔ حکومتِ شرفا (ساتویں صدی ق م)

اس طرح، ساتویں صدی کے شروع میں جمہوریہ ایتھنز حقیقت میں خاندانی اُمرا کی حکومت تھی اور اس کا کُل نظم و نسق تین عہدہ داروں (یعنی آرکن بادشاہ اور پول مارک) کے اختیار میں تھا جو صرف ایک سال کے واسطے منتخب ہوتے تھے۔ تمام دیوانی مقدّمات کا آخری فیصلہ آرکن کرتا تھا سرکاری فہرست میں سب سے اُوپر اس کا نام ہوتا کیونکہ وہ "ایونی موس" (یعنی صدر نام) کہلاتا تھا؛ پول مارک سپہ سالاری کے علاوہ عدالتی فرائض بھی انجام دیتا اور تمام ایسے مقدّمات کا فیصلہ کرتا تھا جن میں کوئی پردیسی، فریق ہوئے، بادشاہ کا کام، امور مذہبی کے انصرام تک محدود تھا اور یا دین کے متعلّق بعض ایسے مقدّمات کی وہ سماعت کرتا جو اُس مجلس میں پیش ہوتے تھے جس کا وہ میر مجلس تھا؛

ایتھنز میں ایک زمانے کے بعد بُولہ یا مجلس بزرگاں کا نام مجلس آریو پاگوس، ہوگیا تھا تاکہ اس میں اور بعد میں جو مجلسیں بن گئی تھیں، اُن میں امتیاز رہے۔ اور یہ نام اُس مقام کے نام پر اُسے دیا گیا تھا جہاں ایک خاص غرض سے وہ اجلاس کرتی تھی۔ واضح ہو کہ قدیم زمانے میں خون اور قتلِ انسان کے جرم خلافِ سرکار نہیں مانے جاتے تھے۔ بلکہ یہ مقتول کے خاندان کا کام تھا کہ خواہ وہ قاتل سے

قصاص لے یا خون بہا قبول کرلے۔ لیکن رفتہ رفتہ اُن کے دِل میں یہ عقیدہ جم گیا کہ قتل کرنے والا نجس ہوتا ہے اور ضرور ہے کہ پاک کیا جائے۔ چنانچہ مقتول کے اعزا کی خون بہا سے دلجمعی کرنے کے علاوہ اب قاتل کا یہ بھی فرض ہوگیا تھا کہ وہ بعض مراسم تطہیر انجام دے اور ستھونی دیویوں اور فیورلیس (یعنی ڈائنوں) کو راضی کرے، جنھیں ابتدا میں مُردوں کی ارواح تصور کیا جاتا تھا جو انتقام کے لئے چیختی رہتی تھیں۔ پھر یہ کہ اگر کسی قوم کا فرد نجس ہو اور خارج نہ کیا جائے تو ساری قوم پر دیوتاوں کا عتاب نازل ہوتا تھا۔ پس رفتہ رفتہ جرایم کی تحقیقات و دادرسی بھی قوم کا کام اور حکومت کے فرایض میں داخل ہوگئی۔ ایسے مقدمات کی سماعت کے لئے مجلس عدالت کا کام دیتی تھی اور کُل کارروائی میں قدم قدم پر مذکورہ بالا دیویوں کی پوجا کا تعلّق تھا۔ اور چونکہ ان دیویوں کی درگاہ شہر پناہ کے باہر آریوپاگوس کے شمال مشرقی پہلو پر بنی ہوئی تھی، جہاں قاتل جا جاکر پناہ لیا کرتے تھے اس لئے انہی چٹانوں پر اہل مجلس جمع ہوکر، قتل و ضرب شدید، زہر خورانی و آتش زنی کے سنگین جرایم کی سماعت کرتے تھے۔

بادشاہ اور شرفا کے عہد حکومت میں ایتھنز کے آزاد شہری تین طبقوں میں منقسم ہوگئے تھے۔ "یوپاٹ ردی" یا خاندانی اُمرا۔ "گیورگی" یا کاشتکار جو اپنی زمینوں میں خود کھیتی کرتے تھے۔ اور "دمیورگی" جن کا پیشہ تجارت اور لین دین کا تھا۔

مگر ان تین جماعتوں کے علاوہ جنھیں مجلس عوام میں شرکت کا حق تھا، گروہِ کثیر اُن آزاد باشندوں کا تھا جو شہری حقوق سے محروم تھے اور محنت مزدوری یا اُمرا کی زمینیں کاشت کرکے اپنا پیٹ پالتے تھے ‌٭

آٹھویں اور ساتویں صدی (ق-م) میں نوآبادیاں بسانے کی عام تحریک میں اہل اٹی کا نے بظاہر کوئی حصّہ نہ لیا تھا لیکن اُس عہد کی تجارتی سرگرمیوں میں ایتھنز والے ضرور شریک تھے۔ زیتون کی کاشت کو اس علاقے میں بہت فروغ ہوتا جاتا تھا اور اُس کا تیل بڑے نفع سے دساور جانے لگا تھا اس کے علاوہ یہاں کے کمہار اب خود طرح طرح کے برتن بناکر صنعتِ ظروف سازی کو ترقّی دے رہے تھے اور تجارت میں حصّہ لینے سے امارتِ نسبی کی بنیادیں جس طرح کمزور ہورہی تھیں اس کا ہر شخص بہ آسانی اندازہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ خاندانی اُمرا نے جب تجارتی کاروبار میں ہاتھ ڈالا تو بعض کو نفع ہوا اور بعض کو خسارہ بعض بہت دولتمند ہوگئے اور بعض مفلس رہ گئے اور اُدھر محنتی اہل حرفہ کا سرمایہ اور اثر بڑھنے لگا۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ نسب ذاتی کی طرح دولت بھی قوم و سلطنت میں اپنی جگہ نکال لیگی۔ چنانچہ ساتویں صدی کے نصف آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ اٹی کا میں حکومتِ اُمرا نے "تیموکراسی" (حکومتِ اغنیا) کی صورت اختیار کرلی ہے۔ یعنی ایسے نظامِ حکومت کی جس میں تمام سیاسی حقوق کا دارومدار

مال و متاع پر ہوتا ہے؛ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب وہاں کے باشندوں کی دولت کے اعتبار سے تین جماعتیں ہوگئی تھیں۔ یہ تقسیم زرعی جائداد کی پیداوار غلّہ، روغن و شراب کی بنا پر کی گئی تھی۔ اور سب سے اعلیٰ جماعت "پنتاکوسیو مِدِمنی" میں وہ لوگ داخل تھے جن کی زمین میں غلّے اور تیل اور شراب کی مجموعی پیداوار کم سے کم پانچسو مِدِمنی (وزن) کی ہو۔ ان کے بعد، جن کی پیداوار تین سو تا پانسو وزن کی ہوتی وہ "نایٹ" یعنی صاحبِ فرس کہلاتے۔ گویا وہ اُن لوگوں میں تھے جو سواری میں گھوڑا رکھ سکتے اور جنگ میں سوار ہوکر لڑ سکتے تھے؛ آخری جماعت میں جو لوگ شامل تھے ان کی آمدنی کم سے کم دو سو مِدِمنی وزن کے برابر ہوتی اور وہ "زیوگِتے" یعنی "جوٹ والے" کہلاتے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ خوش حال زمیندار تھے اور ان کے پاس اپنی زمین اور بیلوں کی ایک جوٹ یا جوڑی کاشت کے واسطے ہوتی تھی؛ سب سے اعلیٰ عہدے یعنی آرکنی، بادشاہی اور سپہ سالاری صرف جماعت اعلیٰ کے افراد کو حاصل ہو سکتے تھے۔ اور اسکے لئے امارتِ خاندانی کی بھی قید نہ تھی۔ یعنی اگر کوئی لایق شخص یوپاترِدی نہ ہو تو بھی ان عہدوں کے لئے منتخب ہوسکتا تھا؛ گمانِ غالب یہ ہے کہ اسی زمانے میں (قیاساً ۶۴۰ سنہ ق م) تھِس موتھتی کے نام سے جو نیا محکمہ قایم ہوا وہ بھی ادنیٰ طبقوں کی مدّعیانہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔ یہ تھِس موتھتی ۶ پنچوں

کی ایک جماعت تھی جو ہر سال منتخب کی جاتی اور ایتھنز کے تمام عدالتی انتظام کی نگرانی کرتی تھی۔ تھوڑے دن کے بعد ہی یہ جماعت بھی اعلیٰ عہدہ داروں کی ذیل میں داخل اور آرکن، باسی لیوس (بادشاہ) اور پول مارک (سپہ سالار) کے ساتھ شامل ہوگئی اور اب ریاست کا نظم و نسق انہی نو کے ہاتھ میں آگیا جو نو آرکن کہلاتے تھے۔

مذکورہ بالا تین جماعتوں کے بعد ایک گروہ غریب اہل حرفہ اور ان چھوٹے زمینداروں کا تھا جن کی زمینوں میں دو سو مدیمنی (وزن) کی پیداوار نہ ہوتی تھی۔ یہ سب تھتیس کہلاتے تھے جس کے اصلی معنی مزدور کے تھے مگر اب کسی قدر بدلکر اس لفظ کو اصطلاح بنالیا تھا اور اس سے وہ آزاد شہری مُراد تھے جنھیں نظم و نسق میں کوئی حق نہ دیا گیا تھا۔ مگر جب بحری تجارت کی ترقّی کی وجہ سے بیڑا بڑھانا پڑا اور بحری سپاہ میں اسی گروہ کے لوگ بھرتی کرنے پڑے تو اس وقت تھتیس کی بھی منزلت بڑھ گئی اور سچ یہ ہے کہ ایتھنز کی جمہوریت کا اس کی بحری قوت سے ہمیشہ قریبی تعلّق رہا۔ مگر ہرچند سکّے کی ایجاد سے ساتویں صدی میں جو معاشی انقلاب ہوا اس نے لوگوں میں بہت انتشار و افلاس پیدا کردیا تھا تاہم صدی کے ختم ہونے سے تقریباً ۳۰ سال پہلے ایک واقعہ پیش آیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادنیٰ طبقہ ابھی تک اپنی حکومت کا ہوا خواہ اور وفادار تھا۔

قیاساً ۶۳۲ سنہ ق م میں کیلُن (یا سیلُن) نامی ایک امیرزادے نے مگارا کے حاکم جابر تھیاجنیس کی بیٹی سے شادی کی اور وہیں کی مدد سے کوشش کی کہ ایتھنز کا خود بادشاہ بن بیٹھے۔ اس کام میں اُس نے چند نوجوان امیرزادوں کو ملا لیا اور تھیاجنیس نے بھی مگاری سپاہیوں کا ایک دستہ مدد کے لئے اُسے بھیجا۔ لیکن عامۃ الناس میں کوئی اُس کا رفیق نہ تھا۔ وہ قلعۂ اکروپولس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا لیکن کوئی شہری اگر کیلُن کی اس انقلابی کوشش کو دل ہی دِل میں اچھا جانتا تھا تو وہ بھی بدیسی سپاہیوں کی صورت دیکھ کر بگڑ گیا۔ کیلُن کو اہل شہر نے قلعے میں گھیر لیا اور گو عرصے تک محصور رہنے کے بعد وہ خود اپنے بھائی سمیت بچ کر نِکل گیا لیکن اُس کے ساتھی بہت جلد ہتیار رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے اتھِناپولیاس کے مندر میں پناہ لی اور اُس وقت باہر آئے جب آرکنوں نے اُن سے جان بخشی کا وعدہ کر لیا۔ لیکن الکمیونی خاندان کا مگاکلیس اُس سال آرکن تھا اور اسی کے اشتعال دلانے سے اہل سازش قتل کر دئیے گئے۔ یہ ایسی عہد شکنی تھی جس میں خود دیوتاوں کی توہین نکلتی تھی کیونکہ وہ فریادی اس وقت دیوتاوں کی پناہ میں تھے۔ پس جب تک اس معصیت کا کفارہ نہ ہو خود شہر سزاوارِ عذاب تھا۔ یہی وہ پہلو تھا جس پر الکمیونی خاندان کے دشمن اور نیز کیلُن کے خفیہ طرفدار بہت زور دیتے تھے۔ چنانچہ کیلُن اُس کے بھائی اور

اولاد کو اگر دوامی جلا وطنی کی سزا دیگئی تو انہی کے ساتھ الکمیونی خاندان بھی مواخذہ سے نہ بچا بلکہ مقدمہ قایم ہونے کے بعد اس کے تمام افراد کو اہانت مذہبی کے جرم میں سخت سزا دی گئی۔ اُن کا مال متاع ضبط اور انہیں ہمیشہ کے واسطے جلا وطن کردیا گیا؛ یہی وہ واقعہ ہے جس کے نتایج کا ایتھنز کے ملکی معاملات میں دو سو برس بعد تک اثر ظاہر ہوا ؃

فتنۂ کیلُن کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مگارا سے ایتھنز کی جنگ چھڑ گئی جس نے دیہاتی آبادی کی مصیبت کو اور بڑھا دیا۔ کیونکہ ایک تو سواحلِ ایٹی کا کو دشمن تاخت و تاراج کر رہا تھا دوسرے مگارا کی منڈی میں تیل کی تجارت مسدود ہوگئی تھی۔ غرض معلوم ہوتا ہے دیہاتیوں کی یہی تکلیف دیکھ کر وہاں شورش و فساد کا اندیشہ پیدا ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک مجموعۂ قوانین مرتّب و قلم بند کیا جائے۔ اس کام کے لئے دریکو تجویز ہوا کہ وہ ایک غیر معمولی مقنّن (تھِس موتھیس) کی حیثیت سے قوانین کی ترمیم کرے۔ (سنہ ۶۲۱ ق م) ہمیں اس مجموعے کے صرف ایک حصّے کا علم ہے جس میں جرایم قتل و خون ریزی کے متعلّق دفعات ہیں۔ لیکن شہرت کے اعتبار سے مقنّن کا نام سنگ دِلی میں ضرب المثل ہوگیا ہے اور جب ایک ایتھنزی مقرّر نے اُن پر یہ فقرہ چُست کیا کہ "قوانینِ دریکو سیاہی کی بجائے، خون سے تحریر کئے گئے ہیں" تو اسُ کی بہت داد مِلی۔ اس خیال کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ

تھا کہ اس مجموعۂ قوانین میں بعض معمولی خطائیں جیسے گوبھی چرانا، بھی سزائے مُوت کی مستوجب قرار دی گئی تھیں ؛ لیکن ذرا وسعتِ نگاہ سے کام لیا جائے تو یہ مجموعہ اتنا بُرا نہیں نظر آتا۔اس میں دریکو نے قتلِ عمد اور اتّفاقی یا قابلِ جواز قتل میں بڑی احتیاط سے فرق کیا تھا۔ اور ہر چند اسے اُمرا نے مامور کیا تھا اور وہ مجبُور تھا کہ دولتمند اربابِ حکومت کے فائدے کا خیال رکھّے، تاہم ادنیٰ طبقے کے واسطے یہ بھی کچھ کم بات نہ تھی کہ اُمرا کے خود غرضانہ حقوق صراحت کے ساتھ قید تحریر میں آگئے۔

۴۔قوانین سولن اور جمہوریت کی بِنا

دریکو کا مجموعۂ قوانین فی الجملہ غنیمت تھا لیکن وہ اصلی مرض کی دوا نہ تھا۔قلیل التعداد دولتمندوں کا جبر و تشدّد اور کاشتکاروں کے گروہِ کثیر کی شکستہ حالی روز افزوں تھی۔ غریب زمین دار تنگدستی میں مجبور روپیہ قرض لیتا تھا۔ روپے کی مقدار ابھی تک ملک میں کم تھی[۱] اور اس لئے اُسے اپنی مختصر حقیّت مکفول کرنی پڑتی تھی اور یہ زمینیں سرمایہ داروں کے قبضے میں آجاتی تھیں جو بڑی تباہ کُن شرح سُود پر روپیہ قرض دیتے تھے۔ان زمینداروں سے بھی بدتر "ہک تموری" یعنی اُن آزاد باشندوں کی حالت تھی جو محنت مزدوری کرکے بسر اوقات کرتے تھے۔ زرعی پیداوار

---

[۱] اُس زمانے میں چاندی کی قیمت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک بکری کی قیمت ایک دراکمہ (یا درہم = ۱۰/) تھی ۳۲ سیر جو کی بھی ایک دراکمہ اور بیل کی ۵ دراکمہ۔ ۱۲

کا چھٹا حصہ ان کا حق الخدمت ہوتا تھا۔ لیکن جو معاشی حالات اب پیدا ہوگئے تھے اُن میں یہ اُجرت گزرِ اوقات کے واسطے کافی نہ ہوتی تھی اور وہ بھی ناچار اپنے مالکوں سے روپیہ قرض لیتے تھے؛ سُود کی شرح تو بہت زیادہ تھی ہی لیکن دوسری مصیبت یہ تھی کہ اگر قرض ادا نہ ہو سکے تو خود قرضدار کی ذات قرضخواہ کی مِلک ہو جاتی تھی؛ اس طرح جہاں دولتمندوں کی قلیل جماعت زیادہ مالدار اور زیادہ حریص و طامع ہوتی جاتی تھی وہاں چھوٹے زمیندار روز بروز زمینوں سے محروم، اور آزاد باشندے جن کے پاس زمینیں نہ تھیں غلامی کے عذاب میں گرفتار ہوتے جاتے تھے۔ ان سب پر طرّہ یہ تھا کہ عدالت میں بھی انصاف نہ ہوتا بلکہ دولتمند اہلِ اقتدار کی طرفداری میں قانون کے کچھ سے کچھ معنی بنا لئے جاتے تھے۔ اپنے بے رحم حاکموں کی یہ زیادتیاں دیکھ دیکھ کر لوگ دانت پیستے تھے، اور کوئی سرگروہ مل جائے تو بغاوت کے لئے بالکل آمادہ تھے؛

لیکن خیریت گزری کہ ایک نامور شخص سولن پسر اکرس تدیس کی مصالحانہ کوشش کی بدولت یہ طوفان بپا ہونے کی نوبت نہ آئی۔ نسب کے لحاظ سے سولن، طبقہ اُمرا کا رکن اور مدونتی خاندان سے قرابت رکھتا تھا اور سوداگری کے باعث یوں بھی وہ ریاست کی سب سے دولتمند جماعت کا فرد تھا؛ آیونی علم ادب کا اُس پر رنگ چڑھا ہوا تھا اور اُسی زبان میں فنِ شعر گوئی پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ

اُس کی (سیاسی) نظموں کے بعض بعض حصّے اب تک موجود ہیں جنہیں اس نے جمہور کی راہ نمائی کے لئے شائع کیا تھا۔ اسطرح گویا صورتِ حالات کے متعلق خود سولن کی رائے اُسی کے لفظوں میں ہمارے سامنے ہے؛ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعتدال پسند اُمرا اصلاح کی فوری ضرورت اور آیندہ خطرات کو سمجھ گئے تھے اور یہی سبب ہوا کہ سولن سے یہ کام ہاتھ میں لینے کی درخواست کی گئی (۵۹۴ ق م) اور وضع قوانین کے غیر معمولی اختیارات دے کر اُسے آرکن منتخب کیا گیا۔ یہ جو دستور تھا کہ عہدے پر فائز ہوتے ہی آرکن، اعلان کرتا کہ "میں لوگوں کی مال و متاع بجنسہٖ محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ہوں" اس کی بھی سولن نے پابندی کی بلکہ اس کے برعکس اُس نے اعلان کیا کہ "تمام قرضے اور کفالت نامے جن کی رو سے قرضدار کی ذات یا زمین مکفول ہے، منسوخ ہیں اور تمام اشخاص جو قرض کی وجہ سے غلام بنائے گئے ہوں، آزاد ہیں!" اس اعلان کے طفیل ایتھنز والوں نے "اپنے بوجھ اُتار پھینکے" اور سولن کا یہ پہلا اصلاحی کام "سی ساکتیہ" یعنی نجاتِ عظیم کہلایا اور اس کی یادگار میں لوگوں نے جشنِ عام برپا کیا؛

قوم کی جس جس طریقے سے سولن نے چارہ گری کی اسکی پوری کیفیت کا علم نہیں تاہم جو کچھ حالات ہم تک پہنچے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ پُرانے قرضے منسوخ کرنے کے بعد اُس نے یہ قانونِ امتناعی نافذ کیا کہ آیندہ کوئی شخص قرض

کی وجہ سے غلام نہ بنایا جائے۔ نیز یہ کہ کوئی شخص واحد ایک مقررہ حد سے زیادہ زمین اپنے واسطے نہ لے سکے۔ مطلب یہ کہ بڑی بڑی جاگیروں اور کثرتِ مال سے جو طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اُن کا سدّباب ہوجائے؛ سولن کے ان قوانین سے متموّل طبقہ بہت خسارے میں رہا اور اس مصلحِ مُلک کی طرف سے طبعاً اُس کے افراد میں برہمی پیدا ہوگئی۔ بحالیکہ طبقۂ عوام کو جو بڑی بڑی امیدیں تھیں وہ اِن قوانین سے خاطر خواہ پوری نہ ہوئیں اور اُن کی شکایت الگ باقی رہی۔ ان میں سے اکثر اس بات کے خواہاں تھے کہ دولتمندوں کی جائدادیں بالکل ضبط کرلی جائیں اور انہیں از سرِ نو سب پر تقسیم کردیا جائے۔ اور یہ سولن کو منظور نہ تھا اور اسی طرح اگرچہ اُس نے آزاد مزدوروں کو غلامی سے نجات دلادی تھی لیکن ایک سدس اُجرت کے طریقے میں کوئی تغیر نہ کیا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ گو اب وہ غلام نہ بنائے جاسکتے تھے مگر اُن کے وسائلِ معاش میں کوئی کشایش نہ ہوئی تھی۔

لیکن یورپ کے اعلیٰ مدبّرین میں جو شرفِ شمولیت سولن کو حاصل ہے وہ اس کی آئینی اصلاحات پر مبنی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اُس نے نظامِ حکومت میں جو تبدیلیاں کی تھیں اُن سے ایتھنز میں حقیقی جمہوریت اُسی وقت قایم نہ ہوگئی تھی۔ بلکہ اصلاحاتِ سولن کے ایک عرصے بعد یہ نوبت

وہاں آئی۔ بایں ہمہ اس جمہوریت کی بنیاد سولن نے رکھی بلکہ کہنا چاہیئے کہ ڈھانچہ اسی نے تیار کیا تھا۔ بادی النظر میں تو اس کی اصلاحات کے بعد بھی ریاست میں دولتمند امرا کا راج (یعنی حکومتِ اغنیا کا نظام) نظر آتا ہے جس میں کہیں کہیں جمہوریت کے آثار ہیں۔ چنانچہ مال و دولت کے اعتبار سے آبادی کی جو تقسیم پہلے سے چلی آتی تھی اُسے سولن نے بدستور رہنے دیا لیکن اسی کے ساتھ اس نے تھیتیس کو چوتھا طبقہ قرار دے کر بعض سیاسی حقوق دیئے۔ اوپر کی تین جماعتیں مصارفِ سلطنت کا بار اٹھاتی تھی اور سوار یا پیادوں کی حیثیت سے فوجی خدمت بھی انجام دیتی تھیں۔ تھیتیس پر کوئی مالی بار نہ تھا مگر وہ بیڑے میں یا نیم مسلح سپاہیوں میں بھرتی کئے جاتے تھے۔ باقی خاص خاص عہدوں کا حق جن جماعتوں کو پہلے سے حاصل تھا، ان میں غالباً سولن نے کوئی ردّو بدل نہ کیا اور تھیتیس کوئی انتظامی عہدہ نہ پا سکتے تھے۔ البتہ انہیں "اک کلیسیہ" یعنی مجلسِ عوام میں شرکت کی اجازت اور عہدہ داروں کے انتخابات میں رائے دینے کا حق مل گیا تھا۔

لیکن سولن کا بڑا کارنامہ عدالتوں کی از سر نو تنظیم ہے۔ اُس نے ایک نئی عدالت بنائی تھی جس میں تھیتیس سمیت ہر فرقے کے افراد شامل ہو سکتے تھے۔ ارکانِ عدالت یعنی (ججوں) کا تقرر ہر مرتبہ قرعہ اندازی سے کیا جاتا تھا اور اس لئے غریب سے غریب دہقانی بھی اس منصب پر پہنچ سکتا تھا۔ یہ

عدالتیں ریاست کے عمّال سے (جب وہ عہدے کی میعاد پوری کر چکیں) بر سرِ عام مواخذہ کر سکتی تھیں اور اس طرح لوگوں کو ان جمہوری عدالتوں کے ذریعے عمّالِ ریاست پر حاکمانہ نگرانی کا حق حاصل ہوگیا تھا۔ ارکانِ عدالت، چند جماعتوں میں الگ الگ اجلاس کرتے تھے اور ان کی پوری جماعت یا مجلس کا نام "ہلائیہ" تھا اور وہ "اک کلیسیہ" سے بالکل جداگانہ مجلس تھی۔ کیونکہ آخرالذکر میں لوگ صرف وضعِ قوانین یا انتخابِ عمّال کے لئے جمع ہوتے اور اُن سے اس قسم کا کوئی حلف نہ لیا جاتا تھا جیسا کہ ارکان عدالت سے۔ آرکنوں کو جو عدالتی اختیارات پہلے سے حاصل تھے اوّل اوّل وہ اُن سے محروم نہیں کئے گئے اور ہلائیہ صرف مجلس مرافعہ کے فرائض انجام دیتی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ آرکنوں کے پاس محض مقدّمے کی ابتدائی کارروائی رہ گئی اور ہلائیہ ہی ایتھنز کی پہلی اور آخری عدالت بن گئی ؂

ارکانِ عدالت کا تمام قوم سے چُنا جانا ہی جمہوریت کا وہ گُر تھا جو سب سے پہلے سولَن کے ہاتھ لگا۔ اور اس لئے ہمیں جمہوریہ ایتھنز کی بنا کو سولَن سے منسوب کرنے میں بہ مشکل تامّل ہوسکتا ہے؛ اسی ضمن میں اُس نے مجلس آریوپاگوس کے فرائض میں بھی اِس طرح ترمیم کی کہ وضع قوانین اور نظم و نسق میں براہ راست اس کی کوئی مداخلت باقی نہ رہی۔ لیکن یوں اُسے عمّال پر عام نگرانی کے وسیع اور غیر معیّن حقوق دیدئے اور اختیار دیا کہ وہ جس شہری سے چاہیں کسی بیجا بات

بد باز پُرس کر سکتے ہیں؛ البتہ سنگین جرایم کی تحقیقات اور بعض مذہبی مراسم ادا کرنے میں جو فرائض مجلسِ آریوپاگوس انجام دیتی تھی؛ ان میں اب بھی کوئی فرق نہ آیا۔ نیز آیندہ سے اس کی رکنیت کا یہ طریقہ ہوگیا کہ وہی نو آرکن جو سال کے ختم پر عہدے سے علٰحدہ ہوتے، مجلسِ آریوپاگوس کے دوامی رکن بنا لئے جاتے تھے۔ اور چونکہ خود آرکنوں کا انتخاب مجلس عوام کیا کرتی تھی، لہذا مجلسِ آریوپاگوس کے ارکان کو بھی حقیقت میں جمہور ہی کا منتخب کردہ سمجھنا چاہیئے۔

اب مجلسِ آریوپاگوس ایک ایسی معزز جماعت رہ گئی تھی جو حکومت سے ارفع تھی اور خود حکومت میں قریب قریب کوئی دخل نہ رکھتی تھی لہذا ضروری تھا کہ کوئی اور جماعت قایم کی جائے جس کا کام مجلسِ عوام کے روبرو معاملات کو مرتب صورت میں پیش کرنا ہو۔ چنانچہ سولن نے اس غرض کیلئے چارسو ارکان کی ایک نئی مجلسِ انتظامی (کونسل) بنائی جس میں ہر قبیلے کے سو آدمی ہوتے تھے اور خود اہل قبیلہ ان کا انتخاب یا غالباً قرعہ ڈال کر نامزدگی کرتے تھے مگر اس کی رکنیت کا حق تین اعلیٰ طبقوں کو حاصل تھا اور تھیتیس اس سے خارج تھے۔

اصلاحاتِ سولن میں یہ بھی ایک قابل ذکر شے ہے کہ سرکاری عہدہ داروں کے تقرر میں قرعہ اندازی سے کام لیا جاتا تھا؛ اس عہد میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ قرعہ ڈالنا گویا کسی بات کا فیصلہ دیوتاوں پر چھوڑنا ہے۔ مگر سولن نے جو اسکو

اختیار کیا تو بے شبہ اُس کی وجہ یہ احتیاط بھی تھی کہ مختلف فریق
یا خاندان اپنے اثر سے نا جایز فائدہ نہ اٹھاسکیں ؛ اور اس
سے اعلیٰ حکّام کا تقرّر بھی بجا ہوا نہ تھا۔ لیکن سولُن کیسا ہی
خوش عقیدہ کیوں نہ ہو، یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایسے اہم معاملات
کا فیصلہ بالکل قرعہ اندازی اور دیوتاوں کی مرضی پر چھوڑ دیتا اور
کسی نا اہل کے نام قرعہ نِکل آنے کا کوئی حفظ ما تقدّم نہ کرتا
چنانچہ اُس نے یہ تدبیر کی تھی کہ قرعہ اندازی اور انتخاب،
دونوں کو ملا دیا تھا اور پہلے ہر قبیلے سے دس دس اشخاص
کثرتِ رائے سے منتخب کئے جاتے اور اس کے بعد صرف
اِن چالیس امیدواروں میں سے نو آرکن بذریعۂ قرعہ اندازی
مقرّر کر لئے جاتے تھے ؀

سیاسی توازُن قایم رکھنے کی غرض سے سولُن نے
کوشش کی تھی کہ حکومت میں چاروں قبیلے برابر کے شریک
ہوں ؛ اصل یہ ہے کہ اس وقت تک ملک میں دولتمند اور
محتاجوں کی باہمی کشمکش کا اتنا اندیشہ نہ تھا جتنا کہ اس
شدید نفاق اور باہمی حسد کا، جو بہت سے خاندانوں کے
دلوں میں بھرا ہوا تھا۔ اور چونکہ ہر خاندان کی پشتی پر اُس کا
قبیلہ ہوتا تھا اور قبیلہ ملک کا عنصر اعظم تھا لہذا ان خاندانی
نزاعات کی آگ کا کسی وقت سارے ملک میں بھڑک
اٹھنا اور کل نظام حکومت کو تہ و بالا کر دینا کوئی غیر ممکن
بات نہ تھی ؛ لیکن اس مسئلہ کی گرہ کشائی سولُن کے بعد،

ایک دوسرے مقنن کے نصیب میں آئی تھی +

شروع ہی میں سولن نے ایک کام یہ کیا تھا کہ دریکو کے مجموعۂ قوانین کو منسوخ کردیا اور سوائے اُن قوانین کے جو قتلِ عمد کے متعلق اس نے منضبط کئے تھے اس کا کوئی قانون ناقد نہ رہنے دیا تھا؛ خود سولن نے جو قوانین وضع کئے وہ چوبی تختیوں پر کھدوا کر ایوانِ شہر (پبلک ہال) میں رکھوادیئے گئے تھے۔

یہ جو کچھ کام سولن نے کئے ان میں جسارت و دلیری ضرور تھی مگر ساتھ ہی آئین و ضوابط کو بھی ہاتھ سے نہ دیا تھا۔ وہ مطلق العنان نہیں بنا۔ حالانکہ یہ اس کے لئے کچھ دشوار نہ تھا اور بہت سے لوگ اس سے ایسی توقع بھی رکھتے تھے؛ برعکس اس کے ان اصلاحات میں ایک بڑا مقصد جو سولن کی پیشِ نظر رہا وہ یہی پیش بندی تھی کہ ملک میں ایسے حالات صورت پذیر نہ ہونے پائیں جن میں شخصی حکومت کی ضرورت اور امکان پیدا ہوجاتا ہے؛ سطحی دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا سولن اپنی اصلاحات میں ہر قدم پھونک پھونک کے رکھتا ہے۔ خود اس کے معاصرین اس احتیاط پر متعجب اور اکثر جز بز ہوئے اور جب سولن اپنے عہدے سے دست بردار ہوا تو ہر طرف سے شکایتوں کی بوچھار ہونے لگی۔ لیکن اپنے قوانین میں ردّ و بدل کرنے کا اُس نے خیال تک نہ کیا اور یہ سمجھ کر کہ جدید قوانین پر واضع کی غیبت میں زیادہ اچھی طرح عمل ہوسکے گا، وہ عہدۂ آرکنی

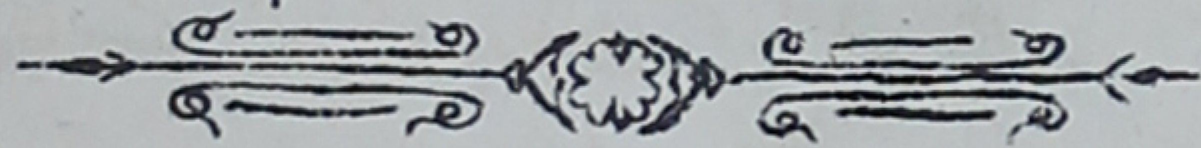
سے دست کش ہونے کے بعد بہت جلد ایتھنز سے باہر چلا گیا اور دس سال تک سیّاحی کرتا رہا۔ ہرچند اس کی نظمیں ناقص اجزا کی صورت میں باقی ہیں، ہرچند اس کی زندگی کے بہت کم واقعات تحریر میں موجود ہیں اور ہرچند اس کے قوانین کے تفصیلی حالات دھندلے ہیں، بایں ہمہ سولن کے اوصافِ ذاتی کا دلوں پر نقش پڑ جاتا ہے اور جو کچھ ہمیں معلوم ہے اُسی سے ہماری آنکھوں میں ایک ایسے شخص کی تصویر پھر جاتی ہے جو قدیم یونانیوں کا، اخلاقی اور ذہنی صفات کے اعتبار سے، بہترین نمونہ اور یونانی عقلا میں سب سے افضل تھا۔

تمدّن کی جو اصلاحی تدابیر سولن نے کی تھیں اُن سے مُلک برابر مستفید ہوتا رہا۔ لیکن اس کی سیاسی اصلاحات، جن کا مقصود مصالحت تھی، بہت لوگوں نے ناپسند کیں اور اُسکے عہدے سے الگ ہوتے ہی پھر فرقہ بندی اور باہمی مخالفت کا طوفان برپا ہوگیا اور تیس سال کے بعد اسی نفاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں شخصی بادشاہی یا حکومتِ جابرہ کی بلا نازل ہوئی جسے روکنا، سولن کا سب سے زیادہ عزیز مقصد رہا تھا۔ مُلک میں جو فرقہ بندی اب ہوئی تھی اُن میں ایک فریق تو ان لوگوں کا تھا جو مجموعی طور پر سولن کے نئے نظامِ حکومت سے خوش تھے۔ اور دوسرا بڑا فریق ان کا تھا جو ان اصلاحات کے جمہوری پہلو کو ناپسند کرتے تھے اور اسی حکومتِ اُمرا کو جس کا سولن نے تختہ الٹ دیا تھا، پھر قایم کرنا چاہتے تھے۔

اس فریق میں زیادہ تر یوپات ردی خاندان کے افراد شامل تھے اور اُن کا نام ''اہل میدان'' ہوگیا تھا۔ فریق مخالف ''اہل ساحل'' کے نام سے معروف تھا اور اس میں طبقۂ متوسط کا بڑا حصّہ، کسان اور نیز دمیورگی شریک تھے جنہیں سولُن کے نئے قوانین سے فائدہ پہنچا تھا۔ ان کا سرگروہ وہی مگاکلیس پسر الکمیون تھا جسے مگارا کی شہزادی اگارستا بیاہی تھی۔ یاد ہوگا کہ کیلُن کے معاملے میں یہ سارا خاندان جلا وطن کردیا گیا تھا لیکن سولُن نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ ایک فرمان کے ذریعے اس خاندان کو واپس آنے کی اجازت دے دی تھی۔



باب پنجم



ایتھنز کا فروغ چھٹی صدی میں

۱- تسخیر سلامیس

جزیرۂ سلامیس، سواحلِ ایتھنز و مگارا کے درمیان، دونوں سے اس قدر قریب واقع ہے کہ جس ریاست کے قبضے میں آجائے ایسا دشمنِ بغل بن سکتا تھا کہ اس سے دوسری ریاست ہر وقت ضغطے میں رہے۔ پس اسی کے قبضے پر ایتھنز و مگارا کی آیندہ تاریخ کا فیصلہ ہونا تھا۔ جس زمانے کا ہم ذکر کررہے ہیں اس وقت ایتھنز کے ہمسائے میں مگارا کی ریاست، اپنی روز افزوں تجارت اور بیرونی نو آبادیوں سے تعلقات کی بدولت بہت طاقتور ہوگئی تھی۔ کیلن کی

سازش کے ضمن میں اس ریاست سے ایتھنز کو جنگ کرنی پڑی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے (۶۲۹ ق م) جنگ میں تھیاجنیس نے سواحل ایٹی کا پر بحری تاختیں کیں اور ایتھنز والوں نے سلامیس پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن وہاں قدم جمانے کا موقع نہ مِل سکا اور مایوس ہوکر انہوں نے یہ کوشش چھوڑدی۔ کئی سال گزرنے کے بعد سولُن نے دیکھا کہ سب سے عمدہ موقع اب آیا ہے۔ اُس نے ایک ولولہ انگیز نظم تیار کی جس کا آغاز یہ تھا کہ "میں حسین سلامیس کا نقیب بن کر آیا ہوں، مگر باتوں کی بجائے میری زبان، شعر میں اس کا پیام پہنچائیگی" اس کے بعد نظم میں ان صلح جُو اشخاص کی مذمت تھی جنہوں نے سلامیس کو اس ذلت کے ساتھ "نکل جانے دیا" اور جوش دلایا تھا کہ "اٹھو اور سلامیس آؤ۔ اس خوبصورت جزیرے کو چھین لو اور وہ داغِ ذلّت دھو دو" اس کی التجا خالی نہ گئی۔ اہل ایتھنز کو قومی جہاد کا جوش آیا اور ان کی ایک فوج گویا ملکی عظمت کا سنگِ بنیاد رکھنے وطن سے روانہ ہوئی۔

اسی مہم میں سولُن کا عزیز دوست **پی سیس تراتوس** (پی سسس ٹراٹس) پسر **ہپوکراتیس** بھی شریک تھا جس نے اسے کامیاب بنانے میں بڑی مدد دی۔ اور نہ صرف یہ جزیرہ مگارا سے چھین لیا گیا بلکہ جزیرے کے مقابل ساحل کا شہر نیسایا بھی پی سیس تراتوس نے فتح کرلیا اور گو صلح کے وقت اسے واپس دے دیا گیا تاہم سلامیس کے قبضے میں اب کوئی

حجت نہ رہی اور یہ جزیرہ مستقل طور پر ایٹی کا سے ملحق اور اس کا
پہلا ماورائے بحر مقبوضہ ہوگیا - اس کی زمین کو بہت سے قطعات
میں بانٹ کر ایتھنز کے شہریوں کو دے دیا گیا جو "کلیروک"
یعنی قطعہ دار کہلاتے تھے *

ایتھنز کے لئے سلامیس کی تسخیر کچھ کم نتیجہ خیز واقعہ نہ
تھی - اس جزیرے پر قبضہ ہوجانے سے خود اس کا علاقہ ایک
احاطے کے اندر اور خلیج ال یوسنی کی محفوظ گودی بالکل اسکے
تحت میں آگئی اور اب خود مگارا کو اس سے خطرہ پیدا ہوگیا*

۲- عہدِ پی سیس تراتوس

نیسایا کا فاتح اپنے وقت کا سورما بن گیا تھا - عیارانہ
ابلہ فریبی سے اب اس نے ان انتہا پسند احرار کے دل میں
گھر کرنا شروع کیا جو اہل ساحل و میدان ، دونوں فریقوں
سے الگ تھے - اور اس طرح اس نے ایک تیسرا فریق تیار
کیا جو اہل جبال کہلاتے تھے کیونکہ اس میں زیادہ تر سطح مرتفع
کے غریب پہاڑی لوگ شریک تھے - اس فریق کو اپنا پشت
و پناہ بناکر پی سیس تراتوس نے اختیار مطلق حاصل کرنے
کا منصوبہ باندھا اور ایک روز زخمی چوک میں پہنچا اور زخم
دکھا کے بیان کیا کہ "فریق مخالف نے دھوکے سے حملہ کرکے
مجھے مجروح کیا ہے" ساتھ ہی مجلس عوام کے جلسے میں جہاں
گرزبردار پہاڑی کثرت سے جمع تھے اس پچاس گرزبردار رکھنے کی منظوری

مل گئی (۵۶۰-۵۶۱ ق م) اور اس فوج خاصہ کو لے کر (جو کہ جابروں کی کامیابی کا پہلا زینہ ہوتا تھا) اُس نے اکروپولس پر قبضہ کرلیا اور سلطنت کا خود مالک بن بیٹھا۔

قسمت کی بات ہے کہ سولُن بھی ابھی تک گویا وہی شخصی حکومت دیکھنے کے لئے زندہ تھا، جس کا اُسے اتنا خوف تھا۔ مگر وہ اس عہدِ شخصیت میں تھوڑے ہی دن جیا اور پی سیس تراتوس نے بھی اس بزرگ قوم کے ساتھ کم سے کم ادب و تکریم کا برتاؤ ضرور مرعی رکھا۔

تقریبًا پانچ سال کے گزرنے پر اہلِ میدان و ساحل پی سیس تراتوس کے خلاف متحد ہوگئے (۵۵۶ ق م) اور انہوں نے اُسے ملک سے نکال دیا۔ لیکن تھوڑے ہی دِن بعد ان میں نفاق ہوا اور معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ساحل کے سرگروہ، مگاکلیس کی نہ صرف فریقِ مخالف سے بلکہ خود اپنے فریق سے اَن بن ہوگئی۔ بہرحال اُس نے پی سیس تراتوس سے مصالحت کی سِلسلہ جنبانی کی اور اس شرط پر کہ وہ مگاکلیس کی بیٹی سے شادی کرے، اُسے حکومت پر بحال کرنے میں امداد کا وعدہ کیا۔ روایت کی جاتی ہے کہ پی سیس تراتوس کے طرف داروں کو کسی گانوں میں غیر معمولی قد و قامت کی فِیہ نامی ایک عورت مل گئی تھی اور اُسے انھوں نے اتِھنہ دیوی کے بھیس میں اپنے ساتھ لے لیا۔ پھر کسی مقرّرہ دِن چند نقیب شہر میں داخل ہوئے اور انھوں نے پکار پکار کے

اعلان کیا کہ خود دیوی پی سیس تراتوس کو اپنے ساتھ واپس لاری ہے۔ تھوڑے سے ہی دیر بعد ایک گاڑی پہنچی جس میں پی سیس تراتوس اور فیہ سوار تھے۔ اور عوام الناس پر یہی فریب چل گیا۔ (سنہ ۵۵۰-۴۹ ق م)*

لیکن پی سیس تراتوس اور مگاکلیس کا زیادہ دن تک ایکانہ رہا۔ پہلی بیوی سے پی سیس کے دو بیٹے تھے ہپیاس اور ہیپارگوس۔ اور اُسے اندیشہ تھا کہ دوسری بیوی سے اگر اولاد ہوئی تو شاید ان بیٹوں کی حق تلفی کا سبب ہو اور خاندان میں فساد پیدا ہوجائے۔ پس گو اُس نے شادی کی ظاہری رسوم سب ادا کرلی تھیں لیکن مگاکلیس کی بیٹی کے ساتھ زوجیت کا تعلق نہ رکھا اور جب یہ اطلاع مگاکلیس کے کان تک پہنچی تو وہ نہایت برافروختہ ہوا اور پی سیس تراتوس کے دشمنوں سے مل کر اُس نے پھر ایک مرتبہ اُسے ملک سے نکلوادیا۔ (سنہ ۵۴۹ ق م)*

یہ دوسری جلا وطنی دس سال تک رہی۔ اور اس اثناء میں پی سیس تراتوس نے مقدونیہ میں تازہ وسایل و تعلقات پیدا کیئے۔ دریاے سِتری مَن کے قریب اُس نے کوہِ پان گیوس کی طلای کانیں کھدوائیں۔ نیز غیر ملکی سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کی اور اس طرح اپنی حکومت واپس لینے کے واسطے روپیہ اور آدمی، دونوں چیزیں مہیّا کرلیں۔ پھر جب وہ میراتھان میں لنگر انداز ہوا تو اُس کے رفیقوں کی جماعتِ

کثیر اُس کے زیرِ علم جمع ہوگئی۔ مقابلے میں حکومت آئینی کے طرفدار لڑنے نکلے مگر جنگ پالنی میں شکست کھائی اور پھر کوئی مزاحمت پی سیس تراتوس کے راستے میں حایل نہ رہی۔ ایک مرتبہ اور حکومت اس کے قبضے میں آگئی اور پھر جیتے جی ہاتھ سے نہ گئی۔

عہد پی سیس تراتوس کو ایک آئینی حکومتِ جابرہ کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن سیاسی تدابیر کے علاوہ جو اُس نے اپنی شخصی بادشاہی کے تحفظ کی غرض سے اختیار کی تھیں، اور کوئی ظاہری فرق قدیم ضوابط و آئین میں نہ آیا تھا اور سولن کا نظام حکومت بہیئتِ مجموعی اُسی طرح نافذ رہا تھا۔ مگر پی سیس تراتوس آرکنوں کے تقرر میں اپنا اثر اس طرح ڈالتا تھا کہ اُس کے ہوا خواہ اس عہدے پر مقرر ہوں اور بالعموم ایک عہدہ دار ضرور اُس کے اپنے خاندان کا آدمی ہوتا تھا؛ مشاہرہ یاب سپاہیوں کی فوجِ باقاعدہ اس کے پاس رہتی تھی اور غالباً ان میں سیتھیہ[1] کے تیر انداز بھی شامل تھے جن کی تصویریں اس زمانے کے ظروف پر بنی ہوئی پائی گئی ہیں؛ اپنے بڑے بڑے مخالفین کی جائدادیں پی سیس تراتوس نے ضبط کرلی تھیں اور اُن میں سے بہت لوگ

---

[1] قدیم یونانی دریائے دان یوب (ڈین یوب) کے تمام شمالی علاقوں کو اسکیتیہ یا "سیتھیہ" کہہ دیتے تھے۔ در حقیقت یہاں کے "اسکیث" یا سیتھی باشندے ترکمانوں کی نسل سے تھے اور بحیرہ اسود کے کناروں سے بحیرہ خزر تک انہی کی مختلف قومیں یا خانہ بدوش قبایل رہتے تھے۔ مترجم۔

جن میں الکیونی خاندان بھی داخل ہے گھر چھوڑ چھوڑ کر پردیس کو چلے گئے تھے۔ یہ زمینیں پی سیس نے اپنے اُن خیر خواہوں میں بانٹ دی تھیں جن کے پاس پہلے کوئی زرعی جایداد نہ تھی اور جو ایک سُدس پیداوار پر مزدوری کرتے تھے جو زمینیں انھیں ملیں اُن پر پیداوار کا صرف دسواں حصّہ مالگزاری ادا کرنی پڑتی تھی۔ لیکن اس مالگزاری اور دریاے سترِیمُن کی املاک سے پی سیس ترّاتوس کو بہت معقول آمدنی ہوجاتی تھی؛ اٹیکا میں اس کے ماتحت امن وامان قایم تھا۔ لوگ خوش حال تھے۔ وہ شہر کو خوبصورت بنا رہا تھا اور بیرونی علاقوں میں سلطنت کی بنیاد ڈال رہا تھا۔

پی سیس ترّاتوس کے جابر بننے سے چالیس برس قبل اہل اتھنز نے دردانیال کے دہانے پر لس بوس والوں کے قلعے، سیگیوم کو فتح کرلیا تھا اور دُور کے سمندروں میں یہ اُن کی سب سے پہلی قسمت آزمائی تھی۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد جب وطن میں تنازعے بپا ہوے تو یہ قلعہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا تھا؛ پی سیس نے اُسے اب پھر فتح کیا اور اپنے ایک بیٹے کو وہاں کا حاکم بنا دیا۔ پھر اسی کی زیرِ سر پرستی، لیکن اس کے ایک مخالف نے یہاں ایک اور بہت بڑا علاقہ حاصل کیا۔ اس شخص کا نام مل تیادیس تھا۔ وہ میدانی فریق کا ایک سرگروہ اور فیلای خاندان کا امیرزادہ تھا اور پی سیس کے عہد میں آباد کاروں کا ایک گروہ لیکر خرسُنِیس (علاقہ تھریس) میں نوآبادی

بسانے روانہ ہوا ؂

آیونیانی قوم کے وطنِ اصلی اور سرگروہ ہونے کا ایتھنز مدعی تھا۔ لیکن اس کا حقِ بزرگی بڑے شدومد سے پی سیس تراتوس ہی نے ثابت کیا۔ یونانی دیومالا میں جزیرہ دلوس (ڈیلوس) کو اپالو دیوتا کا جنم بھوم مانا گیا ہے اور وہاں اس کا مندر، بحیرۂ ایجین کے دونوں جانب بسنے والے، آیونیانیوں کا مرکزی تیرتھ تھا۔ پی سیس تراتوس نے اس مقدس مقام کو "پاک کرایا" یعنی مندر کے اردگردِ جہاں تک نظر جاتی تھی، جس قدر قبریں بنی ہوئی تھیں سب کھدوائیں اور مردوں کی ہڈیاں جزیرے کے دوسرے حصّوں میں دفن کرادیں ؂

دین کے ہر معاملے میں پی سیس تراتوس کا واقعی خاص غلو تھا۔ لیکن اس کا کوئی کام اتنا نتیجہ خیز نہیں جس قدر کہ وہ خدمات جو اُس نے ڈایونی سئیس کی پرستش کے متعلق انجام دیں۔ اس خدائے شراب کا نیا گھر اس نے خاص اکروپولس کے نیچے تعمیر کیا جس کے کھنڈر اب تک ناپدید نہیں ہوئے ہیں اسی مندر کے متعلق اُس کے حسب ایما وہ نیا تہوار منایا جانے لگا جسے "شہر کی بڑی ڈایونی سیا" کہتے تھے اور جس نے فصلِ شراب کے پُرانے تہوار (سنائیا) کو بالکل ماند کردیا۔ اگرچہ ڈایونی سیس کے پہلے مندر پر یہ پُرانا تہوار اب بھی موسم بہار کے اوایل میں ہرسال منایا جاتا تھا۔ ان میلونکی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ لوگ دیوتا کے بک مانش[1]

[1] بک مانس۔ ساتیر (Satyr) کا ترجمہ ہے۔ یعنی ایسی مخلوق جس کا آدھا دھڑ بکرے کا ہو اور آدھا انسان کا۔ مترجم۔

چاکروں کا سانگ بناتے تھے اور بکری کی کھالیں اوڑھ اوڑھ کر قربان گاہ کے گرد ناچتے اور ملکر "بکری کے گیت" گایا کرتے تھے لیکن رواج ہوگیا تھا کہ ناچنے والوں کا سردار جس کا کام گیت بنانا بھی ہوتا تھا، اُس شخص کا بہروپ بھرتا جس کا گیت میں ذکر ہے، اور ساتھ والوں سے الگ ہوکر جواب سوال بھی کرتا جاتا تھا۔ دیہات میں ایسے سانگ لوگ اپنے طور پر بنا لیتے تھے مگر بڑی ڈایونی سیا میں وہ سرکاری اہتمام سے دکھائے جانے لگے اور پھر دو یا زیادہ طائفوں میں انعام کے واسطے "ٹراجڈی" (یعنی بکری کے گیت) کا مقابلہ ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ افسانے بھی گائے اور سانگ میں دکھائے جانے لگے جن کا ڈایونی سیس دیوتا سے کچھ تعلّق نہ تھا۔ اور ان میں ناچنے والے بکب مانسوں کا بھیس بھرنے کی بجائے، اپنی نقل کے مناسبِ حال لباس پہننے لگے؛ ایسے سانگ میں تین جلوے (یعنی ایکٹ) ہوتے تھے اور ہر دفعہ ناچنے والے نیا بھیس بدلکر آتے تھے۔ البتہ آخر میں وہ اپنا اصلی لباس یعنی بکری کی کھال پہن کر آتے اور کوئی ایسی نقل کرتے جس سے "ٹراجڈی" کی اصلیت فراموش ہونے نہ پائے؛ لیکن رفتہ رفتہ یہ بھی زیادہ ضروری نہ رہا۔ نیز ایک دوسرا ایکٹر تماشے میں آنے لگا۔ اور اس طرح وہی شے جو پی سیس تراتوس کے عہد میں محض "بکری کا گیت" تھی ہوتے ہوتے اس کائی لوس کی ٹراجڈی یعنی باقاعدہ ناٹک بن گئی۔

ایتھنہ دیوی کے یادگار میں ہر چوتھے سال ایک اور بڑا تہوار "پان ایتھنیہ"، منایا جاتا تھا اور پی سیس تراتوس کی غضب بادشاہی سے چند ہی روز پیشتر، اگر اس کی بنیاد نہ پڑی تو تجدید ضرور ہوئی تھی ۔ اس تہوار میں موسیقی اور مردانہ کرتبوں کے مقابلے ہوتے تھے لیکن اصلی چیز اور میلے کی جان وہ جلوس تھا جو شہر سے دیوی کی پہاڑی تک، اس کی درگاہ میں ایک قبا چڑھانے نکلتا، جسے دو شیزگانِ شہر اپنے ہاتھوں سے بُنتی تھیں؛ ایتھنہ اور اِرِک تیوس دونوں کے مندر پہاڑی کی شمالی چوٹی کے قریب واقع تھے ۔ مگر اب اس شہر کی دیوی کیواسطے ایک اور مکان پہاڑی کے جنوب میں تیار کیا گیا تھا اور اگرچہ اس کی تعمیر پی سیس تراتوس کے عہد سے پہلے ہوئی تھی لیکن اُس کے گرد ڈوریائی ستون غالباً پی سیس تراتوس نے بنوائے؛ اپنی لمبائی کی وجہ سے اس مندر کا نام "سو فیٹ کی حویلی" ہوگیا تھا اور دیواروں کے سب سے نچلے پتھروں سے جو ابھی تک اپنی جائے پر باقی ہیں، عمارت کا مقام اور نقشہ سمجھ میں آسکتا ہے؛ لیکن اس کی سب سے قابل دید شئے وہ سموسے یا حاشیے تھے جن کی آراستگی میں اس عہد کے سنگ تراشوں نے اپنا پورا کمالِ صنّاعی صرف کیا تھا ۔ اس کام کے لئے کچھ دن پہلے تک ان کاریگروں میں پیرئیوس کا چونا بہت مقبول تھا لیکن اب (چھٹی صدی کے نصف آخر میں) یونانی سنگ تراش زیادہ سخت اور زیادہ نفیس مصالحے پر اپنا ہنر دکھانے لگے تھے ۔

چنانچہ ایتھینہ کے اس نو ترمیم مندر کا حاشیہ پاروسی سنگِ مرمر کا بنایا تھا جس پر دیوتا اور عفریتوں کی جنگ کندہ تھی اور بیچ میں خود ایتھینہ کی تصویر ایک عفریت کو برچھے سے قتل کرتی دکھائی تھی جو اب بھی موجود اور اہل نظر سے دادطلب ہے۔

قلعے کے جنوب مشرق میں الی سوس کے کنارے پی سیس ترا توس نے زئیس دیوتا کے ایک وسیع مندر کی ڈوریانی وضع پر تعمیر شروع تو کی مگر اسے اتنے عظیم پیمانے پر اُٹھایا تھا کہ اس کی تکمیل کو صدیوں تک ہڈریئن (قیصر روم) کے زمانے کا انتظار کرنا پڑا

۳۔ اسپارٹہ کا عروج اور اتحادِ پلوپنی سس

ابھی یہ شاہ جابر تو ایتھنز کا مستقبل ڈھال رہا تھا مگر اُدھر اسپارٹہ تمام جزیرہ نمائے پلوپنی سس میں سر برآوردہ ریاست بن چکا تھا۔

واضح ہو کہ مشرقی ارکیدیہ خاص اُس وسیع میدان کو کہتے تھے جو سطح سمندر سے بلند ہے۔ اس میدان کے شمالی دیہات سمٹ کر مان تینیا کی بستی بسی تھی اور جنوبی دیہات مِل کر تگیا رفتہ رفتہ آباد ہوا تھا۔ اِنہی سرحدوں تک اسپارٹہ نے رفتہ رفتہ اپنا علاقہ بڑھا لیا اور انجام کار خود تگیا سے دست و گریبان ہو گیا۔ (قیاساً سنہ ۵۵۰-۵۶۰ ق م) اپنی طویل جنگ کے متعلق یہ دلچسپ افسانہ مشہور ہے کہ جب اہل اسپارٹہ نے دِلفی کے مندر میں

استخارہ کرایا کہ آیا وہ ارکیدیہ پر فتح کی اُمید رکھیں ؟ تو دیوتا کی طرف سے بشارت دی گئی کہ تگیا انہیں ضرور مِل جائیگا۔ چنانچہ اسی بھروسے پر وہ اسیرانِ جنگ کے واسطے پہلے سے بیڑیاں لے کر چلے تھے۔ مگر مقابلے میں اہل تگیا نے شکست دی اور انہی کی بیڑیاں اُن کے پاؤں میں ڈالکر بجبر اپنی زمینوں میں قلبہ رانی کرائی؛ جنگ کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا لیکن جب اسپارٹہ کو ہر مرتبہ ناکامی ہوئی تو انھوں نے پھر دیوتا سے مشورہ مانگا۔ جواب میں اُن سے۔ اُرسِ تیس کی ہڈیاں لانے کی فرمائش کی گئی اور جب اُس سورما کا مدفن انہیں نہ مل سکا تو ایک مرتبہ پھر انھوں نے دیوتا سے رجوع کیا۔ اس دفعہ جو الہامی جواب انہیں ملا وہ نہایت پیچیدہ اور مبہم الفاظ میں تھا

"ارکیدیہ کی پہاڑیوں میں ایک میدان تگیا کو لئے ہوئے ہے۔
جہاں دو دہکتی بھٹیاں بلا پہ بلا گرا رہی ہیں۔ وار پہ وار
کرنے والے آمنے سامنے ہیں۔ تجھے جس لاش کی تلاش ہے
وہاں موجود ہے۔ خاص اگامِمنن کا بیٹا! اُسے گھر لے آ۔
میدان تیرے ہاتھ ہے"

اس سے بھی اہل اسپارٹہ کی کچھ مشکل حل نہ ہوئی۔ لیکن اتفاق سے اُس وقت جب کہ فریقین میں ہنگامی صلح ہوگئی تھی، لیکاس نامی اسپارٹہ کا باشندہ تگیا آیا اور ایک لوہار کی دکان میں لوہا تپانے کا تماشہ دیکھنے لگا۔ باتوں باتوں میں لوہار نے اُس سے بیان کیا کہ میں گھر کی انگنائی میں کنواں

کھودتا تھا جو سات ہاتھ لمبے تابوت میں اسی قدر لمبی لاش زمین سے نکلی اور میں نے دوسری جگہ اُسے دبا دیا؛ یہ بات سنتے ہی لیکاس کو دیوتا کے جواب کا حل سوجھ گیا اور اسپارٹہ آکر اُس نے سارا قصہ وہاں بیان کیا؛ پھر یہ انگنائی کرائے پر لے کر تلاش کی تو وہ تابوت مل گیا اور مردے کی ہڈیاں لقونیہ لے آئے؛ اُس کے بعد ہی (اب ہم افسانے کی حدود سے نکل کر واقعات کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں) تگیا فتح ہوگیا لیکن اس شہر کی اراضی کے ساتھ مسینیہ جیسا سلوک نہیں ہوا یعنی اُسے فاتحین نے اپنے علاقے میں شامل نہیں کیا بلکہ تگیا کو ایک باج گزار ریاست بنا کے قایم رکھا اور قرار پایا کہ وہ فاتحین کی فوج کے واسطے بوقت ضرورت سپاہیوں کا ایک دستہ فراہم کرتی رہیگی۔

قریب قریب اسی زمانے میں اسپارٹہ کو آخرکار اپنے ملک کی خاطر خواہ حد بندی کرنے میں کامیابی ہوئی یعنی اُس نے شمال مشرق کا متنازعہ فیہ علاقہ تیریاتیس، ریاست ارگوس سے چھین لیا۔ (قیاساً ۵۵۰ ق م) دونوں طرف کی فوجیں میدان میں لڑنے نکلیں لیکن فریقین کے سرداروں میں باہم یہ قرارداد ہوئی کہ دونوں طرف سے صرف تین سو چیدہ جنگ آزما میدان میں اُتریں اور انہی کی فتح و شکست پر لڑائی کا فیصلہ ہو جائے؛ روایت میں ہے کہ اس مبارزہ میں فریقین کے تمام سپاہی کٹ مرے اور سوائے تین جوانوں

کے ایک شخص بھی زندہ نہ بچا۔ ان تین میں دو ارگوس کے جنگ آزما تھے اور ایک اسپارٹہ کا سپاہی باقی رہ گیا تھا۔ لیکن ارگوس والے تو اپنی فتح کا اعلان کرنے کی خوشی میں وطن کی طرف دوڑ پڑے اور اسپارٹہ والا جس کا نام اُتریادلیس تھا، اکیلا میدان میں رہ گیا اور وہاں فتح کا جھنڈا اُسی نے گاڑا۔ بہر نوع دونوں فریق اپنی فتح کے دعویدار تھے اور آخر پھر ایک جنگ ہوئی جس میں اہل ارگوس نے کامل شکست کھائی اور ساتھ ہی سارے جزیرہ نما میں اسپارٹہ بالادست ہوگیا۔ ارگوس اور اکائیہ کے سوا پلوپنی سس کی تمام ریاستیں ایک بے قاعدہ سے اتحاد میں اس عہد و پیمان کے ساتھ شامل ہوگئیں کہ مشترکہ اغراض کے واسطے جب ضرورت ہوگی اسپارٹہ کے زیر علم اپنی اپنی امدادی فوجیں مجتمع کر دینگی۔ شرکائے اتحاد کا جلسہ اسپارٹہ میں ہوتا تھا اور اس میں ہر ریاست اپنے نائب وکیل بھیجتی تھی۔ اس اتحاد میں شرکت پر کورنتھ کی ریاست بڑی جلدی آمادہ ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس کا ارگوس کی صفِ مقابل میں نظر آنا قدرتی بات تھی اور اسی طرح اس کا تجارتی رقیب جزیرہ اجی نا ارگوس کا جانب دار تھا۔ خاکنائے کی دوسری ریاست مگارا بھی جہاں پھر اُمرا نے تسلط جما لیا تھا، اتحاد میں شریک ہوئی۔ اس طرز حکومت کا اسپارٹہ دل سے حامی تھا اور حکومت خواص کے قیام و بقا کے واسطے ہر جگہ اپنا رسوخ و اثر صرف کرتا تھا۔ جمہوریت سے اُسے

ہر جگہ مخالفت رہی، بجز ایک یادگار موقع کے جس کا ذکر آگے آتا ہے ؏

۴۔ خاندانِ پی سیس تراتوس کا خاتمہ اور اسپارٹہ کی مداخلت

جب پی سیس تراتوس مرا تو اس کا بڑا بیٹا ہیپیاس جانشین ہوا اور چھوٹا بیٹا ہیپارکوس بھائی کا حکومت میں ہاتھ بٹانے لگا۔ (۵۲۸ و ۵۲۷ ق م) ہیپیاس جیسے تعبیر و کہانت کے علم میں بڑا دخل تھا اور اس کا بھائی، دونوں اپنے زمانے کے بڑے صاحب ذوق اور تربیت یافتہ امیر زادے تھے اور نامور شعراے ہمعصر جیسے سی مونی دیس کیوسی[1] اور اناک رین ہوسی[1] ان کے دربار میں حاضر ہوتے رہتے تھے ؏

اس حکومت جابرہ کے خلاف پہلے حملے کا منصوبہ ذاتی پرخاش پر مبنی تھا۔ ہیپارکوس نے ایک خوبصورت نوجوان ہرمودیوس کی دِل آزاری کی تھی اور وہ اور اس کا عاشق ارس تگی تن ہیپارکوس کے دشمن ہوگئے تھے۔ انہی نے ملکر دونوں جابروں کو مارنے کا منصوبہ باندھا اور اس کام کے لئے جلوس کا دن مقرر کیا کہ اسوقت شبہ پیدا ہوئے بغیر وہ علانیہ مسلّح ہوکر آسکتے تھے۔ لیکن جب مقررہ وقت آیا تو اہل سازش نے دیکھا کے ان کا ایک شریک ہیپارکوس کے ساتھ کھڑا باتین کررہا ہے جس سے وہ فوراً یہ نتیجہ

---

[1] کیوس اور ہوس دونوں بحیرۂ ایجین کے جزیروں کے نام ہیں؛ مترجم ؏

نکال بیٹھے کہ سازش کھل گئی۔ لہذا ہیپیاس کو چھوڑ کر وہ بازار کی طرف جھپٹے اور ہیپارکوس کو مار ڈالا۔ اُس کے سپاہیوں نے ہرمودیوس کو تو اسی وقت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن ارس تگی تن بچ گیا اور بعد میں گرفتار ہو کر نہایت عقوبتوں کے ساتھ مارا گیا۔

اس وقت اہل سازش سے کسی شخص کی ہم دردی ظاہر نہیں ہوئی تھی لیکن اس فعل نے خود ہیپیاس کے طرز حکومت کو بالکل بدل دیا اور اس وہم کی وجہ سے کہ نہ معلوم یک بہ یک کون مار آستین پیدا ہو جائے، وہ نہایت سخت گیر شکی اور فرعونِ مطلق بن گیا۔ تب بہت سے اہل شہر بھی اُس سے بیزار ہو گئے اور جابر کُش ہرمودیوس اور ارس تگی تن کو دِل ہی دل میں یاد کرنے لگے۔

لیکن حکومتِ جابرہ کے استیصال کا قوی سبب خاندانِ الکمیونی کی کوششیں تھیں کہ یہ لوگ اپنے وطن میں آنا چاہتے تھے اور جب تک خاندانِ پی سیس تراتوس کا راج تھا، کسی طرح نہ آسکتے تھے۔ پس انہوں نے دِلفی کے کاہنوں پر اثر ڈالا کہ وہ ریاست اسپارٹہ پر زور دیں۔ چنانچہ جب کبھی اسپارٹہ والے کسی معاملے میں دیوتا سے مشورہ کرنے آتے وہاں سے ہمیشہ انہیں یہی جواب ملتا کہ "پہلے ایتھنز کو آزاد کرو"۔

الکمیونیوں میں اس وقت مگاکلیس کا بیٹا کلیس تنیس

بزرگ خاندان تھا اور جب دلفی کی مدد شاملِ حال ہوئی تو آخر ان لوگوں کی تدبیر چل گئی اور اہل اسپارٹہ بجبر ایتھنز کو آزاد کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ انھوں نے شاہ کلیومنیس کی ماتحتی میں ایک مہم روانہ کی جس نے ہیپیاس کو اکروپولس کے اندر محصور کرلیا۔ پھر جب اس کے بیٹے جنھیں وہ خفیہ طور پر باہر کسی محفوظ مقام پر بھجوا رہا تھا، دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئے تو اس نے بھی اطاعت کرلی اور اس شرط پر کہ اس کے بیٹے واپس ملجائینگے، پانچ دن میں ملک اٹی کا چھوڑ دینے کا اقرار کرلیا۔ اسی قرار داد کے مطابق وہ اور اس کا تمام خاندان سیگیوم چلا آیا؎

اس طرح اسپارٹہ کی مدد سے ایتھنز کو اپنے شاہانِ جابر سے نجات ملی۔ لیکن آیندہ چل کر جب اُسے آزادی کی قدر ہوئی تو قدرتی طور پر وہ اس امر کے اظہار کرنے میں عار کرنے لگا کہ اُسے یہ نعمت ایک غیر ریاست کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ اور ہر پھر کر اس کی ابتدا انھی دوستوں کی جانبازانہ سعی سے منسوب کی جانے لگی جنھوں نے جابروں کے قتل کا تہیّہ کیا تھا چنانچہ کوئی گھر نہ تھا جس میں ہرمودیوس و ارس تگی تن کے نام بچے بچے کی زبان پر نہ ہوں؎

جب ہیپیاس دفع ہوگیا اور اہل اسپارٹہ بھی واپس

چلے گئے تو پھر اُن میں وہی فرقہ بندی اور مخالفت کا ہنگامہ برپا ہوا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہی ساحل و میدان کے فریق اب کلیس تنیس[ا] اور اس کے حریف الیساگوراس کی سرگروہی میں آمادۂ کشمکش ہوگئے۔ الیساگوراس کو اُن لوگوں سے بھی امداد مل رہی تھی جو در پردہ شاہانِ جابر کے ہوا خواہ تھے۔ لیکن اس مقابلے میں غلبہ کلیس تنیس کو حاصل ہوا۔ کیونکہ غریب عوام الناس کا گروہِ کثیر جسے سیاسی حقوق حاصل نہ تھے

[ا] کلیس تنیس کے خاندانِ الکمیونی کا شجرہ ذیل میں درج ہے اور پانچویں صدی ق م تک اُس کے اخلاف کے نام بھی اس میں شامل کر دیئے ہیں۔

الکمیون

مگاکلیس (سکیان کی شہزادی اگارستا کا شوہر)

- ہیپوکراتیس
  - اگارستہ (زوجۂ زن تیپوس)
    - پری کلیس
    - مگاکلیس
    - دینوماکہ (زوجۂ کلی نیاس)
      - کلی نیاس
      - الکی بیادیس
  - مگاکلیس (جسے جلاوطن کیا گیا)
- کلیس تنیس (واضع قوانین جمہوری)

کلیس تنیس کا ساتھی ہوگیا تھا اور اُس نے انہیں پورے حقوق دلوانے کا وعدہ کرلیا تھا۔ چنانچہ اُس نے بعض جمہوری تجاویز اسی سال مجلس عوام میں پیش کردیں جس سال اُس کا حریف آرکن تھا (۵۰۸ ق م) اور جب کثرتِ رائے کے آگے الیساگوراس کا زور نہ چلا تو اس کو مجبوراً اسپارٹہ سے مدد کی التجا کرنی پڑی۔ اس کے کہنے سے اہل اسپارٹہ نے بھی، جنہیں جمہوریت مطلق پسند نہ تھی، زور دیا کہ الکمیونی خاندانِ دیوتاؤں کا گنہگار ہے اسے اٹیکا سے نکال دیا جائے۔ اس پر کلیس تنیس نے بغیر حجت و مزاحمت خود ہی وطن کو خیرباد کہی اور باہر چلا گیا۔ لیکن جمہوریت کے دشمن اسی پر اکتفا کرنا نہ چاہتے تھے۔ شاہ کلیومنیس دوبارہ اٹیکا میں داخل ہوا اور سات سو خاندانوں کو جنھیں الیساگوراس نے خطرناک بتایا، جلاوطنی کا حکم دے کر اُس نے نئے نظام حکومت کو توڑنا اور اس کی بجائے حکومتِ خواص کو قایم کرنا چاہا۔ مگر اُس وقت ساری قوم ہتیار سنبھال کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور شاہ اسپارٹہ جو تھوڑی سی فوج لے کر آیا تھا، الیساگوراس سمیت قلعے میں گھِر گیا۔ تیسرے ہی دن اُس نے مجبور ہوکر ہتیار رکھ دیئے اور اب پھر جلاوطنوں کو اور خاص کر کلیس تنیس کو واپس آنے کی آزادی مِل گئی کہ آئے اور جو کام شروع کیا تھا اوس کی تکمیل کرے۔

۵- اصلاحاتِ کلیس تنیس

جمہور کے واسطے جو آلۂ حکومت سولن بنا گیا تھا وہ اب کام نہ دے سکتا تھا - برادری اور علاقوں کی تقسیم سے فرقہ بندی پیدا ہوتی تھی: ہر برادری کے تمام افراد ایک ہی قبیلے اور علاقے میں داخل ہوتے تھے - اور چونکہ قبیلے چار تھے لہذا برادریوں کے جتھے بن بن کر ریاست میں بیجا غلبہ حاصل کر لیتے تھے - کیونکہ کسی دولتمند خاندان یا برادری کی پُشتی پر پُورا قبیلہ ہوتا تھا - اور اسی طرح خاص خاص علاقوں کے باشندے جیسے اہل ساحل، قبیلے کی مدد سے اپنی قوت بڑھا سکتے تھے! کلیس تنیس کا سب سے یادگار کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے ایک نیا نظام تیار کیا جس سے یہ مقامی اور خاندانی گروہ بندی ٹوٹ گئی اور ہر باشندہ اپنے علاقے والوں کی بجائے تمام قوم کا فائدہ مدّنظر رکھنے لگا۔

اٹی کا میں اُس وقت ''دمی'' یعنی پرگنے یا چھوٹے چھوٹے ضلعے تعداد میں سو اور دو سو کے درمیان تھے حالاتِ طبعی کے لحاظ سے کلیس تنیس نے کل ملک کے علٰحدہ علٰحدہ تین خطّے کر دئیے تھے: شہر - سواحل - اندرونی علاقہ - پھر ہر خطّے میں اضلاع کے دس مجموعے بنا دئیے تھے جن کا نام ''تریتی'' تھا اور یہ کُل ملک میں تیس تھے - اب انہی تیس مجموعوں کی اُس نے ایک دوسری تقسیم یہ کی کہ مختلف

خطّوں سے ایک ایک مجموعۂ اضلاع لیکر تین تین مجموعوں کے شعبے اور تیاّر کئے اور انہی کو دس قبایل قرار دیا حالانکہ اُن میں بالکل مختلف خاندان اور علاقوں کے باشندے شامل ہوتے تھے مثلاً قبیلۂ پان دیونیس میں تین مجموعۂ اضلاع شامل تھے ایک شہر کے خطّے میں تھا۔ دوسرا (پیانیا) اندرونی علاقے میں اور تیسرا (میر ئیبوس) ساحل کے خطّے سے لیا تھا اور ان تینوں کا الگ ایک قبیلۂ (پان دیونیس) بنا لیا تھا۔ ان دس نئے قبیلوں کے نام قدیم سورماؤں کے نام پر تھے[1]۔

غرض اب ہر شخص کی تین حیثیتیں ہوگئی تھیں: اوّل تو وہ ایک (دموس یا) دِمی (ضلع) میں شامل ہوتا تھا، دوسرے ترِیتّی (مجموعہ اضلاع) میں اور تیسرے کسی قبیلے میں؛ سیاسی حقوق و فرائض کے علاوہ قبیلون کی تقسیم سے ایک اور کام یہ لیا گیا تھا کہ اب ہر قبیلہ پیادہ اور سوار فوج کی مقرّرہ تعداد خود فراہم کرتا تھا اور اس طرح ان نئے قبیلوں کے افراد محض رائے دینے کی غرض سے ہی یک جا نہ ہوتے بلکہ ایک ہی دستہ فوج میں شامل اور اپنے قبیلے کے ایک ہی سردار کے ماتحت شریک جنگ ہوتے تھے۔

ہر دِمی کو بجائے خود ایک جماعت تسلیم کیا گیا تھا اور اس کا ایک دمارک یا میر مجلس الگ ہوتا تھا اور سترہ برس

---

[1] نئے قبیلوں کے دس نام یہ ہیں:- ارکتیس - ایجیئس - پان دِیونیس - لیون تیس - اکامان تیس - اونئیس - گکروپیس ہیپوتن تیس - ایان تیس - اور اَن تیوکیس۔ ۱۲

کی عمر سے زیادہ کے تمام باشندوں کی فہرست اُس کے پاس رہتی تھی؛ لیکن تریتّی یعنی مجموعہ اضلاع کا علیحدہ کوئی نظام نہ تھا۔ وہ صرف دمِی اور قبیلے کی درمیانی کڑی تھی، جو مختلف مقامات کے باشندوں کو ایک حلقے میں لاتی اور وطن کے مشترکہ فایدے کے لئے ملکر کام کرنا سکھاتی تھی اور اس تدبیر سے جبال و ساحل اور میدان کی پرانی تفریق غائب ہوگئی تھی؛ جدید نظام کے استحکام کا راز یہ تھا کہ آخر میں دمِی پر ہی جاکر اس کی بنیاد ٹھیرتی تھی اور دمِی ایک قدرتی اور واقعی حصۂ ملک تھا نہ کہ مصنوعی۔ اور ولدیت کی بجائے آیندہ سرکاری کاغذات میں، لوگ انھی کی سکونت سے منسوب و معروف ہوتے تھے بلکہ کوئی شخص اپنی سکونت بدل دے اور دوسری دمِی میں جا بسے تو بھی وہ اسی دمِی کا باشندہ مانا جاتا تھا جس کی سرکاری فہرست میں اس کا نام مندرج ہوچکا ہے؛

یاد ہوگا کہ سولُن نے چارسو اراکین کی جو کونسل بنائی تھی اس کی بِنا قدیم آیونیانی قبایل پر تھی۔ کلیس تنیس نے اسکی بجائے اراکین کی تعداد ۵سو کردی اور اپنے دس نئے قبیلوں کے ۵۰۔۵۰ ارکان اس میں شامل کئے۔ ان کا تقرّر کُل قبیلہ کی طرف سے نہ ہوتا تھا بلکہ ہر دمِی اپنی آبادی کے تناسب سے دو دو چار چار رُکن مقرر کرتی تھی۔ یہ انتخاب قرعہ اندازی کی رو سے کیا جاتا مگر سابق کونسل کو حق حاصل

تھا کہ اپنے علیحدہ ہونے سے پہلے نئے اراکین میں کسی کو نا اہل دیکھے تو اس کا انتخاب مسترد کردے؛ منصب رکنیت پر سرفراز ہوتے وقت نئے اراکین حلف لیتے تھے کہ وہ "شہر کے حق میں بہتر سے بہتر مشورہ" دیا کرینگے۔ نیز میعاد رکنیت کے بعد، جب وہ علیحدہ ہوتے تھے جو کچھ اُنھوں نے کیا اس کا محاسبہ کیا جاسکتا تھا۔

یہ کونسل یا مجلسِ انتظامی، جس میں اٹیکا کے ہر حصّے کے لوگ شامل ہوتے تھے، ریاست کی سب سے اعلیٰ حکمران جماعت تھی۔ آرکن اور دیگر عمّال کا فرض تھا کہ وہ تمام حالات کی اطلاع اس مجلس کے سامنے پیش کریں اور اس کی ہدایات پر کاربند ہوں۔ سلطنت کے مداخل و مخارج پر عملاً اس مجلس کو اختیارِ کلّی حاصل تھا اور مال کے دس نئے (ہر قبیلے سے ایک) عہدہ دار جنھیں "اپودِ کتے" کہتے تھے، اس کے ماتحت کام کرتے تھے۔ امورِ عامّہ بلکہ امورِ جنگی کے متعلّق بھی یہ جماعت مجلسِ وزرا کے فرائض انجام دیتی تھی۔ ریاستہائے غیر سے مراسلت یا اُن کے سفیروں سے گفت و شنید بھی اسی مجلس کا کام تھا لہٰذا اسی کو وزارتِ خارجہ سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اعلانِ جنگ یا معاہداتِ صلح کا اس کو کوئی اختیار نہ تھا اور یہ حقِ شاہانہ صرف جمہور کی مجلسِ عام کو حاصل تھا؛ تاہم انتظامی اختیارات کے علاوہ مجلسِ انتظامی کو مشورہ دینے کا ضرور حق تھا اور وضعِ قوانین کی تحریک اسی کی طرف سے

ہوتی تھی۔ یعنی مجلسِ جمہور کے سامنے کوئی ایسا مسودہ قانون نہیں پیش ہوسکتا تھا جس کی خود مجلسِ انتظامی پہلے سے غور کرکے تحریک نہ کرے۔ چنانچہ ہر قانون پہلے مجلس انتظامی کی جانب سے "پروبُولیوما" (یعنی مسودۂ قانون) کی شکل میں پیش ہوتا تھا اور پھر مجلسِ جمہور کے اجماع سے منظوری پانے کے بعد "سِفیما" (یعنی قانون نافذالوقت) بن سکتا تھا۔ مزید برآں مجلس انتظامی کو عدالتی اختیارات بھی دئے گئے تھے اور مجلسِ عوام کی طرح وہ استغاثوں کی سماعت کرسکتی تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ پانسو اشخاص کی جماعتِ کثیر کا، انتظامی کاروبار کے لئے، برابر اجلاس کرتے رہنا نہایت دشوار تھا۔ پس سال کے ۳۶۰ دن کی دس حصّوں میں تقسیم کردی گئی تھی اور ہر قبیلے کے پچاس ارکان کی جماعت باری باری سے مجلس کے پورے انتظامی فرائض انجام دیتی تھی۔ جس قبیلے کے ارکان کی باری ہو اُس کو میعاد مقرّرہ (۳۶ دن) میں صدر سمجھا جاتا اور خود ارکان کی یہ جماعت اُس وقت تک کے واسطے "پری تانئیس" یعنی صدر نشین کہلاتی تھی۔ نیز سال کے (جس کے انھوں نے ۳۶۰ دن فرض کرلئے تھے) وہ دس حصّے جن میں باری باری ایک جماعت صدر نشین ہوتی۔ "پِری تانی" کہلاتے تھے۔

نئے قبیلوں کی وجہ سے فوجی تنظیم کو بھی بدلنا پڑا ہر قبیلہ ہزار پیادہ اور ایک دستہ سواروں کا بھرتی کرتا تھا اور

پیادوں پر دس سپہ سالار ہوتے تھے جنھیں لوگ کثرتِ رائے سے (فی قبیلہ ایک) منتخب کر لیتے تھے۔ یہ عہدہ آیندہ چل کر ریاست میں سب سے زیادہ با اثر بن گیا تھا لیکن ابتدا میں سپہ سالار محض قبیلے کی فوج کا سردار ہوتا تھا۔

کلیس تنیس نے مجلس انتظامی کو جس طرح ترتیب دیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونانی مدبّر نیابتی طریقِ حکومت کا اصول سمجھتے تھے کیونکہ یہ مجلس، ملکی نیابت کا نہایت عمدہ نمونہ تھی کہ اس کے ارکان ہر مقام سے رائے دہندوں کی تعداد کے لحاظ سے منتخب کئے جاتے تھے اور پھر عنانِ حکومت، عملاً اسی منتخب جماعت کے ہاتھ میں ہوتی تھی لیکن اس اصول کو سمجھنے کے باوجود یونانی مدبّروں کو تمام اختیارات ایسی منتخب جماعت کے حوالے کر دینے میں ہمیشہ پس و پیش ہوتا تھا۔ دوسرے ان کی شہری ریاستوں کے رقبے اس قدر کم تھے کہ اس قسم کی مجلس عام کا بنا لینا ممکن تھا جس میں، وہاں کا ہر باشندہ بلا دقّت شرکت کر سکے۔ لہٰذا اس بنیادی اصول پر لفظاً عمل ہو سکتا تھا کہ اپنی حکومت اور وضعِ قوانین کا اختیار صرف جمہور کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ اسی بات کو پیش نظر رکھکر ایتھنز میں مجلسِ انتظامی کو وضع قوانین کا اختیار نہ دیا گیا تھا۔ تاہم وضع قوانین میں اس کی شرکت ناگزیر تھی اور نہ صرف وہ قوم کی نائب تھی بلکہ اس کی (پچاس ارکان کی) جماعتیں بھی وہی

حیثیت رکھتی تھیں جو ہمارے زمانے میں اعلیٰ احکام یا "حکومت" (یعنی گورنمنٹ) کو حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ اُن کی نوعیت جُداگانہ اصُول پر مبنی تھی؛ بہرحال مجلس انتظامی کا وضع قوانین پر پورا اثر تھا اور اکثر اوقات مجلس جمہور اُن مسودات کو جو مجلس انتظامی کی طرف سے پیش ہوتے تھے، مِن وعن اسی رسمی طریق پر منظور کرلیتی تھی جس طرح کہ انگلستان میں بادشاہ پارلیمنٹ کے قوانین پر منظوری دے دیتے ہیں ؛

۶۔ جمہوریت کی پہلی فتوحات

جمہوریت کے میدان میں آتے ہی ایتھنز کو نہایت خطرناک نزل یہ پیش آئی کہ خود بادشاہِ کلیومنیس جس نے پہلے ایک جابر کو ہٹایا تھا اب دوسرے جابر کو اُس کی جگہ بٹھانے کے درپے ہوگیا۔ چنانچہ الیساگوراس کی امداد کی غرض سے، جو اپنے وطن میں شخصی بادشاہی حاصل کرنے کا آرزو مند تھا، کلیومنیس نے بیوشیہ اور چالکیس کو ساتھ ملایا اور وقتِ واحد میں تین جانب سے ایٹی کا پر حملہ کرنے کا منصوبہ سونچا تھا۔ لیکن جب اسپارٹہ کے دونوں بادشاہ کلیومنیس اور دماراتوس، اپنے تمام حلیفوں کی فوج لئے ہوئے خاکنائے کورنتھ سے آگے بڑھے اور ایٹی کا کے قصبے الیوسیس پر قابض ہوگئے تو کورنتھ والوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس مہم پر لعنت بھیج کے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ (۵۰۶ ق م)

اِدہر اسپارٹہ کے دونوں بادشاہوں میں اَن بن ہوگئی اور اُس نے فوج کو ایسا بے ترتیب کیا کہ انجام کار وہ سب منتشر ہوگئی۔ کلیومنیس کو اور ایک دفعہ ذلّت و ناکامی ہوئی اور ایتھنز دوسری مرتبہ پھر اسپارٹہ کے جبر و تشدّد سے بچ گیا ۔

ادہر بیوشیہ کی سربرآوردہ ریاست تھبز، بڑی خوشی سے اس کام میں اسپارٹہ کے ساتھ ہوگئی تھی۔ مگر قصبۂ پلاٹیہ جو بیوشیہ کی جانب کوہ سِتھی رُن کی ڈھلانوں پر واقع تھا، اپنے علاقہ والوں سے الگ رہا اور اُس نے ایتھنز کے دامنِ حمایت میں آنے کی آرزو کی ۵۱۰ق م یہ گویا اُن دوستانہ روابط کی ابتدا تھی جو عرصۂ دراز تک ان دونوں شہروں میں قایم رہے۔ بہر حال جب کلیومنیس کی فوج ازخود واپس ہوگئی تو ایتھنز کی سپاہ ادہر سے مطمئن ہوکر بیوشیہ اور چالکیس والوں کو روکنے پر متوجّہ ہوئی۔ کیونکہ اہل بیوشیہ کوہ سِتھی رُن کے دَروں کو اور چالکیس والے یوری پوس ندّی کو عبور کر آئے تھے اور بیوشی سپاہ اُن سے مِل جانے کے لئے اٹّی کا میں آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن ایتھنزی فوجوں نے انھیں راستے ہی میں روک لیا اور کامل شکست دے کر چالکیس والوں کی طرف پلٹ پڑے اور ان کا آبنائے کے پار تک پیچھا نہ چھوڑا بلکہ آبنائے کو اُتر کے اہل چالکیس پر ایک اور دوٹوک فتح

ایسی حاصل کی کہ اُن کے دشمنون کو مجبوراً للانتی میدان فتحمندوں کے حوالہ کرنا پڑا - اس میدان کے سب سے زرخیز حصے کو، بہ قطعاتِ مساوی دو ہزار ایتھنزیوں پر تقسیم کردیا گیا جو ایٹی کا سے اُٹھ کر یہان (علاقہ یوبیہ میں) آبسے اور اس طرح "جمہور" نے نہ صرف اپنی مدافعت کی بلکہ کچھ اور علاقہ بھی فتح کرلیا ۔ (۵۰۶ سنہ ق م)

باب ششم

ایران کی پیش قدمی ایجین کی طرف،

۱- ایران کا عروج اور دولتِ لدیہ کا خاتمہ

ادھر یونانی تو اپنے سمندروں میں گشت لگا رہے تھے اور اپنی شہری ریاستوں میں آئینِ عدل و حرّیت کی تکمیل و تہذیب میں مصروف تھے، اور اُدھر مشرق میں بڑی بڑی مطلق العنان سلطنتیں بگڑ رہی اور بن رہی تھیں، ساتویں صدی (ق م) میں اشور (اسیریہ) کی طاقتور سلطنت زوال کی آخری منزلیں طے کر رہی تھی اور جس قوت سے مغلوب ہونا اس کی قسمت میں لکھا تھا، وہ اب اُوپر اُبھر رہی تھی، سلطنت اشور کا یہ چراغ گل کرنے والے مِدّ اور ایرانی

لوگ تھے جو یونانیوں کی طرح ایک آریا زبان بولتے تھے مگر تاریخ یونان کی سب سے وقیع دو صدیوں میں یونانیوں سے مقابلے کے لئے بھی قضا و قدر نے انہی کو منتخب کیا تھا۔

آٹھویں صدی (ق م) کے اواخر میں اشور کی حکومت سے اہل مدیہ (مادہ) نے انحراف کیا اور دیئوسیس (دتوس[لہ]) کی قیادت میں لڑکر مدیہ (موجودہ عراقِ عجم) کو آزاد کرلیا۔ اور قوم نے خود اپنی مرضی سے اپنے اسی محسن کو بادشاہ منتخب کیا۔ اور اس نے اک بتانا (موجودہ ہمدان) کے شہر عظیم کی تعمیر سے ملکی اتحاد کی یادگار قایم کردی۔ (قیاساً ۶۵۰ تا ۶۲۵ ق م) اس کے جانشینوں میں فریبرز نے جنوب میں ایران کی سرزمین فتح کی اور اس طرح نسل آریا کی ایک سلطنت، اشور و بابل کے ہمسائے میں، بحیرۂ خزر سے خلیج فارس کے کناروں تک پھیل گئی۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ خود اشور کی فتح، تھا اور اس غرض کے لئے فریبرز کے جانشین سیاگزار (سیاوش) نے دولت بابل سے پیمان اتحاد باندھا۔ چنانچہ وہ سلطنت ان فتحمند اتحادیوں نے باہم تقسیم کرلی۔ اس طرح کہ حدودِ مصر تک جنوب مغربی علاقہ بابل کے قبضے میں آگیا اور خاص اشور اور ایشیاءِ کوچک تک اس کے شمال مغربی علاقے مدیہ میں منضم ہوگئے۔ (۶۰۶ ق م)

اب دولت مدیہ کی نظر کشور کشائی، لدیہ کی طرف تھی۔

لہ۔ ان قدیم ایرانی ناموں کی تحقیقات کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ یونان قدیم" ضمیمہ ۱ مولفہ مترجم۔

تھوڑے ہی دن میں اعلانِ جنگ کا بھی حیلہ مل گیا لڑائی شروع ہوئی اور اسی کے سلسلے میں چھٹے سال ایک مرتبہ میدانِ رزم گرم تھا کہ دفعتہً دن چھپ گیا اور تاریکی چھاگئی سورج کے اس طرح تیرہ و کثیف ہوجانے سے فریقین کے دلوں پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ انھوں نے ہتیار رکھ دئے اور باہم صلح کرلی۔ حقیقت میں یہ وہ کسوفِ شمسی تھا جس کے وقوع میں آنے کی مغربی اہلِ علم نے پیشین گوئی کردی تھی (۲۸ مئی ۵۸۵ ق م) یعنی حکیم طالیس ملطی جو یونانی اور اس لئے مغربی حکمت و فلسفہ کا مورثِ اعلیٰ ہے، اور جس نے ہیئت کی تعلیم مصر میں حاصل کی تھی، پیش از پیش اہل آیونیہ (آئی اونیہ) کو خبردار کرچکا تھا کہ فلاں سال کے ختم ہونے سے پہلے سورج ضرور گہنائیگا۔

لدیہ کے بادشاہ الیاتیس نے اپنی بیٹی مدیہ کے نئے بادشاہ استیاژ (افراسیاب) سے منسوب کردی تھی اور اس طرح کچھ عرصے کے لئے اپنی مملکت کو محفوظ کرلیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ یہی مہلت لدیہ کی تاریخ میں اُس کے عروج کا زمانہ تھی۔ کیمری حملے سے نجات ملتے ہی وہاں کے بادشاہ اردیس نے اپنے پیش رو کی سعی کو تازہ کیا اور پھر یونانی شہروں کے فتح کی کوشش شروع کی تھی جسے اس کے جانشینوں نے جاری رکھا تھا اور انھی میں شاہ الیاتیس بھی شہر ملطہ سے ایک طویل و صبر

آزما جنگ کرتا رہا تھا۔ لیکن ان ایشیائی یونانیوں کو مطیع کرنے کا منصوبہ، الیاتیس کے بیٹے شاہ کری سُوس (کریسس) کے ہاتھوں پُورا ہونا تھا (۵۶۰ تا ۵۴۶ ق م) اور اسی نے حملے کرکر کے یکے بعد دیگرے تمام آیونیائی اور ایولیائی شہروں کو تسخیر کیا۔ بجز ملطہ کے، جس سے اُس کا باپ صلح کا عہد کرچکا تھا۔ کری سوس نے عہد نامے کی خلاف ورزی نہ کی اور اہل ملطہ نے بھی اس کے عوض، اپنے یونانی بھائی بندوں کو مدد دینے سے احتراز کیا! اس کے بعد علاقہ کاریہ کی ڈوریائی ریاستیں بھی جبراً باج گزار بنائی گئیں اور اب کری سوس کی وسیع سلطنت بحیرہ ایجین سے دریائے ہالیس (موجودہ ترکی نام قزل۔ارماق) تک وسیع ہوگئی۔ اسی زمانے میں یونانی زبان لدیہ میں پھیلی۔ یونانی اصنام کی وہاں پرستش ہونے لگی اور یونانی مندروں میں استخارہ کیا جانے لگا۔ انہی وجوہ سے یونانیوں نے لدیہ والوں کو بالکل غیر کبھی نہ سمجھا۔ بلکہ شاہ کری سوس کے ساتھ تو اُنہیں کچھ عجیب اُنس اور خصوصیت پیدا ہوگئی تھی اور وہ اس کے معاملے میں بڑی دوستانہ روا داری سے کام لیتے تھے حالانکہ ایشیائی یونان کو غلامی کی زنجیریں اُسی نے پہنائی تھیں اور وہی ایک مطلق العنان جابر بن کر اُن پر حکمرانی کرتا تھا! لدیہ کے پہلے بادشاہ گیجیس کے خزانوں پر آیونیہ والے بہت اچنبھا کیا کرتے تھے مگر اب کری سوس

کی بے شمار دولت انکے ہاں ضرب المثل ہوگئی۔ جو بیش بہا تحائف کریسوس نے دِلفی کے مندر پر چڑھائے تھے خود وہی اس قدر قیمتی تھے کہ وہاں کے حریص پجاریوں نے خواب میں بھی نہ دیکھے ہونگے۔ لیکن اسی واقعے سے ایک صریحی ثبوت اس بات کا ملتا ہے کہ اُس زمانے میں دِلفی کے الہامات نے کس قدر سیاسی وقعت حاصل کرلی تھی ٭

اپنی سلطنت کے دامن ساحل تک پھیلانے کے بعد کریسوس کے دِل میں جزیروں کی تسخیر اور لِدیہ کو بحری قوت بنانے کا خیال پیدا ہوا لیکن ابھی اس کو عمل میں میں لانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک نہایت اہم واقعے نے اس کی توجّہ کو اپنی طرف پھیر لیا۔ یعنی انہی دنوں اسکے برادر نسبتی استیاژ (افراسیاب) کو ایک ایرانی سُوربیر نے تخت سے اُٹھاکر پھینک دیا اور مدیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ غاصب سلطنت جس کا نام، دُنیا کے سب سے بڑے فاتحین میں شامِل ہونا، مقدّر تھا ایرانی خاندانِ ہنجامنش (اکی منیئین) کارکن رکین سیروس الاعظم (یعنی شاہ کے خسرو) تھا ٭

استیاژ کے زوال دولت سے لدِیہ کے حریص تاجدار کو ایک حیلہ مل گیا کہ مشرق میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ مستقبل کے چھپے ہوئے اسرار کی تہ تک پہنچنے کے شوق

میں اُس نے دِلفی کی طرف رجوع کیا اور کہتے ہیں کہ وہاں سے یہ جواب ملا کہ اگر وہ ہالیس کو عبور کرجائے تو ایک بڑی سلطنت کو برباد کردے گا! پھر، فوج آراستہ کر کے، جس میں ایشیائی یونانیوں کی بھی ایک جمعیت شامِل تھی، کریسوس نے (گویا مشیّت الٰہی سے) ہالیس کو عبوُر کرلیا اور کپادوسیہ پر حملہ آور ہوا - لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سیروس کے لشکر کی تعداد کہیں زیادہ تھی - کریسوس کو لِدیہ میں ہٹنا پڑا اور یہیں خاص پایہ تخت کے سامنے ایرانی حملہ آوروں نے اُسے کامِل شکست دی - اور چند روز کے محاصرے کے بعد خود پایہ تخت سارولیس کو ہلّہ کر کے تسخیر و تاراج کردیا؛ مگر کریسوس کی جان بچ گئی (۵۴۶ ق م)۔

یونانیوں کو اس بات کا بہت اعتقاد تھا کہ جو شخص حد سے زیادہ عیش و ثروت کے نشہ میں سرشار ہوتا ہے اس پر حاسد دیوتا اپنا قہر نازل کئے بغیر نہیں رہتے۔ کریسوس کی تقدیر میں جو انقلاب ہوا وہ اس عقیدے کی ایسی تصدیق تھی کہ اُس جیسی بیّن مثال انہوں نے کبھی نہ دیکھی تھی - اور اسی لئے اُس کی یاد میں یونان نے اپنے ملکۂ فطری سے جیسا کام لیا اور کسی شخص یا واقعے کی نسبت نہ لیا تھا- کیونکہ حقیقت میں کسی تاریخی واقعے کو ایسی کہانیوں میں گوندھ لینا جن سے انسانی زندگی کے متعلق نہایت عبرتناک و پُر اثر سبق حاصل ہوں، یونان والوں کو خوب آتا تھا۔

کریسوس کی نسبت یہ کہانی ہیروڈوٹس نے یوں بیان کی ہے کہ سیروس نے ایک اونچی چتا بنوائی اور چودہ اور لڑکوں سمیت کریسوس کو زنجیروں میں باندھ کر اُس پر کھڑا کرایا۔ اور اس حالت میں جب کہ سوائے موت کے اور کوئی چیز اُسے نہ دکھائی دیتی تھی، کریسوس کو سولن کا وہ قول یاد آیا جو ایک مرتبہ اس نے لدیہ کے اس بد نصیب بادشاہ سے کہا تھا کہ "جب تک کسی شخص کی زندگی باقی ہے، اُسے بامراد نہیں کہ سکتے" اور یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب کہ سولن اثنائے سیاحت میں ساردیس آیا[1] اور کریسوس نے اپنے بادشاہی خزانے اور سامان عظمت و ثروت دکھاکر اس سے سوال کیا تھا کہ تیرے نزدیک دُنیا میں سب سے بامراد شخص کون ہے۔ سولن نے جواب میں بعض گمنام اور مرے ہوئے یونانیوں کا نام لے دیا اور جب کریسوس اپنی حیرت اور ناخوشی کو ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا اور چلاّیا کہ "اے ایتھنز کے پردیسی، کیا تیرے نزدیک ہماری ثروت و بادشاہی ایسی حقیر ہے کہ تو معمولی آدمیوں کو میرے مقابلے میں پیش کرتا ہے؟" تو اس یونانی حکیم نے دُنیوی سازو سامان کی بے اعتباری اور دیوتاوں کی حاسدانہ دراندازی پر تقریر کی اور مذکورہ بالا الفاظ کہے تھے۔ غرض وہی تمام

---

[1] واضح رہے کہ صنعتِ افسانہ باقی میں واقعات کی نسبت زمانی کا لحاظ چنداں ضروری نہ سمجھا جاتا تھا۔ ۱۲

واقعہ اب کرلیوس کو چتا پر یاد آیا اور بے اختیار آہ کا نعرہ اور تین مرتبہ سولنؔ کا نام اس کے منہ سے نکلا! سیروس نے بھی یہ آواز سُنی اور ترجمان کو بلاکر دریافت کرایا کہ وہ کسے پکار رہا ہے۔ تھوڑی دیر تک کریسوس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکل سکی مگر پھر اُس نے جواب دیا "میں ایک ایسے شخص کو پکار رہا ہوں جو کاش تمام خود پرست بادشاہوں سے ملتا اور باتیں کرتا" آخر میں جب اور اصرار ہوا تو کریسوس نے سولنؔ دانا کا نام اور قول دہرایا۔ اور ہرچند چتا میں آگ دے دی گئی تھی لیکن سیروسؔ کو اپنے قیدی کا یہ بیان سُنکر بڑی عبرت ہوئی کہ آخر میں بھی انسان ہوں! اُس نے حکم دے دیا کہ آگ بُجھادی جائے اور قیدی آزاد کردئیے جائیں۔ مگر اب آگ بھڑک بھڑک کر اُس کی لپٹ ایسی اُونچی اُوٹھ رہی تھی کہ لوگ بجھا نہ سکے اور کریسوس نے اپالو کو مدد کے لئے پکارا چنانچہ گو مطلع صاف تھا مگر دیوتا نے بادل بھیج کر اس زور سے مینہ برسایا کہ آگ بُجھ گئی ۔

یہ ہے وہ افسانہ جسے ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے اور اس کی تہ میں اصلی نکتہ صاف صاف یہ نظر آتا ہے کہ " دلفی کے مندر پر نیاز چڑھاو"۔ اور اس میں شاید ہی کسی کو شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ تمام قصہ دلفی کی عقیدت کے جوش میں بنالیا گیا تھا ۔

۲- ایشیائی یونان کی تسخیر؛ پولی کراتیس باشندۂ سیامیوس

لِدیہ کی باڑ بیچ میں سے ہٹتے ہی، تاریخ یونان کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ایشیا کے یونانیوں کو خداوند سارڈیس کی بجائے اب اُس شہنشاہ کا طوقِ غلامی گردن میں ڈالنا ہے جس کا دربار سوس میں لگتا ہے یعنی اتنی دُور کے شہر میں کہ جس کی مسافت کا حساب مہینوں کے سفر سے کیا جاتا تھا۔ خود دارائے ایران مجبور تھا کہ ایشیائے کوچک کے نئے مقبوضات اپنے "ست راپ" یعنی والیوں کے حوالے کرجائے۔ اور اس لئے یونانی اپنے فرمانروا کے مزاج میں کوئی درخور حاصل نہ کرسکتے تھے۔ کیونکہ یہ صورت اسی وقت ممکن تھی جب کہ اس کا پایۂ تخت سارڈیس یا اور کسی قریبی شہر میں ہوتا۔ بہر تقدیر، وہ بہ آسانی ایرانیوں کا شکار ہوگئے۔ سیروس کے سپہ سالار ہرپاگوس نے ایک ایک کرکے سب یونانی شہروں کو فتح کرلیا اور خراج کے علاوہ بوقت ضرورت ایرانی فوجوں میں بھرتی ہونے کا بھی اُن سے وعدہ لے لیا گیا۔ لیکن اُن کی آزادیٔ تجارت پر کسی قسم کی قیود نہ عائد کی گئیں۔

خود لِدیہ کا فاتح، بابل کی طاقتور سلطنت فتح کرنے، مشرق کی طرف پلٹ گیا تھا لیکن اس کی یہ فتوحات ہماری تاریخ کے دایرے سے باہر ہیں۔ اس کی آخری فوج

کشی مساگتی پر تھی جو سیتھی (یا ترکمانی) نسل میں، جھیل ارال کے قریب بسنے والی قوم تھی۔ اور ایک حکایت میں بیان کیا گیا ہے کہ انہی کے ساتھ جنگ میں یہ ایرانی فاتح مارا گیا اور اُس قوم کی وحشی ملکہ نے اس کا سر منگا کے خون کے طاس میں رکھا۔ (قیاساً سنہ ۵۳۰ ق م)

ہرچند بعض اطراف میں سیروس کی حکومت اشور کی حدود سلطنت سے کہیں آگے بڑھ گئی تھی لیکن جنوب مغرب کی طرف ایک بڑی قلمرو (مصر) اس سے چھٹی رہ گئی تھی جو کسی زمانے میں اشور کا علاقہ تھی۔ سو اس کی تلافی اس کے بیٹے کامبیز (کے کاوس) کے وقت میں ہوگئی۔ اور جب مصر فتح ہوکر ایران کی ایک "دوست راپی" (یعنی ولایت یا صوبہ) بن گیا تو سرنہ کے یونانی بھی حلقۂ اطاعت میں آگئے۔

ایرانی خطرے کے وقت اماسس شاہ مصر اور اس کے بیٹے کو اگر کسی پر مدد کا بھروسہ ہوسکتا تھا تو شاید وہ ان کا طاقتور یونانی دوست حاکمِ ساموس تھا۔ اس جزیرے میں، ایرانیوں کی تسخیر آیونیہ کے چند ہی روز بعد، پولی کراتیس نامی ایک شخص نے حکومتِ جابرہ یعنی شخصی بادشاہی کی بنیاد ڈالی تھی اور سو جنگی جہازوں کا بیڑا ترتیب دے کر ساموس کو نہایت قوی ریاست بنا دیا تھا۔ اور آیونیہ کے محکوم ہوجانے کے بعد سے غالباً بحیرۂ ایجین میں کوئی

یونانی ریاست اس کے برابر بحری قوت نہ رکھتی تھی؛ اسکے پُر تجمل دربار کی زینت کو اناک رِیُن جیسا شاعر دو بالا کرتا تھا۔ اور وہ قسمت کا ایسا دھنی تھا کہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا کامیاب ہوتا تھا۔ دولتِ ایران کا اُسے ذرا خوف نہ تھا۔ خود ایرانیوں کے محکوم آیونی شہروں میں وہ اپنا نفوذ بڑھاتا تھا اور شاید اس تمام علاقے پر اسے قابض ہوجانے کی اُمید ہوچلی تھی؛ اُس کا ایران کے خلاف اماسِس شاہ مصر سے ایکا کرلینا بالکل قدرتی بات تھی کیونکہ ایران اِن دونوں کا دشمن تھا؛ لیکن جس وقت کامبیز مصر پر بڑھا تو ساموسی جابر نے سمجھا کہ اُس کا بیڑا فنیقیہ اور قبرس کی متحدہ قوت بحری کا جو ایران کے ساتھ تھی کسی طرح مقابلہ نہیں کرسکتا۔ پس اپنے مصری دوست کی مدد کو پہنچنے کی بجائے اُس نے چالیس جنگی جہاز خود ایرانی حملہ آوروں کے پاس روانہ کئے کہ تسخیر مصر میں اُن سے مدد لی جاے؛ لیکن یہ جہاز مَصر تک نہ پہنچے کیونکہ ان میں جو بحری سپاہی پولی کراتیس نے روانہ کئے تھے وہ خاص ایسے لوگ تھے جن سے وہ اس بنا پر بدظن تھا کہ یہ مجھسے اور میری شخصی بادشاہی سے بیزار ہیں۔ مصر بھیج کر اُس نے انہیں وطن سے دفع کرنا چاہا تھا لیکن یہ داؤں اُلٹا پڑا اور سپاہیوں نے ملکر ارادہ کرلیا کہ واپس ساموس جائیں اور اس جابر کو سرنگوں کردیں؛ چنانچہ وہ آئے اور جنگ میں شکست کھائی

تو اسپارٹہ سے مدد مانگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسپارٹہ نے اتنی دور مشرق میں کوئی مہم روانہ کی اور ساموس کا محاصرہ کرنے کی غرض سے فوج بھیجی۔ مگر اس میں انہیں بھی ناکامی ہوئی۔ لڑائی میں وہ پسپا کردئیے گئے اور تسخیر شہر سے مایوس ہوکر اپنے وطن کو واپس چلے آئے۔

پولی کراتیس کا ایک قصّہ بہت مشہور ہے کہ جب اماسس نے اپنے دوست کے نصیبے کی یاوری کا حال سنا تو اُسے خط میں لکھّا کہ آسمان کے حسد سے بچنے کے لئے تمہیں جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہو اُسے اس طرح تلف کردو کہ دُنیا میں اس کا وجود باقی نہ رہے۔ پولی کراتیس کشتی میں بیٹھ گیا اور ایک زمرّد کا چھلّہ جسے کسی مشہور کاریگر نے تراشا تھا، اُس نے سمندر میں پھینک دیا؛ لیکن چندہی روز گزرے تھے کہ ایک ماہی گیر بادشاہ کے واسطے بہت بڑی مچھلی نذر دینے لایا اور جب اُسے صاف کیا گیا تو اُس کے پیٹ میں سے وہی زمرّد کا چھلّہ نکلا۔ یہ قصہ پولی کراتیس نے اماسس کو لکھّا اور اماسس کو یقین ہوگیا کہ اُس کا انجام ضرور بُرا ہوگا چنانچہ اُس نے پولی کراتیس سے قطع تعلق کرلیا؛ اور واقعی، اسپارٹہ والوں کو پسپا کرنے کے چندہی روز بعد، پولی کراتیس سارڈیس کے ایرانی والی کے جال میں پھنسا اور گرفتار ہوکر سُولی پر لٹکا دیا گیا۔ (قیاساً ۵۲۲ق م)

۳- اوائلِ عہدِ داریوش تھریس کی فتح

شاہِ کامبیز ایک غاصب کی سرکوبی کے لئے مصر سے واپس آیا تھا مگر جیسا کہ کوہِ بے ستون کے مشہور کتابے میں منقول ہے اُسے "اپنے ہاتھوں موت آئی" (سنہ ۵۲۲ ق م)۔ تختِ ایران کا وارث ہیستاسپیس (گشتاسب) نامی ایک شخص تھا اور داریوش[1] اُس کا بیٹا تھا ہستاسپیس نے اپنا حق حاصل کرنے کی کوئی سعی نہ کی مگر داریوش کے خیالات باپ جیسے نہ تھے۔ اُس نے چھ امیروں سے ساز باز کیا اور غاصب کو مارکر خود بادشاہ بن گیا؛ تمام مزاحمتوں کو دفع کرنے اور اپنی قوّت کو مضبوطی سے جما لینے کے بعد داریوش نے آیندہ نسلوں کے لئے اپنی فتوحاتِ سالِ اوّل بے ستون کی ایک بلند چٹان پر کندہ کرائیں جو کہ رودِ گورش (کوس پیس) کی بالائی گزرگاہ پر واقع ہے ؀

داریوش نے اپنی کل سلطنت کو بیس ولایتوں یا ست راپیوں میں تقسیم کیا۔ دریائے ہالیس کے مغرب میں لِڈیہ کی سابقہ سلطنت کی تین ولایتیں تھیں مگر والی دو رہتے تھے۔یعنی آیونیہ اور لِڈیہ ایک والی کے ماتحت تھے جس کا مستقر ساردیس تھا۔ اور ولایتِ افروجیہ، جس

---

[1] داریوش یا دارائے اکبر سے مراد اسپندیار ہے ؀ مترجم

میں ساحل مرمورہ کی یونانی بستیاں بھی شامل تھیں، ایک
والی کے ماتحت تھا اور اس کا مستقر شہر داسی لیئن تھا۔
ہر یونانی شہر پر ایک مطلق العنان امیر فرمانروائی کرتا تھا اور
جب تک وہ خراج پابندی سے ادا کرتا رہے نیز بوقت
ضرورت امدادی فوج مہیّا کرنے میں سستی نہ کرے، اسوقت
تک خود اپنے گھر میں جو جی چاہے کرے، ایرانی والی اس
کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیتے تھے۔ داریوش
نے سکّے کے متعلق جو اصلاحیں کیں اُن سے تجارت نے
رونق پائی تھی اور یونان میں سب سے بڑی ایرانی اشرفی
اسی بادشاہ کے نام پر ہمیشہ "داریک" کہلاتی تھی۔

بحیرۂ روم (یا بحر متوسط) کے مشرقی ساحل سیروس
نے فتح کئے تھے اور کامبیز نے تسخیر مصر سے گویا ان فتوحات
کی، جنوب میں، تکمیل اور استحفاظ کا کام انجام دیا تھا۔
تھریس (یا تراکیہ) کے تسلّط سے، جانب شمال ان مقبوضات
کو اور مضبوط و مکمّل کرنا داریوش کا حصّہ تھا۔ تھریس کے
باشندے جنگ جُو تھے اور یہ سرزمین بھی کوہستانی ہے لہٰذا
ایرانیوں کو حصولِ مقصد کے لئے کثیر فوج اور بڑی احتیاط درکار
تھی۔ ساموس کے ایک کاریگر نے، بای زنطہ کے شمال
میں آبنائے باسفورس پر کشتیوں کا پُل باندھنے کی خدمت
انجام دی اور اس پر سے ایرانی انبوہ آبنائے کو عبور کر آیا
(قیاساً ۵۱۲ ق م) شمال کی طرف ساحل ساحل دریائے

دان یوب کے دہانے تک بڑھنے اور کمک پہنچانے کی غرض سے ایران کے آیونی مقبوضات نے ایک بیڑا فراہم کردیا تھا۔ اور ہر یونانی شہر کا امدادی دستہ خود وہاں کے مطلق العنان حاکم کی ماتحتی میں اس کے ہمرکاب تھا اور ان میں مِلَطہ کا حاکم ہستائیوس اور خرسونیس کا مِل تیادیس سب سے ممتاز تھے۔

تھریس میں جو لڑائیاں ہوئیں اُن کی کوئی تفصیل ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ دان یوب کے شمال میں جہاں اب ولاشیا اور ملداویا کے صوبے ہیں، جو قومیں آباد تھیں انہیں بھی یونانی سیتھی (اسکیث) کہہ دیتے تھے اور یہی نام اُن کے ہاں عام طور پر تمام ان اقوام کے لئے مروج تھا جو کوہستانی کارپیتھیئن اور قفقاز کے درمیان آباد تھیں، بہر حال یونانی بیڑا دان یوب کے دہانے تک آپہنچا تھا اور اس دریا پر کشتیوں کا پُل تیار کردیا گیا تھا جس پر سے داریوش کی فوج سی تھیہ میں داخل ہوئی۔ لیکن اس فوج کشی کی غایت اور داریوش نے دُنیا کے اس بعید گوشے میں جو کام کیا، یہ سب افسانوں کی گھٹا میں چھپ گئے ہیں، اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بیڑے سے، جو اُس کی واپسی کا یہاں منتظر تھا کچھ عرصے کے لئے اُس کا سلسلۂ رسل و رسایل منقطع ہوگیا تھا اور یونانی سرداروں کے جی میں آئی تھی کہ اُسے یہیں بلا میں گرفتار چھوڑ کے

چل دیجے! لیکن حق یہ ہے کہ اُس قوت کو ضرر پہنچانا جس کی بدولت ان کی شخصی حکومت اپنے شہروں میں برقرار تھی، خود یونانی روسا کی اغراض کے منافی تھا۔ غرض داریوش آبنائے دردانیال کے پار ایشیا میں واپس آگیا اور مگا بازو کی ماتحتی میں فوج کو اُس نے وہیں چھوڑ دیا۔ مگا بازو نے تھریس کو فتح کیا اور حقیقی طور پر دریا سے ستریمُن تک ورنہ مغرب میں برائے نام اور آگے تک یہ علاقہ دولت ایران کے زیر نگین آگیا۔ کیونکہ ستریمُن کے پار رودِ اکسیوس تک جو یونانی لوگ آباد تھے وہ مفتوح ہوگئے تھے اور مقدونیہ نے بھی شاہِ شاہان کی اطاعت قبول کرلی تھی +

غرض دیکھا جائے تو داریوش کی اس مہم کے کامیاب ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے حالات نہایت مُبالغہ آمیز پیرائے اور مسخ صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ ہیروڈوٹس فتح تھریس کی بجائے، داریوش کے اس مجنونانہ ارادے کو مہم کی اصلی غرض بتاتا ہے کہ وہ جنوبی رُوس کے صحرائی علاقے کو سلطنت ایران کی قلمرو میں داخل کرنا چاہتا تھا اور سی تھیہ والوں نے جو سَو برس پہلے مِدیہ پر حملہ کیا تھا اس کا بدلہ لینا ایرانیوں کا مقصود تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہیروڈوٹس کے قول کی بموجب خود داریوش نے پُل کو تڑوانے اور جہازوں کو واپس بھجوا دینے کا

قصد کیا تھا مگر ایک دور اندیش یونانی کی صلاح سے اپنا یہ ارادہ بدلا۔ پھر اُس نے یونانی سرداروں کو ایک رسّی دی جس میں ساٹھ گرہیں لگادیں اور اُن سے کہدیا کہ وہ ہر روز ایک گرہ کھولتے رہو اور جب تک یہ سب نہ کھُل جائیں، یہاں رہ کر پُل کی حفاظت کرو۔ اگر اس وقت کے گزرنے کے بعد بھی میں واپس نہ آوں، تو تم واپس چلے جانا،، اس قرارداد کے مطابق آیونیہ کے جہاز وقتِ معیّنہ کے بعد بھی اس کا انتظار کررہے تھے کہ اتنے میں اہل سی تھیہ کا ایک گروہ اُن کے پاس آیا اور اُن سے پُل توڑ دینے کی استدعا کی کہ پھر داریوش کی ہلاکت میں کوئی شبہ باقی نہ رہے اور وہ بھی اس کی غلامی سے بالکل آزاد ہوجائیں۔ مِل تیادیس نے اس تجویز کی تشدّد مد سے تائید کی لیکن اس کے خلاف ہستائیوس کی دلایل کارگر ثابت ہوئیں جس نے انہیں جتایا کہ یونانی مطلق العنانوں کی ساری قوّت ایران کے دم قدم سے ہے۔ غرض یہ ہستائیوس کا طفیل تھا کہ داریوش جو ذلیل و ناکام پسپا ہوا تھا، سلامت رہ گیا ورنہ اگر مِل تیادیس کی صلاح پر عمل ہوتا تو پھر شاید ایران کے آیندہ یونان پر حملہ کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آتی۔

یہ ہے وہ روایت، جس میں تعصّب کی تحریک سے یونانی تخیّل نے ایک معقول و کامیاب مہم کو اس درجے احمقانہ اور پُر مصائب فوج کشی کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

۴- آیونیہ کی بغاوت ایران سے

داریوش کی مراجعت کو بارہ برس گزر گئے۔ اور اس اثناء میں یورپ و ایشیا کی زور آزمائی کا کوئی سبب وقوع میں نہ آیا۔ لیکن اس کے بعد جزیرۂ نکسوس کی سیاسی کشمکش کا بالواسطہ نتیجہ، آیونیہ کی بغاوت ہوا جس میں ایتھنز اور بعض اور یونانی شہروں نے بھی حصّہ لیا اور یونان کے خلاف فوج کشی کرائی۔

ملطہ کے حاکم جابر ہستائیوس کو داریوش نے پایۂ تخت سوس میں بظاہر اس لئے روک رکھا تھا کہ بادشاہ کو اس کا جُدا ہونا گوارا نہیں۔ لیکن در اصل اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خطرناک شخص تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں ملطہ پر اس کا داماد ارستاگوراس حکومت کرتا تھا۔ اسی شخص کے پاس نکسوس کے بعض عمائدین پہنچے، (جنھیں جمہوریت پسندوں نے یورش کرکے جلاوطن کردیا تھا) اور پھر وہاں اپنی حکومتِ خواص بحال کرانے کی درخواست کی۔ ارستاگوراس، ساردیس گیا اور وہاں کے ایرانی والی آرتافرنز کو سمجھایا کہ ان لوگوں کو بحال کرنے کے بہانے پہلے نکسوس اور پھر تمام مجمع الجزایر (سای کلیڈیز) پر دولت ایران کا قبضہ ہوسکتا ہے۔ آرتافرنز نے بادشاہ کی منظوری لی اور دو سو ۲۰۰ جنگی جہازوں کا بیڑا ارستاگوراس اور ایرانی امیر البحر مگاباتیس کی ماتحتی میں نکسوس روانہ کیا (۴۹۹ ق م)

مگر ان دونوں سرداروں میں جھگڑا ہوگیا۔ مگاباتیس نے اہل نکسوس کو خطرے سے خبردار کردیا اور جزیرے والوں نے تیار ہوکر حملہ روک لیا۔ اس طرح ارستاگوراس کا منصوبہ خاک میں مل گیا اور اب ایرانیوں کو اپنے سے ناخوش دیکھکر اُس نے خود اُن کے خلاف آیونیہ میں بغاوت کرادینے کا تہیہ کرلیا۔ کہتے ہیں کہ اس کام پر اس کے خُسر ہستائیوس نے اُسے اُبھارا تھا اور ایک غلام کے سر پر خفیہ پیام چھاپ کر جو بالوں میں چُھپا ہوا تھا اس کے پاس بھیجا تھا۔ مگر یہ روایت مشکوک ہے۔ اس کے علاوہ ایک جابر کی حیثیت سے وہ یہ فساد نہیں پیا کرا سکتا تھا کیونکہ بغاوت کی بڑی وجہِ تحریک وہ دلی نفرت ہونی چاہئیے جو کہ یونانیوں کو استبداد یا شخصی بادشاہی سے تھی اور جس کا آیونیہ اور دیگر مقامات میں ایران حامی تھا۔ اسی لئے ارستاگوراس نے پہلے اپنی حکومتِ شخصی سے دست برداری کی اور دوسرے شہروں کے مطلق العنان جابر بھی (بیش تر بغیر کسی خوں ریزی کے) دفع کردئیے گئے۔

اس کارروائی کے بعد دوسرا کام یہ درپیش تھا کہ ایران کے خلاف آزاد یونانیوں کی مدد حاصل کی جائے۔ یہ سفارت بھی ارستاگوراس نے اپنے ذمہ لی اور پہلے اسپارٹہ گیا۔ جہاں بعد میں اس کی سفارت کے متعلق یہ دلچسپ کہانی مشہور ہوگئی تھی کہ وہ شاہِ کلیومنیس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُسے دنیا کا نقشہ دکھایا جو کانسی پر کھُدا ہوا تھا اور اس میں تمام

ممالک، دریا اور سمندر جن کا اس وقت تک علم تھا موجود تھے کلیومنیس نے پہلے کبھی نقشہ نہ دیکھا تھا اور چالاک ارستاگوراس کو ایک چھوٹا سا نقشہ دکھا کے، یہ بات اس کے دلنشین کرنی تھی کہ اسپارٹہ چاہے تو ساری سلطنت ایران کو فتح کرسکتا ہے کلیومنیس پر اثر ضرور پڑا مگر اس نے تین دن تک کوئی جواب نہ دیا اور پھر ارستاگوراس سے ایک مرتبہ پوچھا کہ آیونیہ سے پایۂ تخت سوس کا فاصلہ کس قدر ہے؟ وہ اس وقت بالکل خالی الذہن تھا۔ کہنے لگا "تین مہینے کا راستہ ہے" اور راستے کے حالات بیان کرنا چاہتا تھا جو بادشاہ نے اُسے وہیں روک دیا اور حکم دیا کہ "ملطہ کے پردیسی، تم سورج غروب ہونے سے پہلے اسپارٹہ سے چل دو"۔

مگر ایتھنز اور ارت ریا میں ملطہ کے پردیسی کی زیادہ قدر ہوئی۔ ان دونوں شہروں نے آیونیہ کی دست گیری کی اور ایتھنز نے ۲۰ جہاز مدد کے لئے بھیجے۔ اور یہی جہاز، ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ یونانی اور ملچھوں میں عداوت و مصیبت کا عنوان تھے۔

ایرانی فوجیں ملطہ کو محصور کرچکی تھیں جب کہ ارستاگوراس اپنے یونانی اتحادیوں کی کمک لے کر پہنچا اور ساردیس پر پیش قدمی کی (۴۹۸ق م)۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمن محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوجائے۔ اور گو یونانیوں نے شہر ساردیس لے لیا لیکن قلعے پہ اُن کا زور نہ چلا۔ اور وہ

وہیں تھے کہ شہر میں آگ لگی اور وہ جلکر خاکستر ہوگیا۔ اور یونانی فوج جلتے کھنڈر چھوڑکر ساحل کی طرف لوٹ رہی تھیں کہ افیسُوس کے قریب ایک ایرانی جمعیت کا سامنا ہوا اور یونانیوں نے شکست کھائی۔ ایتھنز والے وہاں سے سیدھے اپنے گھر چلے آئے اور آیونیہ کی بغاوت میں اُن کی شرکت یہیں ختم ہوگئی۔ لیکن سارڈیس کی آتش زنی اپنے عواقب کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوئی۔ نقل کرتے ہیں کہ جب داریوش سے بیان کیا گیا کہ سارڈیس کے جلانے میں ایتھنز والے بھی معاون تھے۔ تو اُس نے پوچھا "ایتھنز والے؟۔ وہ کون لوگ ہیں؟" پھر اُس نے تیر کمان منگایا اور ایک تیر ہوا میں چلاکر مراد مانی کہ خدا مجھے ایتھنز والوں کی سرکوبی کی توفیق عنایت کرے۔ نیز ایک غلام کو حکم دیا کہ وہ کھانے کے وقت روز تین دفعہ اُس سے کہدیا کرے کہ "خاوند، ایتھنز والوں کو یاد رکھئے گا"۔

آیونیہ کی بغاوت، جنوب میں کاریہ اور قبرس تک اور شمال میں بحیرہ مرمورہ تک پھیلی۔ قبرس کے کئی شہروں نے ایرانیوں کا طوقِ اطاعت اُتار پھینکا اور وہاں فنیقیہ کا ایک بیڑا فساد کے فرو کرنے میں مصروف تھا۔ دردانیال کے شہروں کو بھی اسی طرح دوبارہ مطیع و منقاد کرنا پڑا تھا؛ کاریہ میں باغیوں کو دو مرتبہ سخت ہزیمت ہوئی لیکن بعد میں انھوں نے بھی ایک ایرانی فوج کو تباہ کردیا تھا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ارستاگوراس بہت دنی الطبع شخص تھا اور

قدرت نے اسے اتنے بڑے کام کی سرگروہی کا اہل نہ بنایا تھا۔ ایران کو بغاوت میں کامیاب ہوتا دیکھکر اُسے حصول مدعا کی اُمید نہ رہی اور تھریس بھاگ آیا اور یہیں کسی شہر کا محاصرہ کرتے وقت مارا گیا۔ لیکن اُس کی موت کا بغاوت پر اتنا ہی اثر ہوا جتنا اُس کے خسر ہستائیوس کی موت کا۔ جو داریوش سے کہ سنکے فساد رفع کرنے کے لئے آیونیہ بھیجا گیا تھا مگر خیوس میں بھاگ آیا اور بحری قزاقی اختیار کی۔ آخر میں، پکڑا گیا اور آرتا فرنز نے اُسے سُولی دے دی۔

جنگ کا سب سے اہم اور فیصلہ کُن واقعہ ملطہ کا محاصرہ ہے، جس پر ایرانیوں نے رفتہ رفتہ اپنی تمام قوت لگادی تھی۔ سمندر کا راستہ چھ سو جہازوں نے روکا تھا جو اسی زمانے میں قبرس کو تسخیر کرکے لوٹے تھے۔ یونانی جہاز جزیرۂ لَید کے قریب لنگر انداز تھے اور ان کی تعداد (۳۵۵) بتائی گئی ہے لیکن اُن کی ترتیب درست نہ تھی اور جب لڑائی ہوئی تو لس بوس اور ساموس والوں نے دغا دی اور اثنائے جنگ میں ساتھ چھوڑکر چل دیے۔ خیوس کے لوگ بڑی پامردی سے لڑے مگر اُن کی تعداد قلیل تھی۔ غرض ہر طرف ناکامی ہوئی اور ملطہ کو ہلہ کرکے تسخیر کرلیا گیا (۴۹۴ ق م) یہاں مقامِ دیدیما پر اپالو دیوتا کا مندر جو دُنیائے یونان میں نہایت مشہور کہانت کا مقام سمجھا جاتا تھا، جَلادیا گیا۔

تسخیر ملطہ کی خبر سے ایتھنز کے لوگوں کو دلی رنج پہنچا تھا اور اس کا اظہار اس وقت ہوا جب وہاں کے ٹراجدی نویس شاعر

فری نی کوس نے ملطہ کی مصیبت کو ایک ڈراما کا موضوع بنایا؛ چنانچہ شاعر پر اس قصور کی سزا میں کہ اُس نے خود ہماری مصیبتیں یاد دلائیں، انھوں نے جرمانہ کردیا تھا۔

اسی زمانے میں ایرانیوں کا ایک علاقہ مفت میں ایتھنز سے منسوب ہوگیا اور بعد میں اُس کی دوامی مِلک بنا۔ یعنی خرسونیس کے جابر مل تیادیس نے جزائر لمنوس اور امبروس کو چھین لیا اور جب بغاوت میں کامیابی نہ ہوئی اور خرسونیس میں رہنا مخدوش نظر آیا، تو ایتھنز بھاگ آیا اور بیان کیا کہ وہ جزیرے مَیں نے ایتھنز کے واسطے فتح کئے تھے؛ چنانچہ گو، معلوم ہوتا ہے کچھ عرصے تک اُن پر ایرانیوں کا قبضہ رہا لیکن بعد میں وہ ایتھنز ہی کو مِل گئے۔

۵۔ داریوش کی دوسری اور تیسری چڑھائی یورپ پر۔ جنگِ میراتھان

بغاوت فرو کرنے کے بعد داریوش نے آیونیہ کے جتنے شہر تھے سب کے علاقوں کی پیمائش اور گرداوری کرائی اور اسی کے مطابق رقوم خراج مشخص کیں؛ اس فساد نے دولت ایران کو بتادیا تھا کہ آیونیہ میں شخصی حکومتیں قایم رکھنے کی تدبیر سے کام نہیں چلا۔ لہٰذا اب اس کے بالکل برعکس تجربۃً یہ حکمتِ عملی اختیار کی گئی کہ مطلق العنان حاکموں کو ہٹاکر اُن کی بجائے جمہوری حکومتیں بنادی گئیں اور اس میں یونانی طبایع کی جو رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی وہ بے شبہ داریوش کی لایق تعریف دانائی پر دال ہے۔

تھریس اور مقدونیہ میں دولت ایران کا اقتدار دوبارہ منوادینے کی غرض سے بادشاہ کا داماد مَردونیوس[1] بھیجا گیا تھا اور مقدونیہ کے راستے اُس نے یونان پر فوج کشی کی تجویز کی تھی کہ اُن شہروں کو سزا دے جو آیونی باغیوں کے معاون ہوگئے تھے؛ ایرانی بیڑے نے ساحل ساحل بڑھکر جزیرہ تھاسوس کو فتح کرلیا تھا۔ اُدھر تھریس بھی مسخر ہوگیا اور مقدونیہ نے جس پر اُن دنوں شاہِ الِکزنڈر[2] حکمراں تھا اطاعت قبول کرلی۔ (۴۹۲ ق م)۔ لیکن یہ مہم منزل مقصود تک نہ پہنچ سکی کیونکہ کوہِ اتھوس کی خوفناک پہاڑی راس کے سامنے ایرانی بیڑے کا ایک حصّہ طوفان سے برباد ہوگیا۔

مگر داریوش قطعی ارادہ کرچکا تھا کہ ایتھنز اور ارت ریا کو بے سزا دئیے نہ چھوڑے گا۔ ساردیس کی آتش افروزی میں ان کا دخل سنکر وہ نہایت برافروختہ ہوا تھا دوسرے ایتھنز کا خارج البلد جابر، ہیپیاس، اُس کے دربار میں پہنچ گیا تھا اور اس شہر پر، جہاں سے وہ نکلوایا گیا، بار بار فوج کشی کی استدعا کررہا تھا؛ غرض فیصلہ ہوا کہ نئی مہم سیدھی بحیرۂ ایجین کے راستے روانہ ہو۔ آزاد یونان کے بڑے بڑے شہروں میں بھی جن سے ایران کی لڑائی نہ تھی، ایلچی بھیج دئیے گئے کہ اُن سے نشانِ عجز و اطاعت، یعنی "آب و گِل" کا خراج لیں۔ چنانچہ اکثر شہروں نے

---

[1] آئینۂ سکندری کے فاضل مولف نے اسے مہرنوش پسر اسپندیار بتایا ہے۔ (صفحہ ۳۰۲) مترجم

[2] واضح ہو کہ یہ وہ سکندر نہیں ہے جس نے دارائے ایران پر فتح پائی۔ بلکہ اسکے اجداد میں مقدونیہ کا ایک بادشاہ گزرا ہے۔ مترجم

نے سرِ تسلیم خم کردیا اور انہی میں ایتھنز کا دشمن اجی نا بھی شامل تھا۔ ایرانی فوج کی سرداری داریوش کے ایک بھتیجے ارتافرنز اور داتیس کے سپرد ہوئی اور ایتھنز کا سن رسیدہ جابر ہیپیاس جسے اپنے وطن پر ایک دفعہ اور حکومت کرنے کا ارمان تھا، اُن کے ساتھ کردیا گیا۔ یہ جنگی بیڑا ہیروڈوٹس کی روایت کے بموجب چھ سو جہاز پر مشتمل تھا۔ وہ جزیرہ بہ جزیرہ ہوتا ہوا مجمع الجزایر سای کلیڈیز کی تسخیر کے بعد یوبیہ اور ایٹی کا کی فاصِل رُودِ بار میں آپہنچا (سنہ ۴۹۰ ق م) اور راستے میں کاریس توس کو فتح کرکے ایرانی فوج ارت ریا کی حدود میں داخل ہوئی۔ یہ شہر بعض شہری عمایدین کی غداری سے ہفتے بھر کے اندر حملہ آوروں کے حوالے کردیا گیا، اور اس کے باشندے غلام بنالئے گئے۔ اور اب صرف دوسرے شہر سے سمجھنا باقی رہا جس نے شہنشاہ ایران کے منہ چڑھنے کی جسارت کی تھی اس کام کے لئے ایرانی سپہ سالاروں نے آبنائے پار کرکے اپنی فوجین خلیج مَیراتھان کے ساحل پر اتاریں ؎ اس موقع پر ایتھنز نے جو مدافعت کی اس کی جان مِل تیادیس تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جابروں کا جانشین اور خود بھی مطلق العنان حاکم رہ چکا تھا اور خرسونیس پر حکومت کے زمانے میں جو زیادتیاں اس نے کیں تھیں، ان پر مجلس عوام کے روبرو سخت گرفت ہوئی تھی تاہم ایک تو اس نے لمنوس اور امبروس ایتھنز کو دیئے تھے اور دوسرے خاندانِ پی سیس تراتوس کا وہ موروثی

دشمن تھا۔ کیونکہ پی سیس تراتوس نے اس کے باپ کائین کی جان لی تھی۔ پھر یہ کہ ایرانیوں کے متعلق جس قدر واقفیت مِل تیادیس کو تھی غالباً ایتھنز میں اور کسی شخص کو حاصل نہ تھی۔ غرض اپنے قبیلے کی طرف سے وہی سپہ سالار منتخب ہوا۔ بایں ہمہ

ہیروڈوٹس نے جس طرح یہ روایت بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ایتھنز میں بہت کم فوجی تیاریاں ہوئی تھیں۔ چنانچہ ایرانی قریب قریب لنگر انداز ہوچکے تھے جبکہ ایک تیزپا ہرکارہ اسپارٹہ دوڑایاگیا کہ ارت ریا کی تسخیر اور ایتھنز کی خطرناک حالت سے مطلع کرے۔ اسپارٹہ والوں نے جواب دیا کہ ایتھنز ہمارے اتحاد میں شریک ہے اسے مدد دینا فرض ہے اور ہم ضرور مدد دینگے لیکن فوراً چلنے میں شعایر مذہبی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ جب تک پورا چاند نہ ہولے سفر کرنا درست نہیں" لیکن جب پورا چاند ہولیا تو امداد کا وقت بھی گزرچکا تھا۔

ایتھنز کے سپاہیوں کی تعداد شاید نو ہزار کے قریب تھی۔ اس سال پول مارک یعنی فوج کا اعلیٰ سپہ سالار کالی ماکوس تھا۔ اس پر اور جنگی مجلس کے شرکا، یعنی سپہ سالارانِ قبایل پر لڑائی کا سارا بار اور مدافعت کی نازک ذمہ داری تھی۔ اور یہ ایتھنز کی خوش نصیبی تھی کہ معلوم ہوتا ہے کالی ماکوس بطیبِ خاطر مل تیادیس کا مشورہ سن لیتا تھا۔ غنیم نے میراتھان کے قریب فوج اتاری تھی اور اس کا ارادہ ظاہر تھا کہ وہ

ایتھنز پر، جس کے گرد کوئی شہر پناہ نہ تھی، خشکی اور تری دونوں جانب سے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ سوال یہ تھا کہ آیا ایتھنزی سپاہ اُس کی آمد کا انتظار کرتی رہے اور اپنے قلعے (اکروپولس) کے سامنے اور حد کے اندر مقابلہ کرے یا مردانہ وار آگے بڑھے اور جہاں دشمن ہو وہیں خود پہنچ جائے۔ مِل تیادیس نے مجلس عوام میں رائے دی کہ میَراتھان کی طرف پیش قدمی اور وہیں ایرانیوں کا مقابلہ کیا جائے۔ اور یہ وہ رائے تھی جس کا پیش کرنا اور منظور کرالینا ہی، غالباً مِل تیادیس کو اپنی شہرتِ جاوداں کا بدرجہ اولیٰ مستحق بنادیتا ہے ؏

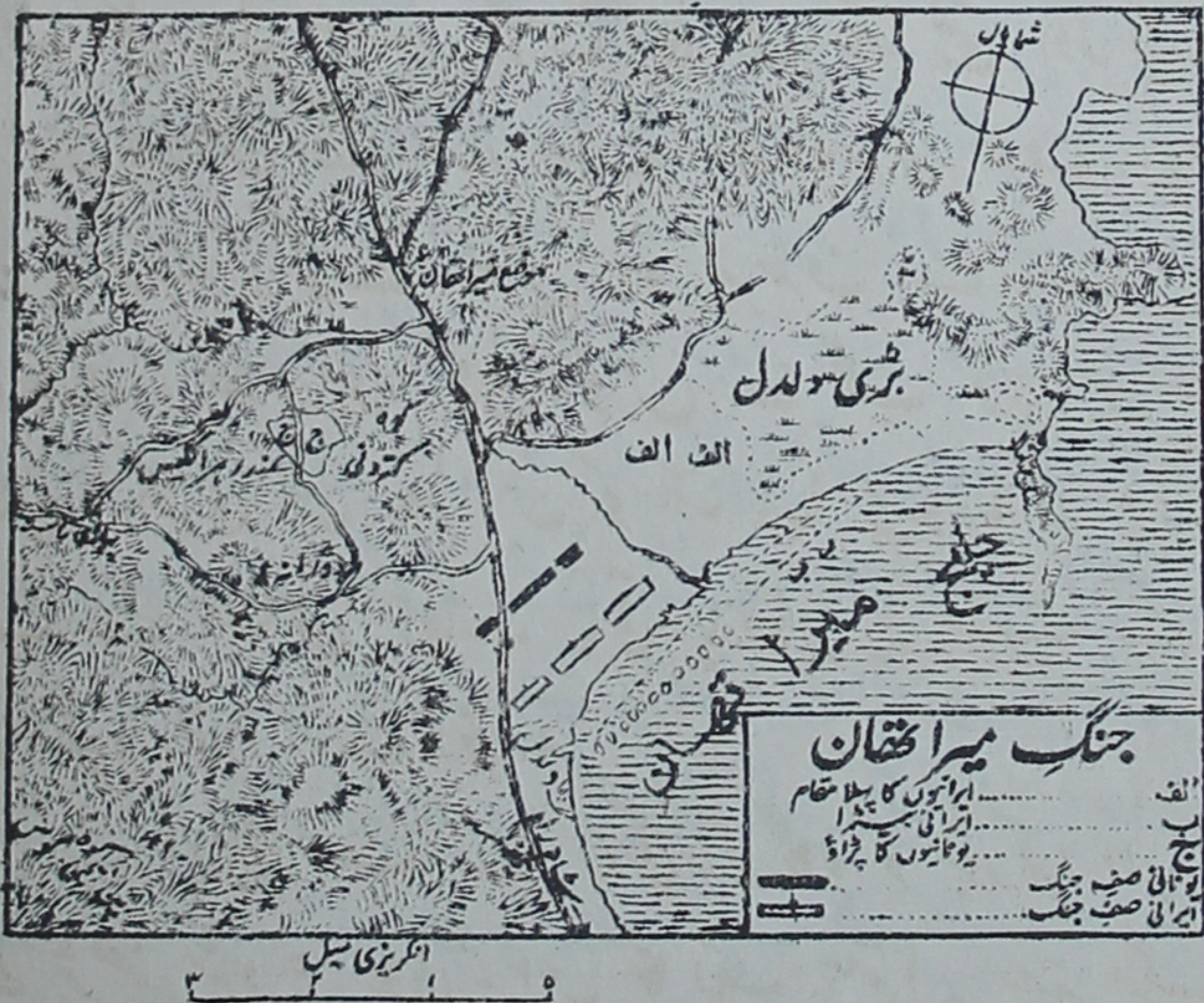
میَراتھان کا میدان ہلال نما ساحل کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف پھیلا ہوا ہے اور پن تلی کوس اور پارنیس کے سلسلے کی پہاڑیاں جو یہاں پہنچکر بہ تدریج نیچی ہوگئی ہیں اس میدان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ شمالی حصّے میں انتہائے جنوب کی زمین دلدلی ہے اور جس شمالی وادی میں میَراتھان کا گانوں واقع ہے اس میں ایک پہاڑی رَو کی گزرگاہ نے میدان کے دو حصّے کردئیے ہیں۔ ایتھنز سے گانوں تک آنے کے دو راستے ہیں۔ بڑی شاہ راہ تو جنوب کی طرف سے میَراتھان کے میدان میں آتی ہے۔ دوسرا دشوار گزار مگر کسی قدر قریب کا راستہ شمال کی طرف چلکر پن تلی کوس کی شمالی پہاڑیوں سے گزرا ہے اور میراتھان کے میدان میں پہنچکر کت رونی کی پہاڑی کے گرد اس کے دو راستے نکلتے ہیں۔ ایک تو شمالی، جو سیدھا میراتھان

کے گانوں کو چلا گیا ہے اور دوسرا وہ جو ہراکلیس کے دیول سے گزرتا ہے اور وادی اب لُنا سے اُتر کے کھلے میدان میں اس جگہ نکلا ہے جس کے قریب آجکل موضع ورانہ آباد ہے کالی ماکوس شمال راستے سے روانہ ہوا اور وادی اب لُنا میں پہنچکر اُس نے ہراکلیس کے دیول کے قریب اپنا پڑاو ڈالا۔ اور سچ پوچھئے تو اس عمدہ موقع کا انتخاب آدھی فتح سے بڑھ کر تھا۔ کیونکہ وادی میں ایتھنزی فوج پر دشمن سخت خسارے میں رہے بغیر حملہ نہ کرسکتا تھا اور ادھر نہ صرف وہ پہاڑی راستہ جدھر سے ایتھنز والے آئے تھے اُن کے قبضے میں تھا بلکہ میدان کا جنوبی دروازہ یعنی بڑی شاہ راہ بھی اُن کی زد کے اندر تھی اور اگر اِدھر سے ایرانی فوج گزرنا چاہتی تو اُس پر جناحی حملے کا موقع نکل آتا تھا۔ ایرانیوں نے اپنا پڑاو رَو کی گزرگاہ سے اوپر شمال کی جانب ڈالا تھا اور قریب ہی ساحل پر اِن کے جہاز لنگر ڈالے پڑے تھے۔ اُن کا فائدہ اس میں تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے حریف سے میدان میں جم کر لڑائی لڑلیں۔ اور اُدھر ایتھنز والوں کی جیت اس میں تھی کہ اپنے محفوظ مقام پر خاموش پڑے رہیں کہ اس میں اگر زیادہ دیر لگی تو ممکن تھا کہ اسپارٹہ سے مدد آنے کی اُمید تازہ ہوجاے۔ ایک اور شہر سے تو انہیں کمک پہنچ بھی چکی تھی اور جب وہ ہراکلیس کے دیول پر پہنچے تو پلاٹیہ کے ایک ہزار جوان اُن سے آملے تھے کہ اس

نازک وقت میں اپنے محسن کی دست گیری کریں اور تھیبز کے پنجے سے نکلنے میں پلاٹیہ کی جو حمایت ایتھنز نے کی تھی، آج اس احسان کا بدلہ اُتاریں ✦

جب چند روز گزر گئے اور یونانیوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی تو ایرانیوں سے مزید انتظار نہ ہوسکا۔ اپنے کل سواروں سمیت فوج کا ایک حصّہ انہوں نے جہازوں میں سوار کرایا اور خشکی اور سمندر دونوں طرف سے ایتھنز پر حملے کی تیاری کرنے لگے۔ خشکی کی فوج کو لازمی طور پر بڑی

۱۴۷



شاہ راہ سے گزرتا تھا اور اس لئے وہ جنگ کے لئے بالکل تیار تھی کہ شاید میداں سے نکلتے نکلتے یونانی حملہ کریں۔ ایتھنز والوں کے لئے پھر تامل و تذبذب کا موقع آگیا تھا لیکن آخر اُن کے پول مارک نے یہی فیصلہ کیا کہ دشمن کے جنوب میں بڑھتے ہی اُس پر حملہ کیا جائے ۔

کالی ماکوس کی جنگی موقع شناسی کی مثال اوپر ہماری نظر سے گزر چکی ہے۔ اب جس خوبی سے فوج کو اُس نے لڑایا اُس سے اس کا کمالِ سپہ سالاری ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کم تعداد ایتھنزی سپاہ کی قطاریں ہر جگہ برابر رکھی جاتیں تو گو وہ ایرانیوں کے قلب کو سمندر تک دھکیل کر لے جاتے لیکن اسی کے ساتھ ایرانیوں کی دونوں طرف نکلی ہوئی صف انہیں بیچ میں رکھ لیتی اور ایک جانب تو سمندر اور اُن کے جہاز ہوتے اور دوسری طرف ایرانی بازو اُن پر ٹوٹ کر گرتے۔ غرض وہ ہر طرف سے بہت بُری طرح گھر جاتے۔ نظر برایں کالی ماکوس نے قلب فوج میں صرف چند قطاریں کھڑی کیں اور اس کو اتنا لمبا پھیلادیا کہ پورے ایرانی قلب کے مقابل آجاے باقی بازوؤں پر مقابلے کے لئے قطاروں کی مقررہ تعداد رہنے دی ۔

اب ایرانی صف نے رَو کی گزرگاہ کو عبور کیا اور کنارے کنارے آگے بڑھنی شروع ہوئی۔ اس کا ایک معقول حصّہ الگ ہو کر یونانیوں کے رخ چلا جس کا مطلب جناحی حملے کی پیش بندی یا حملہ ہو تو اسے پسپا کردینا تھا اور اس کی آڑ میں باقی لشکر

بہ حفاظت گزر سکتا تھا۔ شاید اسی اثنا میں یونانی فوج بھی پہاڑیوں
سے نکل نکل کے وادی اب لُنا کے میدانی حصّے میں پہنچ چکی تھی
اس کا میمنہ خود کالی ماکوس کے تحت میں تھا اور میسرے میں
سب سے آخر پر پلاٹیہ کی امدادی سپاہ تھی۔ جب وقت یونانی
سپاہی دشمن کی صف کے قریب پہنچے تو ان پر مشرق سے تیراندازوں
نے تیر برسائے اور اس خطرے سے بچنے کے لئے وہ دوڑتے ہوئے
دشمن پر جا پڑے۔ کالی ماکوس نے جو جو کچھ پہلے سے سمجھ لیا تھا
لڑائی میں بالکل وہی صورت پیش آئی۔ غنیم کے قلب سپاہ نے
جہاں اس کے بہترین جنگ آزما اور خود ایرانی جوان تھے۔ اتھنزی
قلب کو پہاڑیوں میں دھکیل دیا۔ لیکن دونوں بازووں پر یونانیوں
نے حریف کو مار بھگایا اور پھر پلٹ کر ایرانی قلب پر آگرے جو
فتح کے جوش میں شکست خوردہ یونانی قلب کا تعاقب کر رہا تھا
اس دوسرے حملے پر یونانیوں کو پوری کامیابی ہوئی۔ ایرانی صفیں
درہم و برہم ہوگئیں، اور بے ترتیبی سے ساحل کی طرف بھاگیں،
اور وہاں جو زندہ بچے تھے وہ جہازوں میں لے لئے گئے؛ واضح
ہو کہ اس تمام معرکے میں ایرانیوں کی فوج کا صرف ایک حصّہ مصروف
جنگ تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ اصل جمعیّت اُسی وقت جہازون
میں چڑھ لی ہوگی جب کہ اُس نے اپنے اُن دستوں میں شکست
کے آثار دیکھے جن کو اُس کی حفاظت کے واسطے علٰحدہ کردیا گیا
تھا۔ (اگست یا ستمبر سنہ ۴۹۰ ق م)

یہ کوئی طولانی جنگ نہ تھی۔ یونانی نقصانات بھی بہت قلیل

(یعنی ۱۹۲ مقتول) تھے - ایرانیوں کے نقصان کا اندازہ ۶۴۰۰ کے قریب کیا جاتا تھا۔ بہر حال آرتافرنز اور داتیس کے پاس اب بھی ایک بڑا لشکر موجود تھا معرکۂ کارزار کا آیندہ رنگ بدل جانا کچھ محال نہ تھا اور ایتھنز کو ابھی تک خطرے سے بالکل نجات نہ ملی تھی۔ ایرانی بیڑے نے آبنائے سے نکل کے راس سنیّوم کا چکّر لگایا اور اِدھر یونانی فوجیں، میدانِ فتح میں ایک دستہ اپنے مقتولین اور غنایم کی حفاظت کے لئے چھوڑکر، ایتھنز کو پلٹیں کہ شہر کو بچائیں - انھوں نے شہر کے باہر الی سوس ندی کے کنارے پہنچکر دم لیا اور یہاں سے دشمن کے جہازوں کو دیکھا کہ فالرُن کا رُخ کئے چلے آتے ہیں - لیکن وہ ساحل تک نہیں آے بلکہ یکایک نظر آیا کہ سارا بیڑا سمندر میں واپس ہونے لگا۔ حقیقت میں داتیس نے مہم سے ہاتھ اٹھالیا تھا اور شاید یونانی فوج کو پہلے سے پہنچا دیکھکر اُس نے دوبارہ یونانی ہَپ لتیوں (یعنی پیادہ نیزہ برداروں) کا سامنا کرنے سے گریز کیا لیکن واضح ہوکہ ماہ کامل ہو لینے کے بعد اُسی روز اسپارٹہ کی فوج بھی چل چکی تھی اور لڑائی کے تھوڑے ہی دیر بعد ایتھنز میں پہنچ گئی۔ پس قیاساً کہہ سکتے ہیں کہ عجب نہیں جو اسپارٹہ والوں کی موجودگی یا کم سے کم آمد کی خبر ہی حملہ آوروں کی دفعتہً مراجعت کا ایک سبب ہوگئی ہو جن کو اپنے ارادوں میں ایک غیر متوقع زک تو پہنچی مگر اب تک کسی سخت ہزیمت کا منہ دیکھنا نہ پڑا تھا۔

اسپارٹہ والے اتنی دیر میں پہنچے کہ لڑائی کا وقت گزر چکا تھا۔

پھر بھی انھوں نے ایرانیوں کی لاشیں بغور دیکھنے کے شوق میں میدانِ جنگ کا جا کے معاینہ کیا اور اہلِ ایتھنز کے دلیرانہ کارنامے کی تعریف کر کے واپس چلے گئے؛ آج بھی وہ پشتہ جس میں اہلِ ایتھنز نے اپنے مقتولینِ جنگ کو دفن کیا تھا مقام معرکہ آرائی کا نشان دیتا ہے۔ کالی ماکوس جنگ میں کام آیا اور اسی جگہ دفن تھا اور اس کای لوس شاعر کا بھائی کِن گیروس بھی یہیں سپردِ خاک کیا گیا تھا جس کی نسبت بیان کرتے تھے کہ تنہا ایک ایرانی جہاز کو پکڑے کھڑا رہا یہاں تک کہ تبر کی ایک ضرب نے اس کا ہاتھ قطع کر دیا ؛

اس جنگ کے متعلق بہت جلد طرح طرح کے افسانے بن گئے تھے۔ مثلاً یہ کہ دیوتا اور اوتاروں نے یونانیوں کا ساتھ دیا۔ صفوں میں جنّات نے مِل مِل کر شمشیر زنی کی؛ یا یونانیوں کے دھاوے کے آگے ایرانی سپاہی جو بدحواس ہو کر بھاگے تھے۔ اُسے پان[1] دیوتا سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اور اسی زمانے سے ایک غار میں جہاں اکروپولس کی شمال مغربی ڈھلان پر اس دیوتا کا استھان تھا، اس کی پرستش کو از سرِ نو رواج ہو گیا تھا؛ یونان کے سب سے متبرک مقام یعنی خود دلفی کے مندر

---

[1] پان۔ یونانی دیومالا میں گڈریوں کا خدا تھا۔ یہ جنگلوں پھرتا اور کبھی کبھی راہ گیروں کے سامنے نمودار ہو کے انہیں دفعتاً ایسا ڈراتا کہ اُن کے ہوش حواس اڑ جاتے۔ اسی لئے ایسی وحشت جو بغیر کسی ظاہری سبب کے یک بہ یک طاری ہو جائے پان سے منسوب کی جاتی تھی۔ مترجم ؛

میں ابھی چند سال ہوے کہ فتح میراتھان کی سب سے نادر یادگار کی باقیات برآمد ہوئی ہیں ؛۔ ایرانی مال غنیمت کے روپے سے اہل ایتھنز نے ایک چھوٹا سا ڈوریانی وضع کا جواہر خانہ تیاّر کیا تھا اور اس میں سنگِ مرمر اپنی (پن تلی کوسی) معاون کا لگایا تھا۔ اس کی جو کچھ باقیات حال میں نکلیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فنِ عمارت کا گوہر بے بہا تھا اور جیسا صوفیانہ اور خوبصورت اس کے اندر پتھّر کا کام تھا (جو اُسکے کھنڈروں میں دب کر محفوظ رہ گیا) ضرور ویسی ہی خوبصورت وہ ساری عمارت بھی ہوگی ؀

شہنشاہِ ایران کے لشکرِ عظیم پر تنہا غالب آنے سے ایتھنز کی سارے میں دھاک بیٹھ گئی اور اس کے باشندوں کو اپنی قوت کا زعم اور نئے نئے حوصلے پیدا ہو گئے۔ زمانے نے اُن کی جمہوریت پر جلی حروف میں تصدیق کی مُہر لگا دی تھی اور اب ان کے دِل میں یہ خیال جم گیا تھا کہ اُن کا نظامِ حکومت قابلِ اعتماد ہے اور وہ یونان کی اُونچی سے اونچی ریاست سے دعوئ ہمسری کرسکتے ہیں ؛ میراتھان کا دن آیندہ ہمیشہ ایتھنز والوں کی نظر میں ایک عہد جدید کا سرآغاز رہا جس میں گویا خود دیوتاؤں نے اُن سے آکر کہہ دیا تھا کہ بڑھے جاؤ اور پھلے جاؤ ؀

مل تیادیس کو اس جنگ نے شہرتِ جاودانی کا خلعت پہنا دیا تھا۔ لیکن اس کا انجام اچھا نہ ہوا۔ خود اس کی تحریک

پر اہل شہر نے اُسے جزیرۂ پاروس پر حملہ کرنے کی منظوری دیدی تھی - کیونکہ ایرانی بیڑے کے لئے اس جزیرے نے بھی ایک جنگی جہاز فراہم کیا تھا، مِل تیادیس شہر پاروس کا (۲۶) دن تک محاصرہ کئے رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی اور زخم کھا کے ناکام لوٹ آیا - اہل شہر نے اس ناکامی کو سپہ سالار کے مجرمانہ طریق عمل سے منسوب کیا اور اس پر پچاس تیلنت[1] کا بھاری جرمانہ کردیا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس پر کونسا جرم عاید کیا گیا تھا - لیکن بعد میں جب اس قصے پر طرح طرح کے حاشئے چڑھائے جانے لگے تو احمقوں نے کہنا شروع کیا کہ در اصل مل تیادیس نے زرخیز علاقہ دلوانے کا وعدہ کیا تھا اور لوگوں کو یہی فریب دے کر سارا بیڑا لے گیا تھا مگر پھر صرف ذاتی کینہ نکالنے کے لئے اس نے پاروس پر حملہ کردیا۔ - بہرحال، مل تیادیس مذکورہ بالا سزا پانے کے تھوڑے ہی دن بعد مرگیا ؛

۶- ایتھنز اور اجی ناکی دشمنی

بحیرۂ ایجین میں سب سے زبردست بحری قوت جزیرۂ اجی نا کی تھی - اور اہل ایتھنز کا یہ اندیشہ بیجا نہ تھا کہ وہ نہ صرف ایرانیوں کی بہی خواہی کا دم بھریگی بلکہ عملاً انہیں مدد دیگی ۔ پس انھوں نے اسپارٹہ کو بیچ میں ڈالا اور شکایت

[1] ایک قدیم یونانی سکہ یا وزن جو ہمارے تقریباً ۲½ ہزار روپے کے برابر ہوتا تھا مترجم

کی تھی کہ اجی نا، نے ایتھنز کی عداوت میں مادرِ یونان کے خلاف ایرانیوں سے ساز کرلیا ہے؛ اسپارٹہ نے اسی زمانے میں اپنے پرانے حریف ارگوس پر فتح حاصل کی تھی اور ترنز کے قریب سیپیا کے میدان میں شاہ کلیومنیس نے اس کے ایسی ضرب لگائی تھی کہ ۲۰ برس بعد تک ارگوس نہ پنپ سکا (۴۹۴ھ ق م)۔ اس معرکے نے اسپارٹہ کا اور زور بڑھا دیا تھا مگر ایتھنز نے جو باضابطہ استدعا کی وہ اسپارٹہ کے صدرِ اتحاد ہونے کی حیثیت سے تھی کہ پلوپنی سس کے اس اتحاد میں ایتھنز اور اجی نا دونوں شریک تھے۔ غرض اس شکایت کی وہاں سماعت ہوئی اور کلیومنیس نے اجی نا جاکر اُسکے دس یرغمال ایتھنز کے حوالے کردئے تھے۔ اور اس طرح ایرانی فوج کشی کے وقت اجی نا انہیں کوئی امداد نہ دے سکا تھا اور نہ ایتھنز کی جنگی تیاری میں حارج ہوسکا تھا؛ لیکن اب یہ واقعہ خود اسپارٹہ میں بنائے فساد بن گیا۔ وہاں کے دونوں بادشاہوں میں باہم عداوت پہلے سے موجود تھی پس دماراتوس اجی نا والوں کی طرف ہوگیا۔ اور اُسے زک دینے کے لئے کلیومنیس نے اُس خاندان کے دوسرے وارث لیوتی کیداس کو اُبھارا کہ وہ دماراتوس کی صحّت نسب کا ثبوت طلب کرے۔ اسی کے ساتھ دلفی سے یہ الہامی پیام بھی حاصل کرلیا گیا کہ دماراتوس اپنے باپ سے نہیں ہے۔ غرض لیوتی کیداس بادشاہ بن گیا اور دماراتوس بھاگ کر داریوش کے

دربار میں پہنچا، لیکن اُس کے جانے کے بعد یہاں یہ حال کھُلا
کہ دشمن کو معزول کرانے کی غرض سے **کلیومنیس** نے دلفی
کی کاہنہ سے سازش کی تھی۔ پس اب **کلیومنیس** کو چھپ کر
بھاگنا پڑا اور وہ پہلے **تھسالیہ** اور اس کے بعد ارکیدیہ چلا
آیا اور وہاں خاص اپنے وطن کے خلاف جوڑ توڑ کر رہا تھا کہ
خود حکومتِ اسپارٹہ نے اُسے واپس بلا لیا۔ لیکن اس کی طبیعت
ایسی بے قابو ہوگئی تھی کہ اسپارٹہ آکر وہ دیوانہ ہوگیا اور آخر خود
کشی کرکے مرگیا۔

اس کے مرنے کے بعد **اجی نا** والوں نے اپنے یرغمال واپس
طلب کئے اور **لیوتی کی داس** نے چاہا کہ یہ کام باہمی گفتگو کے
ذریعے انجام پائے لیکن ایتھنز کی طرف سے انکار ہوا اور ان دونوں
میں پھر لڑائی چھڑ گئی۔ (۴۸۷ ق م) اسی عداوت نے ایتھنز کو
بحری قوت بنانے میں بڑی مدد دی کہ ایک تو **اجی نا** کی
تاختوں سے اپنے ساحل بچانے کا خیال تھا اور دوسرے
خود اجی نا کو محکوم یا کم سے کم اتنا کمزور کردینے کی خواہش
تھی کہ پھر اُس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ ہوسکے۔

۷۔ جمہوریۂ ایتھنز کا فروغ

کلیس تنیس کے قانون نے آرکنوں کے پاس بہت سے
اختیارات رہنے دئے تھے اور ان کا انتخاب مرتبے یا
قابلیت کی بناء پر جمہور کرلیتے تھے۔ لیکن عام رجحان یہ تھا

کہ عہدہ داروں کی قوّت کم کی جائے اور جمہوری مجلس کا زور بڑھایا جائے۔ چنانچہ جنگِ میراتھان کے بعد حکّام کے طریق تقرّر میں ردّو بدل کیا گیا (۴۸۷ ق م) اور اب اضلاع کے باشندے پانچ سو اشخاص کا انتخاب کرنے لگے جن میں سے نو آرکن قرعہ ڈال کر مقرّر کر لئے جاتے تھے۔ اس طرح گویا کسی بارسوخ کا تنہا یہ عہدہ چاہنا بے کار ہوگیا اور اب اس کو اتنا ہی موقع رہ گیا جتنا پانچسو دوسرے امیدواروں کو حاصل تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس عہدے کو جو امتیاز تھا وہ بھی باقی نہ رہا؛ مگر ظاہر ہے کہ اعلیٰ سپہ سالار کو اس طرح قرعہ اندازی سے مقرّر کرنا ممکن نہ تھا اور اس لئے پول مارک (یعنی دوسرے آرکن) کو جو اختیارات سابق میں دئے گئے تھے وہ اس سے لے کر دس سپہ سالاروں کو منتقل کردئے گئے جنھیں اب تک ہر قبیلہ الگ الگ منتخب کرتا تھا۔ لیکن اب یہ اصلاح کیگئی کہ ان دس کا انتخاب کل قوم مل کر کیا کرے۔

ایک نیا آئین "اوس ترا کزم" (یعنی فتوئ عام) کا بنایا گیا اور مجلس آریوپاگوس کا جو یہ فرض تھا کہ سلطنت کو حکومتِ جابرہ کی بلا سے محفوظ رکھے، وہ اب ذی اختیار جمہور کے ذمے کردیا گیا؛ اس فتوے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ سرکاری سال کی چھٹی پری تانی کے وقت مجلس عوام کے سامنے یہ سوال پیش ہوتا کہ آیا قوم کی رائے میں فتوئ عام

طلب کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں ؟ اور اگر مجلس نے کثرت رائے سے ضرورت ظاہر کی تو آٹھویں پری تانی کے ایام میں مجلس عوام کا ایک غیر معمولی جلسہ چوک میں منعقد کیا جاتا اور تمام باشندے اپنے اپنے قبیلے کے ساتھ مجتمع ہوتے - پھر ہر شہری (" اوستراکُن" یعنی) ٹھیکرے پر اُس شخص کا نام لکھ دیتا تھا جو اس کے نزدیک فتویٰ عام کا مستوجب ہو - اور یہ ٹھیکرے ایک مرتبان میں جمع ہوتے جاتے تھے - اور جب تک چھ ہزار ایسے ٹھیکرے نہ ہوں کوئی رائے واجب العمل نہ مانی جاتی تھی ؛ مگر تعداد پوری ہونے کی صورت میں اُس شخص کو جس کے (نام کے) خلاف سب سے زیادہ ٹھیکرے پڑے ہوں یہ سزا سنادی جاتی تھی کہ دس دن میں سرحد اٹیکا سے نکل جاے اور دس برس تک اس کے اندر قدم نہ رکھے - بایں ہمہ اُسے اپنے مال متاع پر قبضہ رکھنا جائز تھا اور وہ ایتھنز کی وطنیت سے محروم نہیں ہو جاتا تھا ؁

کہا جاتا ہے کہ اخراج کا یہ طریقہ کلیس تنیس کی ایجاد ہے اور اس نے خاص طور پر اُسے پی سیس تراتوس کی اولاد میں ایک شخص ہیپارکوس پسر کارموس کے واسطے وضع کیا تھا - چنانچہ گو یہ واقعہ قانون بننے کے پندرہ سال بعد ہوا تاہم ہیپارکوس ہی سب سے پہلا شخص تھا جو فتوئی عام کی رو سے خارج البلد کیا گیا (۴۸۷ ق م) اور

اس کے دوسرے سال یہ مصیبت مگا کلیس کے نصیب میں آئی جو اگرچہ الکمیونی خاندان سے تھا لیکن پی سیس تراتوس کی اولاد کا اُس نے ساتھ دیا تھا (۴۸۶ق م)۔ یہ سزائیں غالباً اس زمانے کے جمہوریت پسند مدبّرین زان تی پوس، ارس تدیز اور ثمس طاکلیس کی تحریک سے دی گئی تھیں لیکن جب ۴۸۴ میں زان تی پوس اور دو سال بعد ۴۸۲ میں ارس تدیز بھی اس طرح خارج البلد کئے گئے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اب فتوئ عام حکومتِ جابرہ یا شخصی بادشاہی کے خوف سے طلب نہ کیا جاتا تھا بلکہ اس کا مقصد ہر ایسے مقتدر شخص کو دفع کردینا ہوگیا تھا جو کسی عام پسند تجویز کی مخالفت کرے۔ چنانچہ بہت ممکن ہے کہ ان دونوں کے اخراج کی وجہ یہ ہو کہ وہ ثمس طاکلیس کی اولوالعزمانہ بحری تجاویز کے مخالف تھے ؁

ارس تدیز کے اخراج کے متعلّق، جو "عادل" کہلاتا تھا یہ دلچسپ نقل مشہور ہے کہ راے دینے کے دن ایک اَن پڑھ باشندہ اُس کے قریب کھڑا تھا اور ارس تدیز کی صورت نہ پہچانتا تھا۔ خود اُسی سے کہنے لگا کہ میرے ٹھیکرے پر "ارس تدیز" کا نام لکھ دو۔ اور جب ارس تدیز نے نام لکھتے میں سوال کیا کہ "تم ارس تدیز کو کیوں نکلوانا چاہتے ہو"، تو کہنے لگا "اس لئے کہ میں اُسے "عادل" سُنتے سُنتے تنگ آگیا ہوں" ؁

۸- ایتھنز کی بحری قوّت کا آغاز

لیکن تاریخ ایتھنز کے اس نازک زمانے میں سب سے بڑا مدبّر تمس طاکلیس تھا جس کی نسبت یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایتھنز کو ایک بڑی سلطنت بنانے میں جو کام اُسنے کیا وہ کسی شخص واحد سے نہ بن پڑا تھا۔ چھٹی صدی (ق م) میں ایتھنز کی بحری قوّت خاصی تھی لیکن بیڑہ، فوج کا ایک ماتحت شعبہ سمجھا جاتا تھا۔ بحالیکہ تمس طاکلیس خود فوج کو بیڑے پر تصدّق کر دینے کی فکر میں تھا کہ ایتھنز کو بحری سلطنت (اور یونان میں سب سے قوی بحری سلطنت) بنا دیا جائے۔ اس کام کا آغاز وہ جنگ میراتھان سے دو تین سال پہلے کرچکا تھا یعنی بحیثیت آرکن اُس نے مجلس عوام میں جزیرہ نمائے پیرےئوس کی مورچہ بندی کی تجویز منظور کرالی تھی (۴۹۳ء ق م)

اب تک فالرن کا کھلا ہوا کنارہ اہل ایتھنز کی بندرگاہ تھی جہاں سمندر کی ریتی تک وہ اپنے جنگی جہاز کھینچ لاتے اور یہاں وہ اس حالت میں پڑے رہتے تھے کہ اگر اچانک کوئی دشمن حملہ کردے تو کچھ حفاظت نہ ہوسکتی تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اب تک پیرےئوس سے کیوں کام نہ لیا تھا جو جزیرہ نمائے مُنی گیا کے مغرب میں ایک بڑی بندرگاہ تھی اور مشرق میں مُنی گیا اور زیا دو چھوٹی بندرگاہیں

اور اس کے ساتھ ملائی جاسکتی تھیں؛ مگر اصل میں یہ مقام شہر سے کسی قدر فاصلے پر تھا اور فالرُن کی طرح نگاہ کے سامنے نہ تھا۔ پس جب تک کوئی مورچہ بند بندرگاہ موجود نہ ہو فالرُن کو ترجیح تھی کہ وہ اکروپولس پر سے ہر وقت نظر آسکتا تھا۔ لیکن تمس طاکلیس نے جو نقشہ تیار کیا اس میں تمام جزیرہ نما کا دَور ایک مورچہ بند فصیل کے اندر آجاتا تھا نیز تینوں بندرگاہوں میں جنگی جہازوں کے واسطے تین گودیاں بنانے کی تجویز تھی۔ اس نقشے کے مطابق کام بھی شروع ہوگیا تھا مگر ایرانی حملے کی وجہ سے ملتوی کردینا پڑا؛ سو اب اجی نا کی لڑائی اور اہل ایران کے دوسرے حملے کا خوف، یہ دونوں سبب ایسے پیدا ہوگئے کہ تمس طاکلیس کو اپنے عظیم منصوبے کی دوسری طرح پر (یعنی بیڑا بنا کر) تکمیل کرنے کا موقع مِل گیا؛ اسی زمانے میں لاورِین کے ضلع کی پُرانی کان میں اتفاقاً بہت سی چاندی برآمد ہوئی اور بیت المال میں یہ مفت کی ایک رقم (شاید سَو تیلنٹ) جمع ہوگئی تھی (۴۸۳ ق م) صلاح یہ تھی کہ اسے لوگوں میں تقسیم کردیا جائے لیکن تمس طاکلیس نے مجلس عوام کو آمادہ کرلیا کہ اس رقم کو نئے جہاز بنانے پر صرف کیا جائے؛ چنانچہ دو ہی سال کے بعد ہمیں دو سو جنگی جہاز ایتھنز کے ماتحت نظر آتے ہیں؛ مگر واضح ہو کہ فصیلِ پیریئوس کی تکمیل کے کام کو ابھی ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا؛

باب ہفتم

ابتلاے یونان: ایران و فنیقیہ کی یورشیں

۱۔ زرگسنز کی تیاریاں اور پیش قدمی

میراتھان کی خلاف امید ناکامی کے بعد داریوش نے ایک اور مہم بھیجنے کا عزم کیا تھا لیکن اس ارادے کے عمل میں آنے سے پہلے مرگیا اور ملکۂ اتوسا سے اُس کا بیٹا زرگسنز[1] جانشینِ تخت ہوا (۴۸۵ھ ق م) اس کی تخت نشینی کے بعد پھر سوال اُٹھا کہ آیا داریوش کے منصوبے کی تکمیل کی جائے یا نہیں؟ بیان کیا جاتا ہے کہ خود زرگسنز اس معاملے

[1] خشیارشا۔ یا زرزیز۔ مترجم

میں مذبذب تھا لیکن اس کے برادر عم زاد مردونیوس کی جوشیلی
تقریروں نے اُسے اُبھار اُبھار کے آمادہ جنگ کردیا۔ اور اب یہ
فیصلہ کیا گیا کہ ایک ساتھ برّی اور بحری حملہ کیا جائے۔
(سنہ ۴۸۳ ق م)۔ کوہ آتھوس کی خاک نائے پر کوئی ڈیڑھ میل
لمبی نہر کھُدنی شروع ہوئی اور اسی دشوار کام سے جنگی تیاریوں
کا آغاز ہوتا ہے۔ پچھلی مرتبہ مردونیوس کا ایک بحری
دستہ اس خطرناک راس کے گرد چکّر کھاتے ہیں برباد ہوچکا
تھا اور یہ ایرانی فنِ حرب کا بنیادی اصول تھا کہ برّی اور
بحری افواج ساتھ ساتھ کام کریں اور ایک دوسرے سے
جدا نہ ہونے پائیں۔ پس آتھوس کی نہر اس لئے کھودی
گئی تھی کہ ایرانی جہاز برّی افواج کے ساتھ ساتھ تمام ساحلِ
تھریس کو بے کھٹکے طے کرسکیں؛ اور جب یہ نہر پوری ہوگئی
تو وہی کاریگر دریائے سٹریمن پر پل باندھنے کے لئے آگے
بھیج دیئے گئے کہ فوج کے گزرنے میں دقّت نہ ہو اسی کے
ساتھ سارے راستے پر ایک انبوہ عظیم کی رسد رسانی کا
انتظام کیا جانے لگا؛ یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ زرکسیز
کی تمام فوجون نے اس کے ساتھ ساردیس میں جاڑا گزارا
ہو۔ گمان غالب یہی ہے کہ ان سب کا مقامِ اجتماع
دردانیال پر تھا، اور اس آبنائے پر مصر و فنیقیہ کے ماہرینِ
فن نے ساحل مقابل تک دو پُل بنادئے تھے؛ لیکن یہ
دونوں ایک طوفان میں ٹوٹ گئے اور اس حادثہ پر زرکسیز

نہایت غضب ناک ہوا۔ اُس نے نہ صرف پُل بنانیوالوں کے سر قلم کرادیئے بلکہ حکم دیا کہ آبنا ے کے پانی پر بھی تین سو کوڑے مارے جائیں۔ اور اس عجیب حکم کی جن لوگوں نے تعمیل کی وہ کوڑے لگاتے میں یہہ "غیر یونانی اور ناپاک" لفظ کہتے جاتے تھے:۔ "اے تلخ پانی، ہمارا مالک تجھے یہ سزا اس لئے دیتا ہے کہ تو نے اُسے نقصان پہنچایا حالانکہ اُس نے کبھی تجھے نقصان نہ پہنچایا تھا۔ لیکن تو چاہے یا نہ چاہے شاہ زرکسز تجھے عبور کئے بغیر نہ رہیگا۔

اس کے بعد کشتیوں کے ہرے آپس میں باندھکر، ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دو قطاریں لگائیں اور نئے پُل تیار کئے گئے۔ شمالی قطار میں ۳۶۰ اور اس سے نیچے کی قطار میں ۳۱۴ کشتیاں باندھی گئی تھیں۔ دونوں قطاروں کے اوپر ۶ موٹی موٹی زنجیریں پھیلائی تھیں اور بیچ میں سے تین جگہ اتنا فصل نیچے چھوڑ دیا تھا کہ چھوٹی تجارتی کشتیوں کی آمد رفت کا راستہ رہے۔ زنجیروں کے اوپر تختے تھے اور پھر زنجیروں کی ایک تہ دے کر انہیں جکڑ دیا تھا۔ اسی تہ بنیاد پر لکڑی اور مٹی ڈال کے سڑک تیار کی گئی تھی اور دونوں طرف ایسی اونچی اونچی باڑیں لگائی تھیں کہ جانور پُل پر سے گزرتے میں سمندر کو نہ دیکھ سکیں۔ بیان کرتے ہیں کہ خود زرکسز کے لئے سنگ مرمر کا تخت ساحل کے بلند مقام پر بچھادیا گیا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے فوجیں گزر رہی

تھیں۔ یہ سلسلہ صبح سے شروع ہوا تھا مگر تمام لشکر کے زیرین درجہ پُل کو عبور کرنے میں دو دن صرف ہوئے۔

علاقہ تھریس کے مقام ڈریس کوس پر بیڑا فوجوں سے آملا کہ آئندہ سے دونوں مل کر کام کریں۔ ڈریس کوس کے میدان میں زرکسیز نے فوجوں کا معائنہ کیا اور موجودات لی۔ اور ہیروڈوٹس کے الفاظ میں "وہ کونسی قوم ایشا کی تھی جسے زرکسیز، ہیلاس پر چڑھا کے نہ لایا تھا؟" خاص ایرانی سپاہی اُتانیس کے زیر عَلَم سر سے پاؤں تک زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے ان کے پاس چوبی ڈھالیں چھوٹی برچھیاں اور لمبی لمبی کمانیں تھیں۔ اشور کے جوان برنجی خود اور نرم کفتان پہنے، چماق (یعنی ڈنڈے) اور نیزہ و خنجر سے مسلّح تھے۔ باختری تیر انداز بید کی کمانیں لئے ہوئے تھے۔ تبر بردار ساکی (یعنی اہل کاشغر و سمرقند) اپنی پاپاخ[1] و شلوار میں تھے۔ اہل ہند کا، سوتی اور بحر خزر کے ارد گرد بسنے والوں کا لباس، بکری کی کھال کا تھا۔ قوم سیارنج اونچی ایڑی کے موزے اور رنگے ہوئے کپڑے پہنے تھی۔ اہل حبشہ چیتے یا شیر کی کھال پہنکر آئے تھے اور اُن کے تیروں میں پتھر کے پیکان تھے جو قرونِ مظلمہ کی یاد دلاتے ہیں۔ قوم سگارتیہ خنجر و کمند سے مسلح تھی۔ تھریس کے سپاہیوں کے سر پر پوست روباہ کی ٹوپیاں تھیں۔ اور کولکیہ والے چمڑے کی ڈھالیں لئے ہوئے تھے۔

---

[1] پاپاخ۔ یعنی نوک دار اونچی ٹوپیاں۔ مترجم

بحری افواج میں فنیقیہ، مصر، قبرس، سلیسیہ، پم فیلیہ، لیسیہ، کاریہ اور محکوم یونانی شہروں کے دستے شامل تھے اور منقول ہے کہ بیڑے میں کُل ۱۲۰۷ جنگی جہاز تھے جن کی بار برداری کے لئے ۳ ہزار کشتیاں ساتھ تھیں؛ فوج کے شمار کے متعلق یہ دلچسپ روایت مشہور تھی کہ پہلے ایک میدان میں دس ہزار آدمی گنجان صفوں میں ایک دوسرے سے ملاکر کھڑے کئے گئے اور گرد لکیر کھینچ کے دیوار بنادی گئی۔ اس کے بعد ساری پیادہ فوج باری باری سے اسی حصار میں سے ہوکر گزری اور وہ ۱۷۰ مرتبہ معمور ہوا۔ گویا لڑنے والوں کی کُل تعداد ۱۷ لاکھ تھی اور اسّی ہزار سواروں کے علاوہ کچھ فالتو فوج اور بھی تھی جسے شمار نہیں کیا گیا۔ ان میں اگر بحری سپاہ ملائی جائے (اس حساب سے کہ فی جہاز ۲ سو اور فی کشتی ۸۰ آدمی شمار کئے جائیں۔) تو کل تعداد ۲۳ لاکھ ۱۷ ہزار نکلتی ہے۔ اور نوکر چاکر، بنئے بقال، اور بھیر علیحدہ رہی، جسے ہیرُوڈوٹس تعداد میں سپاہیوں کے برابر رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس تمام لاؤ لشکر کا شمار ۵۰ لاکھ سے اوپر پہنچتا ہے۔ اور یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب حساب بالکل ناقابل اعتبار ہے؛ ایرانیوں کی برّی فوج شاید تین لاکھ یا بمشکل کچھ زیادہ ہوگی اور اسی طرح اُن کے جہازوں کی بھی جو تعداد یونانیوں نے لکھی ہیں، اُس سے کہیں کم سمجھنا چاہئیے؛

ڈُریس کوس سے زرکسیز یہ انبوہِ کثیر لئے ہوئے، جس کے پینے کے لئے ندیوں کا پانی اکتفا نہ کرتا تھا اور وہ خشک اور خالی رہ جاتی تھیں، تھرما روانہ ہوا (اگست ۴۸۰ ق م) اور اسی مقام پر سیتھونیہ اور پالنی کا چکر کاٹ کے ایرانی بیڑا پھر بری فوجوں سے آملا زرکسیز کے کوچ کے بہت سے واقعات جو ہروڈوٹس نے بیان کئے ہیں دلچسپ کہانیاں ہیں جن سے اس ملیچھ کی فرعونیت اور استبداد دکھانا مقصود ہے نیز یونان کی شوکت نمائی کے لئے خطرات کے بیان میں نہایت مبالغے سے کام لیا گیا ہے؛

۲-یونان کی تیاریاں

اُدھر اہل یونان بھی جواب میں لڑائی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایتھنز اور اسپارٹہ کے سوائے تمام یونانی ریاستوں کو زرکسیز نے ساردیس کے زمانہ قیام میں ایلچی بھیجے تھے کہ آب و گِل کا خراج وصول کریں؛ گویا اصلی حریف ایتھنز و اسپارٹہ تھے جو حملہ روکنے کے لئے متحد ہو گئے تھے۔ اور اُنہیں یونان کے سب سے نازک وقت میں اہل یونان کا سرگروہ اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ اسپارٹہ عام طور پر اُن میں سر برآوردہ مانا جاتا تھا اور ایتھنز نے میراتھان کی لڑائی جیت کر اپنی دھاک بٹھادی تھی؛ اب انہی دونوں نے نہائے کورنتھ پر تمام اہل یونان کا جلسہ منعقد کیا کہ سب مل کر

اس خطرے کے دفعیہ کی تدابیر سوچیں۔ (۴۸۱ ق م۔ فصل خریف)
کل یونانیوں کو کسی حد تک متحدہ کرنے کی کبھی بالارادہ کوئی
تدبیر کی گئی تو یہ جلسہ اس کی پہلی مثال ہے۔ بہت سی
ریاستوں نے اس میں اپنے اپنے وکیل بھیجے اور اسپارٹہ
کی صدارت میں اس کا انعقاد خاکنائے کورنتھ پر ہوا جس کا
انتخاب مرکزی مقام ہونے کی وجہ سے کیا گیا تھا؛ جلسے
میں ۳۱ ریاستوں کے وکیل آئے تھے۔ انھوں نے متحد
رہنے کا عہد و پیمان کیا اور حلف اُٹھایا کہ جو ریاست بلا
مجبوری دشمن کی اطاعت قبول کرے اُس سے خدائے دلفی
کے واسطے "یک عشر" وصول کریں؛ حقیقت میں یہ ایک
منّت ماننے کا طریقہ تھا جس سے مراد یہ تھی کہ ایسے
غدّاروں کو بالکل نیست و نابُود کردیا جائیگا؛ جلسے میں تھسالیہ،
بیوشیہ اور شمالی یونان کی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں
نے شرکت نہیں کی تھی۔ ایرانی حملے کی زد میں سب سے
پہلے ہی شمالی ریاستیں آتی تھیں اور چونکہ تنہا مدافعت کرنے
کا خیال ہی فضول تھا لہذا جب تک انہیں اس بات پر
کامل اعتبار نہ ہوتا کہ اسپارٹہ اور اس کے حلیف تھسالیہ
کی شمالی سرحد بچانے میں اُن کی مدد کریں گے اُن کے لئے
قبولِ اطاعت کے سوائے کوئی چارہ کار نہ رہا تھا؛

ملکر کام کرنے میں سب سے بڑی قباحت ان ریاستوں
کے باہمی تنازعات کی وجہ سے پیدا ہورہی تھی۔ کورنتھ کی مجلس

نے ایسے اندرونی جھگڑے مٹانے کی کوشش کی اور اجی نا اور ایتھنز نے آزادی یونان کی خاطر مل کر لڑنے کے واسطے، اپنی مخاصمت بالائے طاق رکھدی؛ دوسرا اہم مسئلہ متحدہ سپاہ کی قیادت کا تھا؛ فوج کی سرداری کے معاملے میں اسپارٹہ کا حق بلا حجّت سب کو تسلیم تھا لیکن بیڑے کے متعلق یہ معاملہ کسی قدر بحث طلب تھا اور ایتھنز جس نے سب سے زیادہ جہاز فراہم کئے تھے، واجبی طور پر اس اعزاز کا دعویدار تھا۔ مگر دوسری ریاستیں اس سے حسد کرتی تھیں اور اُنھوں نے کہدیا تھا کہ ہم اسپارٹی سردار کے سوا کسی کی ماتحتی گوارا نہ کرینگے۔ غرض حلیفوں کی فوج کا سپہ سالار لیونی ڈس شاہ اسپارٹہ مقرر ہوا اور اتحادی بیڑے پر بھی اسپارٹہ کے باشندے یوری بیاڈس کو امیرالبحر بنایا گیا جو وہاں کے کسی شاہی خاندان سے نہ تھا۔

دوسری ریاستوں کو بھی دعوتِ اتحاد دینے کے لئے سفیر بھیجے گئے تھے۔ جیسے آرگوس کو جس نے جلسے میں شرکت نہیں کی تھی۔ نیز کریت، کرکایرا اور سیراکیوز کی بحری ریاستوں سے امداد کا وعدہ لینے کے لئے ایلچی روانہ ہوئے تھے مگر ان سفارتوں سے کوئی مطلب براری نہ ہوئی۔ سیراکیوز کے طاقتور جابر گلن کو خود اپنی مملکت پر اہل قرطاجنہ کے حملے کا فکر لگا ہوا تھا اور اگر چاہتا بھی تھا تو بھی وہ مادرِ وطن کو کوئی امداد نہیں دے سکا۔ یونانیوں کے پاس جنگی

تیاریوں کے لئے بہت وقت تھا۔ اور ان میں سب سے زیادہ جوشِ سعی سے غالباً ایھتنز نے حصہ لیا۔ اُس نے اپنے ممتاز شہریوں کو جو پچھلے دس برس میں فتویٰ عام کی رُو سے خارج البلد کئے گئے تھے واپس بلا لیا (۴۸۰ ق م)۔ اور زان تی پوس و ارس تدیز کی مراجعت کے بعد ہی اہل شہر نے اُن کی حبِّ وطن پر اعتماد کا یہ ثبوت دیا کہ انہیں بھی اپنا سپہ سالار منتخب کیا۔

۳۔ جنگ تھرموپلی و آرتمیزیوم

جن دنوں زرکسز، دردانیال پر پہنچا ہے، تھسالیہ والوں نے اہل اتحاد کو ایک پیام بھیجا اور صلاح دی کہ حملہ آوروں کی مدافعت تمپی کے درے پر کی جائے۔ چنانچہ دس ہزار ہُپ لیت (پیادے) وہاں بھیجے گئے تھے۔ لیکن پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مقدونیہ سے تھسالیہ آنے کے اور درے بھی ہیں اور غالباً ایرانی فوجیں انہی کے راستے ادھر بڑھیں گی ان سب دروں پر دشمن کو روکنے کے لئے دس ہزار سپاہی کافی نہ تھے۔ پس ایک تمپی کی مدافعت کرنا بالکل فضول اور اس لحاظ سے نہایت مخدوش تھا کہ یہ مقام بہت دُور شمال میں واقع تھا۔ پس یہ خیال چھوڑ دیا گیا اور اتحادی فوج تھسالیہ سے واپس چلی گئی۔ اس طرح ان علاقوں کو چھوڑ کر چل دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مجبور ہو کر

زرکسنز کے حضور میں "آب و گِل" کی نذر پیش کردی جو قبولِ اطاعت کی دلیل تھی ؛

مدافعت کے لئے دوسرا مناسب موقع تھرموپلی تھا۔ یہ تنگ درہ پہاڑ اور سمندر کے درمیان تراکیس و لوکریس کی حدّ فاصل ہے اور کوہِ اویتہ کے جنوب میں جس قدر علاقے (مشرقی یونان کے) ہیں اُن سب میں جانے کا یہی دروازہ تھا؛ اس زمانے میں مغربی اور مشرقی سروں پر سے یہ درہ نہایت تنگ تھا اور بیچ میں اہل فوکیس نے تھسالیہ والوں کی یورشیں روکنے کے لئے، ایک فصیل بنادی تھی؛ پھر بھی اگر تھرموپلی کا راستہ رک جائے تو کسی چالاک فوجی دستے کا پہاڑ کی ایک دوسری ناہموار چڑھائی سے لوکریس کی طرف پر آنکلنا ممکن تھا۔ پس تھرموپلی کے مدافعین کے لئے ضرور تھا کہ وہ اس راستے کو بھی روکے رکھیں تاکہ دشمن کا کوئی گروہ چکّر کھا کے یکایک اُن کے عقب میں نہ آپہنچے ؛

یونانیوں نے ارادہ کرلیا کہ دشمن کو تھرموپلی پر روکا جائے۔ لیونی ڈس اپنی فوج لیکر وہاں آپہنچا۔ اس کے ماتحت ۷ ہزار کے قریب سپاہی تھے یعنی ۴ ہزار پلوپنی سس، ایک ہزار فوکیس، ۴ سو تھبنز، ۷ سو تھس پیہ اور لوکریس کی پوری فوج، شامل تھی۔ واضح رہے کہ اہلِ پلوپنی سس نے اپنی فوج کا محض ایک قلیل حصّہ یہاں روانہ کیا تھا اور اگر ایتھنز کا پاس نہ ہوتا تو کیا عجب ہے کہ وہ شمالی یونان

سے بالکل قطع نظر کرلیتے اور اول سے ہی اپنی تمام فوجیں خاکنائے کورنتھ پر مجتمع کرتے۔ لیکن ایتھنز پر اُن کا بہت کچھ دارو مدار تھا کہ سب سے طاقتور بیڑا اسی کا تھا اور وہ مجبور تھے کہ ایتھنز کے نفع نقصان کا بھی خیال رکھا جائے۔ اور تھرموپلی کو چھوڑ کر خاکنائے پر ہٹ آنے کے معنی یہ تھے کہ اٹی کا (یعنی ایتھنز کے علاقے) کو دشمن کے حوالے کردیا جائے۔ بایں ہمہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسپارٹہ والوں کو در حقیقت خاکنائے کورنتھ ہی کی لَو لگی ہوئی تھی اور شمالی ریاستوں کے بچانے کا انھیں چنداں خیال نہ تھا۔ اور اس خودغرضی اور کوتہ اندیشی کے طرز عمل پر انھوں نے یہ کہہ کے پردہ ڈالنا چاہا تھا کہ ہماری فوجیں کارینہ کا تہوار منانے میں مصروف ہیں اور اس لئے لیونی ڈس کے ہمراہ جو جمعیت بھیجی گئی ہے یہ محض مقدمتہ الجیش ہے۔ باقی فوج تھوڑے عرصے بعد آئیگی ؂

چونکہ ایرانیوں کی برّی اور بحری فوجیں ہمیشہ ساتھ کام کرتی تھیں لہذا یہ بات یقینی تھی کہ ایرانی بیڑا یوبیہ اور یونان خاص کے درمیان رود بار میں ضرور داخل ہوگا۔ نظر براین، ادھر تو یونانی سپاہی تھرموپلی کا درہ روکے پڑے تھے اور اُدھر یونانی بیڑا، یوبیہ کے شمالی سرے یعنی مقام ارٹمی زیوم پر متعین کردیا گیا تھا کہ خلیج مالیس میں ایرانیوں کو بڑھنے سے روکے ؛ اس بیڑے میں ۳۲۴ سہ طبقہ اور نو پچاس

چپّو کے جنگی جہاز شامل تھے اور ان میں حصّہ غالب (یعنی ۲۰۰ جہاز) ایتھنز کا تھا۔ ایتھنز کے ۵۳ جہاز جو اس پہلی لڑائی میں شریک نہیں ہوے غالباً آنباے کے جنوبی راستے کی حفاظت کے لئے چھوڑ دئے گئے تھے کہ مبادا ایرانی کچھ جہاز یوبیہ کے گرد سے بھیج کر یوری پوس کا ناکہ اور یونانیوں کی واپسی کا راستہ روک لیں۔

۱۶۲



اواخر اگست میں ایرانی فوج تھرموپلی پہنچی اور ان کے بیڑے نے جزیرہ نماے مگنیسیہ کے ساحل پر سپیاس کے قریب لنگر ڈالا۔ ان کے جہازوں کی اتنی کثرت تھی کہ بندرگاہ کے اندر وہ نہ سما سکے اور سمندر میں ایسی بادِ تند چلی کہ ہیروڈوٹس کے قول کے بموجب اُن کے چارسو جہاز وہیں برباد ہوگئے۔ پھر بھی یونانی بیڑے کے سردار سامنے

نہ پڑتے تھے اور پیچھے ہٹنے پر مایل تھے۔ لیکن اہل یوبیہ بیڑے کی دستگیری کے خواہاں تھے اور انھوں نے ۳۰ تیلنت تھمسٹاکلیس کو دئیے کہ سردارانِ بحری کو رشوت دے کے روکا جائے؛ اس نے ۸ تقسیم کئے اور باقی ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ خود رکھ لئے؛ اس اثناء میں ایرانیوں نے راس کا چکر کاٹا اور اَرِفتی پر اپنے جہاز روکے۔ یونانیوں کی واپسی کا راستہ روکنے کی غرض سے انھوں نے اپنے دو سو جہاز خفیہ طور پر یوبیہ کے جنوب میں روانہ کئے تھے لیکن ایک مشہور غوطہ خور اسکی لیاس نامی اَرِفتی سے تیرکر ارٹمی زیوم پہنچا اور یونانیوں کو اس چال کی خبر پہنچادی۔ یونانیوں نے ارادہ کیا کہ واپس جاکر اس بحری دستے کا مقابلہ کریں لیکن دن ڈھلے بعد انھوں نے اَرِفتی میں ایرانیوں کے لنگر انداز جہازوں پر ایک ابتدائی حملہ کردیا اور اُن کے ۳۰ جہاز چھین لئے؛ بعد غروب ان کا قصد روانگی کا تھا مگر رات طوفان خیز تھی اور جب دن ہواتو اطلاع ملی کہ ایرانیوں کے دہ دو سو کے دو سو جہاز ٹوٹ کے غارت ہوگئے؛ اسی وقت ایتھنز کے باقی ماندہ ۵۳ جہاز یوری پوس سے چلکر بیڑے میں آملے اور چونکہ راستہ روکنے کا خطرہ بھی جاتا رہا تھا لہذا یونانیوں نے ارٹمی زیوم ہی میں ٹھیرے رہنے کا فیصلہ کیا؛

اس اثناء میں شاہ لیونی ڈس نے تھرموپلی پر اپنے

قدم جمالئے تھے۔ پہاڑ کے اوپر سے جو راستہ آتا تھا اس کی پاسبانی فوکیس والوں کے سپردِ کی گئی تھی۔ نیچے درے پر، اہل فوکیس کی قدیم فصیل کی مرمّت کرلی گئی تھی اور اسکے پیچھے ۶ ہزار سرفروش راستہ روکنے کے لئے ڈٹے ہوے تھے؛ زرکسنر نے اس اُمید میں کہ شاید وہ ہٹ جائیں، چار دن تک توقّف کیا اور پانچویں دن حملے کا حکم دیا۔ مگر یونانی نیزہ بازوں نے ایشائی تیراندازوں کو پسپا کردیا اور گو دوسرے دن زرکسنر کی فوج خاصہ نے جو "قشون جاودانی" کے نام سے موسوم تھی، ہلّہ کرکے درہ لینے کی کوشش کی تاہم نتیجہ وہی ناکامی ہوا اور ہرو ڈوٹس کہتا ہے کہ زرکسنر اپنی فوج کے نقصان دیکھ کر" فرطِ کرب سے تین مرتبہ اپنے تخت سے اُچھل اُچھل پڑا"۔ آخر یہ طے پایا کہ یہی "قشون جاودانی" پہاڑ کے راستے سے زبردستی گزرجائیں۔ اس وقت وہ اپنے سردار ہیڈرانیس کی ماتحتی میں تھے اور علاقہ مالیس کا ایک یونانی باشندہ افیالتیس اُن کا رہبر ہوگیا تھا۔ غرض راتوں رات کوچ کرکے یہ فوج درے کی چوٹی پر آنکلی اور صبح ہوتے ہوتے اچانک فوکیسی پاسبانوں کے سرپر جا پہنچی۔ فوکیس والے پہاڑیوں کی طرف بھاگے اور قشون جاودانی انہیں دباتے ہوئے چلے آتے تھے کہ لیونی ڈس کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی اسی وقت مجلس مشاورت منعقد کی گئی اور طے پایا کہ اس قلیل فوج کا بڑا حصّہ درے سے ہٹا لیا جائے اور صرف

اسپارٹہ تھبنز اور تھس پیہ کے سپاہی، کُل ۱۴۰۰ جوان، اپنی جگہ پر قایم رہیں۔ درے کے مشرق اور مغرب میں دو رُخ تھے جدہر سے اب غنیم کو راستہ نکالنا تھا۔ مغرب کی جانب قدیم فصیل پر لیونی ڈس اپنے ۳ سو اسپارٹی جانبازوں کو لے کر جا کھڑا ہوا کہ زرکسیز کے پورے لشکر کو روکے رکھے اور باقی تمام سپاہی مشرق کی طرف بھیج دئے گئے کہ جو فوج پہاڑ سے چڑھ آئی ہے، اُس کا مقابلہ اور مشرقی سرے کی مدافعت کریں ؀

لیونی ڈس کے اس فعل کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ صرف جان پر کھیل جانا تھا۔ درحقیقت اگر اب بھی وہ فوج جسے اُس نے مشرقی رخ روانہ کیا تھا **قشون جاودانی** کو کسی طرح مغلوب کرلیتی تو اہل فوکیس کی غفلت کی تلافی ممکن تھی؛ لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ، زیادہ سے زیادہ ایک اُمید موہوم تھی۔ **قشون جاودانی** کے سامنے یونانیوں کی کچھ پیش نہ گئی اور کہا جاتا ہے کہ وہ کُل ۴ ہزار یونانیوں کو قتل کرکے، مارتے کاٹتے مشرقی سرے پر تھبنز و تھس پیہ کی فوج تک پہنچ گئے؛ اور سب کے آخر میں اہل اسپارٹہ کے مارے جانے کی نوبت آئی؛ مگر یونانی جان سے ہاتھ دھوکر یہ لڑائی لڑے تھے۔ اُنھوں نے صرف حملے روکنے پر قناعت نہ کی بلکہ فصیل کے پیچھے سے نکل کے فوجوں کے سمندر میں جا کودے اور دُشمن کی صفوں کو اُلٹ اُلٹ دیا۔ جب

لیونی ڈس مر کے گرا تو اس کی لاش پر وہ گھمسان ہوا کہ ہومر کے افسانے تازہ ہوگئے ۔ خود زرکسیز کے دو بھائی لڑائی میں کام آئے ۔ لیکن آخر میں مدافعین کو پھر ہٹ کر فصیل کی پناہ لینی پڑی اور جب عقب سے قشون جاودانی کا حملہ ہوا تو وہ سمٹ کر ایک ٹیکرے تک آگئے اور یہیں دشمنوں کے نرغے میں گھر کے لڑتے رہے یہاں تک کہ سب کے سب کٹ کے گر پڑے ؂

کچھ عرصے بعد اسپارٹہ میں ایک منار تعمیر کیا گیا تھا جس پر لیونی ڈس اور اس کے ۳ سو ساتھیوں کے نام مرقوم تھے ۔ انہی میں ڈینکیس کا نام بھی نظر آتا ہے اور اسی سے ایک مشہور "مُٹ" یعنی برجستہ فقرہ منسوب ہے جس سے اسپارٹہ کے سپاہیوں کی حالتِ خطر میں خوش دلی اور بے پروائی ظاہر ہوتی ہے :۔ جب اُس سے کسی نے بیان کیا کہ ایرانی سپاہ کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اُن کے تیروں سے آفتاب چھپ جاتا ہے تو اُس نے کہا "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ ہم چھاؤں میں لڑائی لڑیں گے"۔

تھرموپلی کے واقعے کی خبر بہت جلد ارتمی زیوم پہنچ گئی اور سنتے ہی یونانیوں نے جہازوں کے لنگر اٹھا دئیے اور آبنائے یوری پوس سے گزر کر سواحل ایٹی کا پر چلے آئے ؂

۴۔ جنگِ سلامیس

اس طرح جب یونان کا اندرونی دروازہ ٹوٹ گیا اور وہاں کی سر برآوردہ ریاست کا بادشاہ (لیونی ڈس) مارا جاچکا تو پھر دُور تک زرکسنر کو روکنے والا کوئی نہ رہا۔ وہ **لوکریس، فوکیس** اور پھر **بیوشیہ** کے علاقوں میں بغیر مزاحمت بڑھا چلا آیا اور **تھبز** وغیرہ **بیوشیہ** کی اکثر ریاستوں نے اُس کے آگے سرِ اطاعت خم کردیا۔

ادھر جب ایتھنز کی بحری فوج **ارتمی زیوم** سے لوٹی تو معلوم ہوا کہ **پلوپنی سس** والوں کی سپاہ خاکنائے پر مجتمع ہو رہی ہے اور سمندر سے سمندر تک ایک فصیل تیار کرنے میں مصروف ہے۔ بالفاظ دیگر، **بیوشیہ** اور **اٹی کا** کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں کیا گیا۔ اس صورت میں **تمس طاکلیس** اور دیگر حکّام شہر نے فیصلہ کیا کہ **ایتھنز** کو خالی کردیا جائے اور منادی کردی کہ جو لوگ اپنے اہل وعیال اور مال و متاع کو کسی دوسرے مقام پر پہنچا سکتے ہیں وہ وہاں پہنچادیں اور باقی تمام اہل شہر جنگی جہازوں میں سوار ہوجائیں؛ اس کی تعمیل ہوئی۔ یعنی عورتیں اور بچے **ترزن، اجی نا** اور **سلامیس** میں پہنچا دئیے گئے؛ جہازوں میں نقل مکان کرنے کی یہ عاقلانہ اور دلیرانہ تدبیر وقتی مجبوری پر مبنی تھی لیکن لوگوں نے فرض کرلیا تھا کہ یہ کام اُس ربّانی قول

کی بناء پر کیا گیا ہے جس میں پیشین گوئی کی گئی تھی کہ "سوائے چوبی دیوار کے" تمام اٹیکا برباد و خراب ہو جائیگا؛ پس لوگ کہتے تھے کہ "چوبی دیوار" کے لفظ سے کنایۃً جہاز مراد ہیں؛ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ بعض غریب شہری اس قول کے لفظی معنی پر اڑے رہے اور قلعے میں تختوں کی قنات روک کر وہیں ٹھیرے رہے تھے؛ مگر قرینہ کہتا ہے کہ اکروپولس کے قدرتی استحکام پر بعض اشخاص کو بھروسہ تھا کہ شاید وہ تسخیر نہ ہو۔ اور اس لئے وہ رہ گئے تھے؛ اسی پر بعد میں یہ کہانی لوگوں نے گھڑ لی؛

اس عرصے میں اتحادیوں کا بیڑا آبنائے سلامیس میں آگیا تھا۔ اُسے تازہ فوج سے کمک بھی مل گئی اور اب اس میں کُل ۳۷۸ سہ طبقہ اور ۷ پچاس چپّو کے جنگی جہاز شامل تھے؛

غالباً نویں ستمبر ۴۸۰ھ ق م کے دن زرکسنز ایتھنز پہنچا اور قریب قریب اسی وقت ایرانی بیڑا فالرُن کے کنارے سے آن لگا؛ تمام شہر خالی ہو چکا تھا اور صرف اکروپولس اپر ایک قلیل گروہ خندقیں کھودے چوبی دیوار کی آڑ میں پڑا تھا۔ ایرانی سپاہی پہلے آریوپاگوس کے نشیبی حصّے پر چڑھے۔ اس کے اور اکروپولس کے درمیان صرف ایک چوڑا ٹیکرا حایل ہے۔ پس یہاں سے جلتے ہوئے تیر پھینک پھینک کر انھوں نے یونانیوں کی چوبی قنات کو آگ لگادی۔

مدافعین نے اُن پر اوپر سے پتھر لڑھکانے شروع کئے اور قلعے کا محلِ وقوع کچھ قدرتاً ایسا ہے کہ یہ محاصرہ دو ہفتے تک ہوتا رہا۔ آخر قلعے کے شمال میں سلامی دار پہلو کے ایک چور راستے سے ایرانی کسی نہ کسی طرح اُوپر چڑھ آئے۔ اور تمام یونانیوں کو قتل کردیا اور مندروں کو لوٹ کے آگ لگادی ؛

اکروپولس کی تسخیر کے بعد یونانی سردارانِ بحر نے ایک جنگی مجلس مشورۃ منعقد کی اور کثرتِ رائے سے یہ قرار پایا کہ وہ یہاں سے خاکنائے کورنتھ پر ہٹ جائیں کہ برّی افواج کے اتّصال کے علاوہ وہاں پیچھے ہٹنے کی بھی دُور تک گنجائش ہے۔ حالانکہ سلامیس میں اُن کا سلسلہ آمد و رفت منقطع ہو جائے گا ؛ اس فیصلے کے معنی یہ تھے کہ اجی نا، سلامیس اور مگارا تینوں کی حفاظت سے ہاتھ اٹھا لیا جائے ؛ ثمس طاکلیس چاہتا تھا کہ ایسا نہ کرنے دے چنانچہ وہ تنہائی میں یوری بیاڈس کے پاس گیا اور اس کے دلنشیں کردیا کہ خاکنائے کی کھلی خلیج میں لڑنے کی نسبت یونانیوں کا کہیں زیادہ فائدہ اسی میں ہے کہ آبنائے سلامیس کی تنگ کھاڑیوں میں مقابلہ کیا جائے جہاں دشمن کے جہازوں کی کثرت اور تیز رفتاری اس کے کچھ کام نہ آئیگی۔ غرض پھر مشورہ کیا گیا اور اس جلسے میں اپنی تجویز منوانے کے لئے ثمس طاکلیس

دھمکی بھی دینی پڑی کہ اگر خاکنائے کورنتھ پر ہٹنے کا فیصلہ کیا گیا تو اہل ایتھنز (جو آدھے بیڑے کے شریک تھے) اتحادیوں کا ساتھ چھوڑ دینگے اور مغرب میں کسی اور سرزمین پر جابسیں گے ؂

جزیرۂ سلامیس اور ایٹی کا کے درمیان اس تنگ آبنائے کے جنوب مشرق میں سیتالیا کے ٹاپو اور ایک لمبی راس نے جو ایٹی کا کی جانب نکل آئی ہے راستے کو اور بھی گھیر رکھا ہے۔ اسی راس کے کچھ اوپر شہر سلامیس کے قریب یونانی بیڑا لنگر انداز تھا؛ پس زرکسنر نے اپنا بیڑا آگے بڑھا کے آبنائے کے اس راستے کو روک لیا اور دن ڈھلے تک سیتالیا پر قبضہ کرلیا۔ (قیاساً ۲۷ ستمبر)۔ دشمن کی اس چال سے یونانی بہت گھبرائے۔ پلوپنی سس کے سرداران بحر نے یوری بیاڈس پر دباو ڈالا اور پھر مجلس مشورۃ طلب کی گئی اور تمس طاکلیس کو نظر آیا کہ اتنی محنت اور عرق ریزی سے جو کچھ نتیجہ حاصل ہوا تھا وہ پھر برباد ہوتا ہے لہذا اُس نے ارادہ کرلیا کہ جو ہو سو ہو اس موقع پر ایک چال چلنی چاہئیے۔ اُس نے اہل مشورۃ کو تو وہیں چھوڑا اور باہر آکے سی کنوس نامی ایک غلام کو ایرانی فرودگاہ کی طرف روانہ کیا اور زرکسنر کا خیر خواہ بن کر یہ پیام کہلا بھیجا کہ یونانیوں نے راتوں رات جہاز نکال لے جانے کا ارادہ کرلیا ہے اور

اگر انہیں یہیں روک لیا گیا تو ایران کی فتح میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کیونکہ یونانی سپاہ میں اس وقت نفاق ہے۔ ایرانیوں کو اس پیام کا یقین آگیا اور زرکسنر نے رات ہوتے ہی اس بات کا انتظام کرلیا کہ یونانی جہاز سلامیس اور مگارا کی مغربی آبنائے سے بچکر نکلنے نہ پائیں۔ چنانچہ اُس نے دو سو مصری جہاز روانہ کئے کہ سلامیس کی راس کے گرد ہوکر دوسری طرف آنکلیں کہ اگر ضرورت ہو تو آبنائے کا مغربی راستہ بند کیا جا سکے ٭

ادھر یونانی سرداران بحر قیل و قال میں ہی مصروف تھے کہ کسی نے باہر سے تمس طاکلیس کو آواز دے کر پکارا۔ یہ اُس کا قدیم حریف ارس تدنیر تھا جو اجی نا سے جہاز میں آیا اور یہ خبر لایا تھا کہ یونانی بیڑے کو غنیم نے گھیر لیا ہے۔ تمس طاکلیس نے اُسی کی زبانی یہ خبر دوسرے سرداروں کو کرادی اور اُسی وقت ایک تنوسی جہاز آیا جو ایرانی بیڑے کا ساتھ چھوڑ کر یونانیوں سے آملا تھا اس کے آدمیوں نے مذکورہ بالا خبر کی تصدیق کی ٭

اس طرح تمس طاکلیس اور ایرانی بیڑے نے یونانیوں کو سلامیس میں جنگ کرنے پر مجبور کردیا۔ اس کائی لوس شاعر نے یہ جنگ بچشم خود دیکھی تھی۔ ایرانی بیڑے کی نسبت وہ بیان کرتا ہے کہ وہ آبنائے کے راستے پر تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ بائیں پر اخیر میں جو دستہ غالباً

آیونی جہازوں پر مشتمل تھا اسے سیتالیا اور ساحل سلامیس کے مابین گزرگاہ کی حفاظت سپرد تھی۔ دوسرا دستہ اس ٹاپو کے عقب میں غالباً پیرئیوس تک پھیلا ہوا تھا اور آبنائے کے بڑے راستے پر اس کی نگرانی تھی۔ بیڑے کا میمنہ، یعنی تیسرا حصہ دوسرے سے کچھ آگے اور شاید ساحلِ ایٹی کا سے ٹاپو کے اندرونی گوشے تک آبنائے کے دوسرے حصے پر متعین کیا گیا تھا۔



اور اس میں فنیقیہ کے جہاز تھے جن پر زرکسنر کو سب سے زیادہ بھروسہ تھا۔ یونانیوں نے اپنے جہاز شہر سلامیس سے ہراکلیس کے مندر تک پھیلائے تھے جو ساحل ایٹی کا پر واقع تھا۔ انکے میسرے پر ایتھنز کے جہاز تھے اور میمنہ اسپارٹہ اور اجی نا کے جہازوں کا تھا۔ دارائے ایران

کے واسطے کوہ ای گالیوس کے نیچے ایک بلند تخت لگایا گیا تھا کہ وہاں سے وہ بچشم خود جنگ کا تماشا اور اپنے آدمیوں کی کارگزاری ملاحظہ کرے ؎

سپیدۂ سحر کے نمودار ہوتے ہی (غالباً ۲۰ ستمبر) یونانیوں نے بڑھنا شروع کیا اور سامنے سے فنیقیہ کے جہازوں کی قطار ان سے بھڑ جانے کے لئے حرکت میں آئی۔ لیکن ایرانیوں کے باقی دونوں دستے غالباً جہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔ جنگ کا آغاز یونانیوں کے میسرے سے ہوا اور یہیں فنیقیہ اور ایتھنز والوں پر اس کا بار سب سے زیادہ پڑا۔ جگہ کی تنگی نے ایرانیوں کو یہ موقع ہی نہ دیا کہ وہ کثرت تعداد سے دشمن کو مغلوب کر لیتے۔ اور جہازوں پر ہجوم کرنے کی جو کوششیں انہوں نے کیں وہ خود ان کیلئے سخت نقصان رساں ثابت ہوئیں؛ دوسری جانب یونانیوں کے دائیں بازو کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح بنے دشمن کی صف توڑ کر آبنائے کے باہر ہو جائے اور پلٹ کر اس کے عقب سے حملہ آور ہو۔ سلامیں کی راس کو چکّر دے کر غنیم کے اُس دستے پر حملہ کرنا جو سیتالیا کے قریب متعیّن تھا، اجی نا والوں کا کام تھا اور وہ غنیم کے جہازوں کی صف توڑ کر نکل گئے تھے چنانچہ بعد میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھاگتے ایرانیوں کا راستہ روک رہے ہیں۔ اور قرینہ کہتا ہے کہ آیونی دستے کی صفیں درہم برہم کرنے کے بعد

اُنھوں نے فنیقیہ والوں پر جناحی حملہ کیا تھا۔ واقعہ جو کچھ ہو، اُس میں شک نہیں کہ اُنہی کی کامیابی نے اہل فنیقیہ کی حالت کو مخدوش اور جنگ کا فیصلہ کردیا؛ ارس تدیز اس وقت یونانی پیادوں کا ایک دستہ لئے سلامیس کے ساحل سے لڑائی کا رنگ دیکھ رہا تھا اجی نا والوں کے غلبے نے اُسے بھی یہ موقع دیا کہ وہ تنگنائے کو عبور کرکے سیتالیا پر جا اُترا اور زرکسنر نے جو دستۂ فوج یہاں متعین کیا تھا اُسے قتل کردیا؛ بحری جنگ صبح سے شروع ہوئی تھی اور بعد غروب ختم ہوئی؛

اپنے بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے، ایرانیوں نے دلیری سے لڑنے میں کمی نہ کی تھی لیکن ان کے سردار اچھے نہ تھے اور لڑائی کا مقام اُن کے حق میں ایسا بُرا تھا کہ خود اُن کی کثرت تعداد انکے لئے مصیبت ہوگئی تھی؛

جنگ سلامیس کے متعلق جو قصّے بیان کئے جاتے ہیں ان میں سب سے مشہور کاریہ کی ملکہ، ارتمیزیہ کی عجیب جرات اور نیز یاوری قسمت کا وہ قصّہ ہے جو ہالی کرناسوس میں زبان زد خاص و عام تھا؛ کہتے ہیں کہ اس ملکہ نے خود اپنے ملک کے ایک اور جہاز پر حملہ کرکے اُسے ڈبو دیا اور اس چال سے اپنی جان بچالی۔ زرکسنر کے گرد و پیش جو لوگ کھڑے تھے اُنھوں نے بھی یہ واقعہ دیکھا لیکن یہ سمجھے کہ ارتمیزیہ نے جس جہاز کو ڈبویا وہ یونانی تھے

چنانچہ بادشاہ سے کہنے لگے "حضور نے ملاحظہ فرمایا۔ کس خوبی سے ارتمیزیہ نے دشمن کا جہاز غرق کیا ہے؟" زرکسنر جوش میں آکے بولا "ہاں میرے آدمی، عورتیں، اور میرے ہاں کی عورتیں، مرد بن گئی ہیں"

۵۔ جنگِ سلامیس کے نتایج

سلامیس کی یونانی فتح سے ایرانیوں کی بحری قوّت کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور اس کے بعد ہی اُن کے فنیقی باجگزار ساتھ چھوڑکر چل دیئے۔ لیکن وہ یونانی روایت جس میں، زرکسنر کا خوف سے بے حواس ہوکر دردانیال کو بھاگنا، بیان کیا گیا ہے، صورت واقعہ کی غلط تعبیر ہے۔ زرکسنر کو خشکی پر کوئی شکست نہ ہوئی تھی اور اس کے سپاہیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ اب بھی یونان کو فتح کرسکتا تھا۔ لیکن اُسے اندیشہ یہ ہوگیا تھا کہ جب اس بحری شکست کی خبر آیونیہ میں پہنچیگی تو وہاں بغاوت ہوجائیگی پس ایرانی بیڑا واپس بھیج دیا گیا کہ دردانیال کے پُل کی حفاظت کرے اور خود زرکسنر ۶۰ ہزار آدمی لیکر تھسالیہ اور مقدونیہ کے راستے واپس ہوا تاکہ یہ طویل راہِ آمد رفت کُھلی رہے۔ برّی افواج کی سپہ سالاری پر اُس نے مردونیوس کو مامور کردیا تھا اور اُس نے سردی آتے دیکھکر آیندہ موسم بہار تک، جنگ ملتوی کردی اور موسم

تھسالیہ میں گزارنے کا فیصلہ کیا؛
ادھر یونانی، جنگ کے بعد اپنی فتح سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ایرانی فوجوں کی واپسی کے وقت اسپارٹہ کا اتالیقِ سلطنت، کلیومبروتوس، خاکنائے سے پیش قدمی کرنے والا تھا کہ ایرانیوں کے بوشیہ میں پہنچنے سے پہلے ایک ضرب لگائے۔ لیکن روانگی کے وقت قربانی کرتے ہیں، سورج بالکل گہنا گیا (دوپہر ۲ اکتوبر ۴۸۰ ق م) اس فال بد نے اُسے اپنے ارادے سے باز رکھا اور وہ واپس پلوپنی سس چلا گیا؛

اس فتح پر، جس کی اتنی کم امید تھی، یونان میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ مال غنیمت کی تقسیم اور بہادری کا صلہ دینے کی غرض سے تمام سردار خاکنائے کورنتھ پر جمع ہوئے اور غنیمت کا سب سے منتخب حصہ اہل اجی نا کو ملا۔ بہادری میں ایتھنز کو دوسرا درجہ دیا گیا اور فراست و دانائی کا انعام دینے کے واسطے، ہر سردار سے کہا گیا کہ وہ بہ لحاظ قابلیت دو نام بہ ترتیب لکھدے۔ مگر مشہور ہے کہ ہر شخص نے پہلے اپنا نام لکھا اور اُس کے بعد تمس طاکلیس کا اور اس طرح کسی کو بھی انعام نہیں ملا۔ کیونکہ جب درجہ اول ہی کا تصفیہ نہ ہوسکا تو پھر دوسرے درجے کا انعام بھی کسی کو نہ مل سکتا تھا؛ اس کامی لوس نے جو خود لڑائی میں شریک تھا

زرکسنر کی ناکامی کو ایک ڈراما کا موضوع بنایا۔ اور یہ معرکہ آرا تاریخی افسانہ جس میں خود اپنے زمانے کا ایک واقعہ دکھایا گیا ہے۔ اب تک دُنیائے ادب میں سلامت ہے۔ لیکن اُس کے ڈراما "ایرانی" سے کہیں زیادہ مشہور اور کہیں بڑی کتاب وہ تھی جو ایرانی لڑائیوں کے طفیل (اگرچہ کچھ عرصے کے بعد) ابوالمورخین، ہیروڈوٹس نے تیاّر کی۔ کیونکہ یہی لڑائیاں دیکھ کر یورپ و ایشیا کی دائمی جدّ و جہد کا مضمون اُس کے دِل میں القا ہوا تھا۔

۶۔ دوسرے معرکے کی تیاّریاں

اگلے موسمِ بہار میں آرتا بازو اور وہ فوجیں جو زرکسنر کو دردانیال پہنچانے گئی تھیں مردونیوس کے ساتھ آملیں ایرانی سپاہیوں کی کُل تعداد، متحقق نہیں مگر بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تین لاکھ تھی۔ مردونیوس کو ایتھنز اور پلوپنیسس والوں کے نامُبارک اختلافات کا بخوبی علم تھا اور اسی لئے اُس نے ایک معزز سفیر، یعنی خود مقدونیہ کے بادشاہ سکندر کو ایتھنز بھیجا اور نہ صرف ایرانی حملے کے تمام نقصانات کی تلافی پر آمادگی ظاہر کی بلکہ نیا علاقہ لینے میں بھی امداد کا وعدہ کیا اور اس کے معاوضے میں صرف یہ چاہا کہ ایتھنز ایک خود مختار اور برابر کی سلطنت بنکر، دولتِ ایران کی حلیف ہوجائے۔ ان شرائط کو

سُن کر جی ضرور للچاتا تھا اور اپنے یونانی اتحّادیوں سے اہل ایتھنز کی بے اعتباری بھی بے وجہ نہ تھی لیکن اُنھوں نے سکندر کو جواب دیا کہ ”مردونیوس سے کہدینا کہ ایتھنز والے کہتے ہیں، جب تک سورج کا دَور، یہی ہے، اس وقت تک ہم کبھی زرکسیز کے ساتھ صلح نہ کریں گے“۔

اس سفارت نے اہل ایتھنز کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ پلوپنی سس والوں پر شمالی یونان کی مدافعت کے متعلّق زیادہ زور دیں۔ چنانچہ اہل اسپارٹہ نے وعدہ بھی کیا کہ بیوشیہ میں فوج بھیجی جائیگی۔ لیکن سکندر کی سفارت کے تھوڑے ہی دن بعد اُنھوں نے خاکنائے کی فصیل پوری تیاّر کرلی اور جب اپنی حفاظت کا اطمینان ہوگیا تو پھر اُنھوں نے ایفائے وعدہ کی پروا نہ کی۔ اور جس طرح ایک سال پہلے کارنیہ کے تہوار کا عذر کردیا تھا اب ہیاکن تیہ نامی تہوار کا حیلہ پیش کردیا! اُدھر سپہ سالار مردونیوس نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور ایٹی کا پر دوبارہ قابض ہوجانے کی غرض سے، بیوشیہ میں بڑھ آیا (۴۷۹ ق م)۔ ایتھنز والوں کو پھر اپنی زمین چھوڑنی پڑی اور اہل و عیال اور سامان کو پھر سلامیس کے مامن میں منتقل کرنا پڑا۔ اُس وقت بھی مردونیوس کو اُمید تھی کہ وہ ایتھنز کو یونان کی جانب سے توڑلیگا۔ اور اب بھی اُن کے ملک کو بغیر تاراج کیئے واپس جانے پر آمادہ

تھا بشرطیکہ وہ اس کی سابقہ شرائط مان لیں؛ لیکن اس پریشان حالی میں بھی اہل ایتھنز نے اس کی شاطرانہ تحریک پر کوئی اعتنا نہ کی؛ ساتھ ہی، ایتھنز، مگارا، اور پلاٹیہ تینوں ریاستوں کی طرف سے ایلچی اسپارٹہ روانہ کئے گئے کہ اٹی کا میں ایرانیوں کے مقابلے کے لئے فوراً فوج بھیجے جانے پر اصرار کریں۔ اور جتا دیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو انہیں دشمن سے صلح کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ رہے گا؛ آخر حکومتِ اسپارٹہ نے ایکبارگی اپنی روش بدلی اور پانچہزار اسپارٹی سپاہی جن میں ہر ایک کے ہمراہ چند ہلوت تھے، شمالی یونان کو روانہ کئے گئے۔ واضح ہو کہ اسپارٹہ کے شہری ایک ہی مرتبہ اتنی تعداد میں نہ تو شاید پہلے لڑنے نکلے تھے اور نہ بعد میں کبھی مجتمع ہوئے۔ اُن کے عقب میں ۵ ہزار پری اویکی تھے جن میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ہلوت تھا۔ منصب سپہ سالاری پوسے نیاس کو تفویض ہوا تھا جو اپنے بھائی یعنی تھرموپلی کے سورما لیونی ڈس کے صغیر سن بچے پلیس تارکوس کا ولی تھا؛ خاکنائے کورنتھ پر اسپارٹہ کی فوج میں اتحادیوں کی فوجیں اور یوبیہ، اجی نا اور مغربی یونان کے بعض امدادی دستے بھی آملے۔ مگارا میں مگاری سپاہ نے اور الیوسیس کے مقام پر ۶ سو پلاٹیہ اور ۸ ہزار ایتھنزی سپاہیوں نے شرکت کی جن کا سپہ سالار

ارس تدیز تھا۔ یہ تمام فوج پیادوں کی تھی اور نیم مسلح سپاہیوں سمیت اس کا کُل شمار شاید ۷۰ ہزار کے قریب تھا؛

مردونیوس نے اپنا اصلی مستقر تھبز کے مضبوط قلعے کو قرار دیا تھا اور اس میں کافی ذخایر فراہم کرلیئے تھے۔ پھر جب یونانی فوج ایک مرتبہ مقابلہ پر اُٹھ کھڑی ہوئی تو اُس نے ایٹی کا میں رہنا پسند نہ کیا کہ اس میں ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ دشمن تھبز سے رسل و رسایل کا راستہ نہ روک دے اور دوسرے ایٹی کا میں بند ہوکر اُسے سامانِ رسد خاطر خواہ نہ مل سکتا تھا کہ یہ علاقہ پچھلے سال ہی تاراج و پامال ہوچکا تھا؛ نظر برایں، وہ بیوشیہ میں ہٹ آیا اور اسوپس ندّی پر اُس جگہ خیمہ زن ہوگیا جہاں ایتھنز سے تھبز آنے والی سڑک کوہ سِتھیرُن کے اُتار پر ندّی کو عبور کرتی ہے۔ یہاں قیام کرنے میں مردونیوس کا خاص مقصد یہ تھا کہ لڑائی میں تھبز اُس کی پُشت پر رہے؛ اس موقع پر ایرانیوں کو جس قدر اطمینان ہو بجا تھا۔ اگر بہت ہی زیادہ نہیں تو بھی وہ تعداد میں زیادہ ضرور تھے اور اس کے سوا اُنہیں جو سپہ سالار ملا وہ بھی فریقِ مخالف کے تمام سپہ سالاروں سے زیادہ قابل تھا؛ لڑائی کرنے میں مردونیوس کو کچھ عجلت نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جتنے

دن زیادہ یونانی فوج میدان میں رہیگی اسی قدر مختلف
فوجوں کے باہمی نفاق و حسد سے اُس کی شیرازہ بندی
میں خلل واقع ہوگا۔ باقی یہ کہانی جسے یونانی بعد میں یقین
کرکے خوش ہوتے تھے کہ اُس وقت ایرانی لشکر میں
ایک خاص قسم کی بد دلی اور آنے والی مصیبت کا ہراس
پیدا ہوگیا تھا، ہماری نظر میں کچھ بہت معتبر نہ ہونی چاہیے۔

۷۔ جنگ پلاٹیہ

جس میدان میں یونان کی قسمت کی آزمائش ہوئی
وہ شمال میں اسوپوس ندی اور جنوب میں کوہِ سِتھیرُن
سے محدود ہے۔ اس میدان کے جنوب مغرب میں
پلاٹیہ کی آبادی اُن چھ مغربی گھاٹیوں پر آباد تھی جہاں
پہاڑ بتدریج نیچا ہوکے میدان سے مل گیا ہے۔ یہاں
سے بیوشیہ کو تین راستے اُترتے تھے۔ مشرق میں
سب سے آخری ایتھنز اور تھیبز کی سڑک تھی۔ وسط میں
ایتھنز سے اور مغرب میں مگارا سے پلاٹیہ آنے کے راستے
تھے۔ یونانی فوج نے سب سے مشرقی راہ اختیار کی تھی
جو شاہ بلوط کے درے سے گزر کے پہاڑ کی بہت نیچی
ڈھلان سے ہوتی ہوئی بیوشیہ کے علاقے میں پہنچتی ہے۔
لیکن جب وہ پہاڑ کے دوسرے رُخ پہنچے تو دیکھا کہ
اسی راستے کے دونوں طرف ایرانی لشکر پڑا ہے۔ پس انہیں

درے کے دامن میں پڑاو کرنا پڑا - اس طرح کہ دایاں بازو، جس میں اسپارٹہ اور تیگیا کے سپاہی تھے، پہاڑ کی اس برج نما بلندی پر تھا جو قصبہ اِری تھری کے شمال میں واقع ہے۔ قلبِ فوج قصبے کے قریب کسی قدر نشیب میں تھا اور بایاں بازو جس میں ایتھنز اور مگارا کے سپاہی متعین کئے گئے تھے ڈھلان کے سرے تک آگے بڑھا ہوا تھا۔ اور اسی بازو پر سامنے سے حملہ ہوسکتا تھا ؂

۱۷۴



چنانچہ مردونیوس نے اسی طرف اپنے سوار ماسیس تیوس

کی ماتحتی میں روانہ کئے۔ مقابلہ مگارا والوں سے شروع ہوا۔ اُن کے پاس مدد کے لئے سوار نہ تھے پس دشمن کے تیر اور برچھیوں سے پریشان ہوکر اُنھوں نے کمک طلب کی۔ اور ایتھنز کے تین سو جوان بالائی رُخ سے لڑائی کے میدان میں اُترے اور آخر کار جنگ کا پانسہ اس وقت پلٹ گیا جب ماسیس تیوس نیچے گرا اور بہ مشکل قتل ہوا۔ کیونکہ اس کے زرہ بکتر پہ کوئی ہتیار کارگر نہ ہوتا تھا یہاں تک کہ ایک برچھی آنکھ پر لگی تب اس کا کام تمام ہوا۔ اپنے سردار کی نعش چھین لینے کے واسطے ایرانی سواروں نے تیز و تند حملہ کیا مگر ناکامی ہوئی۔ پھر وہ میدان سے ہٹ گئے +

لیکن اس کامیابی سے یونانیوں کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ ایرانی جہاں پڑے تھے اطمینان سے وہیں پڑے رہے۔ اُن کے جنگی مورچے اور لشکرِ عظیم اسی طرح اسوپوس کے پل کے قریب راستہ روکے ہوئے تھے۔ یونانی سپہ سالار پوسے نیاس کو تھبز پر حملہ کرنے کی لَو لگی ہوئی تھی۔ کچھ اس غرض سے اور کچھ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ تاخیر سے اس کی فوج میں ابتری پیدا ہوجائیگی، اُس نے اسوپوس کو اُس مغربی راستے سے عبور کرنے کا فیصلہ کیا جو پلاٹیہ سے سیدھا تھبز کو جاتا تھا۔ اور پہاڑ شمال مغرب کی طرف

قصبۂ اری تھری اور قصبۂ ہیسای کے قریب سے گزرا؛ واقعاتِ جنگ کو سمجھنے کے لئے یہ لحاظ رکھنا چاہئے کہ کوہ ستھیرُن اور اسوپوس ندّی کے درمیان زمین کے دو حصّے ہوگئے ہیں جن کے بیچ میں نشیب ہے۔ ان میں جنوبی حصہ وہ ہے جس کی چھ گھاٹیوں کا اوپر ذکر آچکا ہے اور جس میں کئی نالے ہیں شمالی حصّہ بھی سنگستانی ہے اور اور اس کی تین گھاٹیوں کے بیچ میں چھوٹی چھوٹی ندّیاں بہتی ہیں؛ مگر مغرب میں یہ وسطی نشیب پھیل کر چپٹا میدان نکل آیا ہے جس میں پلاٹیہ سے تھبز جانے کا راستہ گزرتا تھا؛

اس راستے کی طرف بڑھنے میں قدرتی طور پر ایتھنز والے سب سے آگے تھے اور ایرانی سواروں کے مقابلے میں سب سے اوّل پُل اُترنے کا دشوار فرض انہی کو انجام دینا تھا۔ یونانی سپہ سالار کا جو مقصد تھا کہ دشمن کا تعلق اُس کے مستقر، تھبز سے منقطع کردیا جائے۔ وہ صرف اس صورت میں پورا ہوسکتا تھا کہ اس سے قبل کہ ہردونیوس کو اپنی فوجیں مغرب میں پھیلاکر یہ راستہ روکنے کی مہلت ملے، یونانی سپاہ بہ عجلت آگے بڑھ جائے؛ سو اس موقع کو ہاتھ سے کھودینے کی ذمہ داری اہل ایتھنز پر عاید ہوتی ہے کہ یہ انہی کے تذبذب و تاخیر کا نتیجہ تھا کہ ندّی عبور نہ ہوسکی۔ اور ساری فوج اس چپٹے میدان کی مشرقی حد پر پہنچکر تھم گئی جہاں قریب ہی گرگافیا

کے چشمے سے انہیں میٹھا پانی بہ افراط مل سکتا تھا۔ اُن کا یہ پڑاو۔ ندّی پار کے ایرانیوں کی نظر سے چھپا ہوا تھا اور بیچ میں اونچی زمین سے آڑ ہوگئی تھی۔ مگر پوسے نیاس نہایت متردّد تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ اُس کی پیش قدمی کا اصلی مقصد تھِبز کو جالینا تھا۔ وہ حاصل نہ ہوا۔ اور خود اس کی فوج نہایت محفوظ و مستحکم موقع چھوڑ کر اب ایک مخدوش مقام پر آگئی تھی۔ اس کے علاوہ کوہِ ستھیِرُن کے مشرقی دروں سے بھی اس کا قبضہ جاتا رہا تھا۔ اور یونانیوں کے ہٹتے ہی ایرانی سپہ سالار نے فوراً وہاں قدم جما لئے تھے بلکہ بار برداری کی ایک جماعت کو جو یونانی سپاہ کے واسطے رسد لارہی تھی، راستے میں کاٹ دیا تھا؛

معلوم ہوتا ہے کہ یونانی اسی بُرے موقع پر دو دن تک بے کار پڑے رہے اور غنیم کے سوار اُنھیں طرح طرح سے پریشان کرتے رہے۔ وہ ندّی اُتر اُتر کے آتے۔ گھاٹیوں کے اوپر منڈلاتے پھرتے اور یونانی لشکر پر برچھیاں پھینک پھینک کے مارتے تھے۔ حتّٰی کہ آخر میں انھوں نے گرگافیا کو پاٹ کر پانی بند کردیا تھا۔ تب پوسے نیاس نے مجلس مشورۃ طلب کی اور اس میں یہ طے پایا کہ فوج کا دایاں بازو اور لکدمونی سپاہی پھر مشرق کی جانب مڑیں اور مشرقی دروں پر قبضہ کرلیں؛ اس کارروائی کے لئے رات

کا وقت قرار پایا تھا اور اس کی اعانت و حفاظت باقی مانڈ فوج کے سپرد تھی جس کا کام یہ تھا کہ پہاڑوں کی طرف پیچھے ہٹتی آئے۔ پلاٹیہ کے کسی قدر جنوب مشرق میں پہاڑ کا بلند ٹکڑا جو ایک ہی ندی کی دو شاخوں کے درمیان گھرا ہوا ہے، "جزیرہ" کہلاتا تھا اور قلب و میسرہ کے ہٹنے کے واسطے یہی مقام تجویز کیا گیا تھا کہ یہاں وہ دشمن کے سواروں کی زد سے بچے رہیں۔ لیکن اس منصوبے پر بہت بُری طرح عمل ہوا۔ قلب کی فوج نے معلوم نہیں احکام کا مطلب غلط سمجھا یا اندھیرے میں اسے دھوکا ہوا، غرض وہ "جزیرے" تک نہ پہنچی بلکہ پلاٹیہ کی شہر پناہ سے کچھ ہی باہر ہیرا نامی مندر کے سامنے جا کے ٹھیر گئی اور اُدھر ایتھنز والوں نے اپنی جگہ سے حرکت ہی نہ کی اور سب سے الگ ہو کے ایک خطرناک موقع پر پڑے رہ گئے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی اس عدول حکمی کا سبب کیا تھا؛ بہر حال خود لکدمونی سپاہیوں نے رات کی قلیل فرصت میں کئی گھنٹے ضائع کر دئیے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی تعویق کی وجہ اَمُم فارِتوس کی ضد تھی۔ وہ اسپارٹہ کے ایک حصہ فوج کا سردار تھا اور جنگی مجلس میں شریک نہ ہوا تھا۔ اور اب واپسی کا حکم ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ آخر پوسے نیاس نے کوچ کا حکم دے دیا کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ سب کا ساتھ چھوٹتا

دیکھکر اس کا سرکش ماتحت بھی ضرور ہمراہ ہوجائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب فوج ایک میل کے قریب بڑھ آئی تو اہل اسپارٹہ نے دیکھا کہ اُمم فارِتوُس بھی آرہا ہے۔ پس وہ اس کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن اس عرصے میں رات گزرگئی اور صبح کی سفیدی پھیلنے لگی تھی۔ ایرانیوں کو معلوم ہوگیا کہ یونانی اپنا مقام چھوڑ گئے اور اُن کے سپہ سالار نے سوچ لیا کہ حملے کا یہی وقت ہے کہ غنیم کی فوجیں منتشر حالت میں ہیں۔ پس اوّل ایرانی سوار نکلے اور اُنھوں نے لکدمونیوں کو آگے جانے سے روکا۔ واضح ہوکہ اس وقت پوسے نیاس قصبۂ ہیساّی کے نیچے کی ڈھلانوں تک پہنچ چکا تھا جو اُسے پلٹ کر دشمن کے سواروں کا مقابلہ کرنا پڑا جن کی مدد پر خود ھردونیوس پوری فوج لئے چلا آرہا تھا۔ ایرانیوں نے اپنی لمبی لمبی چوبی ڈھالوں کی ایک باڑ کھڑی کرلی اور اس کی آڑ لیکر تیروں کا مینہ برسادیا۔ یونانی اس بلا میں متردد کھڑے تھے کیونکہ قربانیوں میں شگون اچھا نہ نکلا تھا۔ آخر پوسے نیاس نے ھرا دیوی کی مندر کی طرف دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور کاہنوں کو قربانیوں میں نیک فال نظر آئی۔ اب لکدمونی سپاہیوں کو قرار کہاں تھا وہ اور تیگیا کے سپاہی جو اُن کے ساتھ تھے آگے بڑھے اور ڈھالوں کی باڑ تک پہنچ کر اُنھوں نے دشمن کو پیچھے دھکیل دیا اور دِمتر

دیوی کے مندر کی طرف وباتے ہوئے لائے جو اُن کے سامنے ایک بلند مقام پر بنا ہوا تھا۔ اسی طرف بڑی گھمسان کی لڑائی پڑی اور یونان کے بہترین نیزہ بازوں نے اپنی قواعددانی کے جوہر دکھادئیے؛ اور جب مردونیوس گرا تو جنگ کا فیصلہ ہوگیا۔

آج کی لڑائی کا سب سے زیادہ بار تگیا اور اسپارٹہ کے جانبازوں نے اُٹھایا تھا۔ حملہ شروع ہوتے ہی پوسے نیاس نے ایتھنزی فوج کو ایک ہرکارا دوڑاکر اطلاع کردی تھی مگر جب وہ مقام جنگ کی طرف بڑھے تو اُن پر غنیم کی فوج کے یونانیوں نے حملہ کیا اور آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا؛ اُدھر باقی ماندہ یونانیوں کو جو پلاٹیہ پہنچ گئے تھے اطّلاع ملی کہ پوسے نیاس سے لڑائی چھڑگئی اور اُسی کا غلبہ ہے۔ وہ بہ عجلت میدان کی طرف روانہ ہوئے لیکن جب پہنچے تو لڑائی کا درحقیقت فیصلہ ہوچکا تھا؛ شکست خوردہ ایرانی فوجیں اسوپوس ندّی کے پار اپنی مورچہ بند چھاونی کی جانب بھاگیں مگر اسے بھی تعاقب کرنے والے یونانیوں نے ہلّہ کرکے چھین لیا؛ مردونیوس کا خیمہ تگیا والوں نے لُوٹا تھا اور اس کے گھوڑوں کے دانے کا برنجی برتن اپنے شہر کے مندر (اتھنا الیا) میں چڑھایا تھا۔ مگر اس کا تخت، چاندی کی کھڑاوں اور تیغہ ایتھنز والے

لائے اور اس فیصلہ کن معرکہ کی یادگار ہیں، ماسیس تیوس کے چار آئینہ کے ساتھ اکروپولس میں رکھ دیا؛ یونانی مقتولین کو، جن میں بہادر امُم فارتوس بھی تھا، پلاٹیہ کے دروازوں کے سامنے دفن کیا گیا اور اُن کی برسی منانے کی عزت اہل پلاٹیہ کو دی گئی نیز پوسے نیاس نے سارے لشکر کو جمع کر کے اسپارٹہ اور تمام متحدین کی جانب سے اعلان کیا کہ وہ پلاٹیہ کی بستی اور علاقے کی خود مختاری کے ہمیشہ ضامن رہیں گے؛ مگر پلاٹیہ کے لئے جو زمانہ یُمن و فتح کا تھا وہی تھبز کی ذلت و سرنگونی کا وقت ہے کیونکہ جنگ کے دس ہی دن بعد یونانی فوج بیوشیہ کے اس صدر شہر کی طرف بڑھی اور مطالبہ کیا کہ ایرانیوں سے مل جانے والے گروہ کے سرغنہ حوالے کر دئے جائیں۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ رشوت دے کر سزا سے بچ جائیں گے اور خود انہی کے خواہش کے مطابق اہل شہر نے انہیں متحدین کے حوالے کر دیا۔ لیکن پوسے نیاس نے بغیر باضابطہ تحقیقات و سماعتِ جرم کورنتھ پہنچ کر اُن کو مروا ڈالا ؛

۸۔ جنگ ما ئیکیل و تسخیر سستوس

سلامیس کی طرح کوہ ستھیرُن کی مذکورہ بالا جنگ کو بھی یہ مرتبہ ملا ہے کہ وہ تاریخ عالم کی فیصلہ کُن لڑائیوں میں شمار ہو۔ اور پنڈار (شاعر) نے اسی حیثیت سے کہ ایک اتھنز

کی بہت بڑی فتح تھی اور دوسری اسپارٹہ کی، ان دونوں کو ایک لڑی میں پرویا ہے۔ حق یہ ہے کہ پلاٹیہ میں سوار فوج کے نہ ہونے کے باوجود، اسپارٹہ نے اپنی پسپائی کو فتح کردکھایا تھا۔ لڑائی کا سب سے قابلِ لحاظ واقعہ یہ ہے کہ طرفین سے صرف ایک حصّۂ فوج ہم نبرد ہوا اور اسی پر جنگ کا فیصلہ ہوگیا۔ اس کے اصلی فاتح اسپارٹہ اور تگیاؔ کے سپاہی تھے۔ اور اُدھر ایرانیوں کی جانب آرتا بازو نے، جس کے زیر علم ۴۰ ہزار سپاہی تھے، لڑائی میں مطلق حصّہ نہیں لیا تھا اور جب مردونیوس مرا تو یہ سردار بھرکر، بلا تاخیر دردانیال کے طویل سفر پر چل کھڑا ہوا۔ اور آج کے بعد سے پھر دولتِ ایران کو نصیب نہ ہوا کہ یورپی یونان کی آزادی پر کوئی بڑا حملہ کرتی۔ چنانچہ اگلی ڈیڑھ صدی تک یونان و ایران میں جو سابقہ رہا اس کا اثر ایشیا کے مغربی کنارے تک محدود ہے اور اس کے بعد سکندرِ مقدونوی میدان میں آتا ہے اور اس ایشیائی سلطنت کے خلاف وہ کردکھاتا ہے جو زرکسنر یورپ کی چند آزاد ریاستوں کے خلاف نہ کرسکا تھا؛

یونانی فوج کے اس کارنمایاں کے تھوڑے ہی دن بعد یونانی بیڑے نے وہ کارنمایاں دکھایا جس نے ایشائی یونانیوں کو اپنے آقا کے پنجے سے نجات دلائی۔ (اگست سنہ ۴۷۹ ق م) شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ یونانی بیڑا

شاہِ لیوتی کی داس کی زیرِ قیادت جزیرۂ دلوس (ڈیلوس) تک بڑھ آیا تھا۔ یہاں اہل ساموس کا پیام پہنچا جس میں التجا کی گئی تھی کہ ایرانیوں کے خلاف ان کی اور ان کے یونانی حلیفوں کی مدد کی جائے۔ کیونکہ ایرانی بیڑا ساموس پر تھا اور قریب ہی راس مای کیل پر اُن کی ایک بڑی فوج خیمہ زن تھی۔ اور اس فوج میں بہت سے آیونی سپاہی بھی شامل تھے۔ غرض اہل ساموس کی درخواست منظور ہوئی لیوتی کی داس جزیرے کی طرف بڑھا اور اس کو آتا دیکھ کر ایرانی جہاز راس مای کیل اور اپنی برّی فوج کی پناہ میں ہٹ گئے۔ یونانی بھی ساحل پر اُتر پڑے۔ حملہ کیا اور دشمن کی قیام گاہ چھین کر آگ لگا دی۔ اس فتح کی تکمیل آیونی سپاہیوں کی بدولت ہوئی جنھوں نے ایرانیوں کا وقت کے وقت ساتھ چھوڑ دیا اور آج کے یادگار معرکے میں اپنی ملکی آزادی جیت لی۔ مای کیل اور پلاٹیہ کی لڑائیاں اس قدر قریب زمانے میں یکے بعد دیگرے واقع ہوتی تھیں کہ لوگوں نے اس روایت کو بلا وقت باور کرلیا کہ یہ دونوں معرکے ایک ہی سہ پہر کو یونانیوں نے جیتے۔ البتہ یہ روایت کسی حد تک قابلِ اِعتناء ہوسکتی ہے کہ عین اسوقت جب اہل ایتھنز اور ان کے ساتھی دشمن کی خندقوں پر حملہ کر رہے تھے، انہیں ساحل مای کیل پر جنگ پلاٹیہ کی خبر پہنچی اور اُنکے دِل بڑھ گئے۔

آیونیہ اور ایتھنز والے فتح کے بعد اسی سلسلے میں زان تی پوس کی ماتحت علاقۂ دردانیال پر شدو مد سے جنگ کرتے رہے؛ بحالیکہ لیوتی کی داس اور اہالی پلوپی سس نے اسی کامیابی پر قناعت کی اور وطن کو واپس چلے آئے۔ اسپارٹہ کی احتیاط پسندی اور ایتھنز کی کشور کشایانہ حوصلہ مندی میں جو فرق تھا وہ اسی واقعے سے بخوبی عیاں ہوجاتا ہے کہ لکدمونی، مشرق اور شمال مشرقی ایجین کے معاملات میں دخل دینے سے گھبراتے تھے اور اہل ایتھنز میں نہ صرف یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ ملّت یونانی کے وسیع معنی سمجھ سکتے تھے، بلکہ دُور دُور اپنا رسوخ بڑھانے کی بھی انھیں اُمنگ تھی۔ چنانچہ آبنائے دردانیال کے قریب سستوس کے مغربی قلعے کو انھوں نے گھیرا اور (۴۷۸ ق م میں) فتح کرلیا؛ ہروڈوٹس نے اپنی محاربات ایران کی تاریخ اسی واقعے پر ختم کردی ہے۔ مگر دوسری طرف اسی قلعے کی تسخیر، سلطنتِ ایتھنز کا پہلا سنگِ منزل ہے جس کا راستہ پی سیس تراتوس اور مل تیادیسِ اکبر دکھا چکے تھے ؛

۹۔ سیراکیوز کا حاکم جابر، گلُن

جس وقت مشرق کے یونانی، ایرانی اعدا سے، اپنی آیندہ نشوو نما کی حفاظت کے لئے جدو جہد کررہے تھے،

مغربی یونانیوں کو اُس ایشائی طاقت سے اپنے تئیں بچانا پڑا جو بحر متوسط کے غربی حصّوں میں اُن سے مصروفِ کشمکش تھی۔ فوکیس کی نوآبادی مسالا (موجودہ مارسلیز) سے یونانیوں کی شاخیں پھیل کر جزیرۂ کورسکا بلکہ خود ساحلِ ہسپانیہ پر فنیقی تاجروں کی رقیب بن گئی تھیں۔ ان سب سے بڑھکر یہ کہ صقالیہ میں یونانیوں کا اثر اس قدر بڑھتا جاتا تھا کہ ریاستِ قرطاجنہ کی تجارت و حکومت دونوں خطرے میں تھیں؛ پھر، جس وقت قرطاجنہ نے اس جزیرے میں اپنا اقتدار قایم کرنے کی سعئ عظیم شروع کی تو گویا، بجائے خود، وہ بھی ایک مشترک دشمن کے خلاف زرکسیز کی ہم آہنگ اور شریکِ کار ہوگئی تھی ٭

سنہ ۴۹۰ اور سنہ ۴۸۰ ق م کے درمیان صقالیہ کے یونانی علاقے پر چار شاہانِ جابر کا تسلّط تھا۔ ان میں شمال کے دو، یعنی ریاستِ رگیوم کا حاکم اناکسی لاس اور ہیمرا کا ترِیلوس، چھوٹے بادشاہ تھے اور جنوب میں تھِیرُن، شاہِ اکراگاس اور گلِیُن شاہ سیرا کیوز، دو بڑے بادشاہوں کی حکومت تھی؛ گلِیُن نے سیراکیوز کو مغرب میں سب یونانی شہروں سے کہیں بڑا شہر بنادیا تھا اور اس لئے اگر اسے سیراکیوز کا دوسرا بانی کہا جائے تو بجا ہے؛ اُرتی جیا کا جزیرہ بَند باندھ کے ساحل سے ملادیا گیا تھا اور اسطرح اب یہ شہر ایک جزیرہ نما بن گیا تھا۔ نیز اُرتی جیا اور اک رادینا

کی مورچہ بند بلندیوں کو گلن نے ایک ہی فصیل کے اندر
لے لیا تھا اور جزیرہ ان بلندیوں کے عین نیچے واقع تھا۔
اس کے علاوہ سیراکیوز کو بحری قوت بنانے کی غرض سے
اس نے جہازوں کی گودیاں بنوائی تھیں اور اپنے محکوم
علاقوں کی بہت سی آبادی کو اس شہر میں منتقل کرلیا تھا
چنانچہ نواح میں کمارینا کی ساری بستی اور شہر گلا کے
آدھے باشندے وہاں سے اٹھواکر سیراکیوز میں لے آیا تھا؛
اک راگاس کے بادشاہ تھرن کے ساتھ اس نے
بذریعۂ ازدواج رشتۂ اتحاد قایم کیا تھا۔

تھرن شاہِ اک راگاس نے گلن کی مدد سے
شمال میں فوج کشی کی اور ترلیوس کو شہر ہیمرا سے نکالدیا
ترلیوس نے قرطاجنہ سے دستگیری کی التجا کی اور قرطاجنہ
نے خوشی سے یہ درخواست منظور کرلی۔ یہی سبب تھا کہ
جب زرکسنر کے حملے سے قبل، یونانی ایلچی مدد چاہنے
صقالیہ آئے تو گلن اور دیگر یونانی ریاستوں کو انھوں
نے خود اپنے معاملات میں منہمک پایا تھا۔ قرطاجنہ کا
زبردست بیڑا یہاں آپہنچا تھا اور پنرموس پر اس کی
فوجیں اُتر کے ساحل ساحل ہیمرا کو گھیرنے کے لئے بڑھ رہی
تھیں جسے تھرن بچا رہا تھا۔ اسی شہر کو چھڑانے کی غرض
سے گلن ۵ ہزار سوار و ۵۰ ہزار پیادہ فوج لے کے
روانہ ہوا۔

شہر کی فصیلوں کے باہر بڑی بھاری لڑائی ہوئی (سنہ ۴۸۰ ق م) یونانیوں نے کامل فتح پائی اور قرطاجنی سردار ہمل کار اسی معرکہ میں کام آیا۔ اس کی موت کے بارے میں دو روایتیں ہیں اور اہل قرطاجنہ کا بیان یہ ہے کہ ادھر معرکہ کارزار گرم تھا اور ادھر وہ دن بھر کھڑا بعل دیوتا کی قربان گاہ پر قربانیاں چڑھا رہا تھا۔ حتیٰ کہ جب اُس نے اپنی فوج کے پاوں اُکھڑتے دیکھے تو اس نے سب سے بڑی بھینٹ خود اپنی چڑھادی اور آگ میں کود پڑا! لڑائی تو پھر بھی قرطاجنہ والے نہ جیت سکے لیکن اس میں شک نہیں کہ کچھ دن بعد شہر ہیمرا کو ہملؔ کار کی قربانی کا بڑا بھاری تاوان بھرنا پڑا ۔

اس لحاظ سے کہ دونوں جگہ یورؔپ سے ایشیا کو پسپا ہونا پڑا، جنگ ہائے سلامیس و ہیمراؔ کی نوعیت یکساں تھی اور اسی زمانے میں لوگوں کو اس بات کا احساس بھی ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار (جس سے اُن کی سادہ لوحی بھی مترشح ہے) اس طرح ہوا کہ اُن میں یہ خیالی روایت مشہور ہوگئی کہ یہ دونوں لڑائیاں ایک ہی دن ہوئیں۔ لیکن سلامیس کے برعکس، ہیمرا کی جنگ کے بعد ہی فریقین میں صلح کا عہد و پیمان ہوگیا اور دولت قرطاجنہ کو خداوندِ سیراکیوز کی خدمت میں ۲ سو تیلنٹ بطور تاوانِ جنگ پیش کرنے پڑے۔ مگر یہ رقم بھی اُس دولت کے مقابلے میں

جو لوٹ میں ہاتھ آئی ، کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور اسی مالِ غنیمت کا ایک حصّہ تھا جس کی چاندی ایک خوبصورت سکّے کی شکل میں ڈھالی گئی تھی ۔ گلُن کی بیوی کے نام پر یہ سکّہ "دمارتیئین" کہلاتا تھا اور نجاتِ صقالیہ کی اس یادگار کے چند نمونے اب تک محفوظ ہیں ؎

۱۰۔ عہدِ ہای رن (ہای رو)

گلُن کی وفات کے بعد (۴۷۸ ق م) اس کی ہمّت مردانہ اور خوش تدبیری کا پھل ، ترکے میں اُس کے بھائی ہائی رن کو ملا ۔ اور قرطاجنہ پر جو فتح یونانیوں نے حاصل کی تھی ، ہائرن نے ایک اور قوّت کو شکست دے کر اس کا تکملہ کیا :۔ ساحل اطالیہ پر یونانیوں کی سب سے شمالی بستی کیمہ تھی ۔ اِترسکن قوم کے لوگ اس شہر پر قبضہ کرنے کے درپے تھے اور انھوں نے اُسے گھیر لیا تھا کہ ادھر سے ہائرن کا سیراکیوزی بیڑا مدد کیلئے پہنچا اور محاصرین کو شکست دی ۔ (۴۷۴ ق م) جس کے بعد سے یہ خطرہ زایل ہوگیا کہ اس لڑائی کی غنیمت سے وہ برنجی خود جسے ہای رو نے اولمپیہ بھیجا تھا اور نیز پنڈار کا وہ قطعہ جس نے اس فتح کو زندۂ جاوید بنادیا ، اب تک محفوظ ہیں ؞

پانچویں صدی میں ، صقالیہ کے درباروں کی جاہ و ثروت اور شائستگی کی جیسی جیتی جاگتی تصویر ہمیں پنڈار کے اشعارِ مدح و ثنا میں نظر آتی ہے شاید اور کہیں نہیں مل سکتی ۔ سی مونی دیس ،

باکی لی دلیس اور اس کا ای لوس جیسے نامور شعرائے ہمعصر کی طرح ، پنڈار بھی صقالیہ کے مطلق العنان جابر کی مراحم خسروانہ اور نگاہِ لطف کا امیدوار بن کر ، یہاں آیا تھا۔ شاہِ سیراکیوز اپنے گھوڑے اور رتھیں ، اولمپیہ یا دلفی کے بڑے بڑے میلوں میں مقابلے کے لئے بھیجا کرتا تھا اور اُن کی ظفرمندی کی یادگار میں پُر شکوہ قصیدے لکھنا دربار کے سب سے طبّاع سخن سرا کے سپردِ ہوتا کبھی کبھی پنڈار اور باکی لی دلیس کو ایک ہی معرکے کی یادگار میں ایک دوسرے کے مقابلے میں نظم لکھنے پر مقرر کیا جاتا۔ غرض اس طرح ان شعرا کے کلام سے ہمیں ان درباروں کے تجمّل و احتشام اور ظفرمند بادشاہوں کی بذل و عطا کا اندازہ ہوتا ہے ؀

لیکن ظاہر میں یہ شہر کیسے ہی مرفہ الحال نظر آتے ہوں وہاں شخصی حکومت کا جبر و تشدّد ضرور موجود تھا۔ ہای رُن کا محکمہ جاسوسی مشہور تھا۔ تھِرُن کی سفّاکی ضرب المثل تھی جس کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ ہیمرا کے جن باشندوں نے اس کے بیٹے تراسی دالیوس کی حکومت کی مخالفت کی انہیں جان سے مروا ڈالا ؛ مگر جب اپنے باپ کے مرنے پر (سنہ ۴۷۲ ق م) تراسی دالیوس کا ہای رُن سے جھگڑا ہوا اور لڑائی میں شکست کھائی (سنہ ۴۷۱) ، تو شہر ہیمرا خود مختار ہوگیا اور اس کے صدر مقام اکراگاس میں بھی ایک آزاد نظامِ حکومت کی بنا پڑگئی۔ ہای رُن کے بعد اس کا جانشین تراسی بُلس بھی اتنا لایق

حاکم نہ تھا۔ اس کے خلاف جمہور اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے باہر نکال دیا۔ (سنہ ۴۶۶ ق م)۔ لیکن شخصی حکومت کے دفع ہونے کے بعد ہی سیراکیوز کے پرانے اور نئے باشندوں میں، جنہیں گلُن نے اطراف سے لا لا کے بسایا تھا، خانہ جنگی برپا ہوگئی اور آخر میں تمام اغیار خارج ہوئے اور سیراکیوز میں حکومتِ جمہوری استحکام کے ساتھ قایم ہوگئی۔ صدی کا باقی نصف، صقالیہ کی ان جمہوری ریاستوں کے حق میں فراغت و خوش حالی کا زمانہ تھا۔ خاص کر سیراکیوز اور اک راگاس کے لئے جو ان میں سب سے بڑی تھیں۔ اور نیز شہر سلی نوس کے لئے، جو اب اہل فنیقیہ کی غلامی سے آزاد ہوگیا تھا ؂

باب ہشتم

سلطنت ایتھنز کی بنا

۱۔ اسپارٹہ کا مرتبہ۔ اور پوسےنیاس کا رویہ

گزشتہ چالیس سال سے اسپارٹہ بری یونان کی سب سے مقتدر ریاست رہا تھا۔ ایرانی حملہ کے روکنے کے وقت سب نے بلا چون و چرا اس کی سیادت تسلیم کرلی تھی۔ ایک بڑے قومی کام کو ہاتھ میں لینے اور پھر اس شان کے ساتھ اتمام کو پہنچانے کے بعد، اُس کے لئے راہ نکل آئی تھی کہ یہی سیادت حکمرانی کی صورت میں تبدیل ہوجائے۔ لیکن اسپارٹہ میں حصولِ شہنشاہی کی کارگر تدابیر پہ عمل کرنے کا مادّہ ہی نہ تھا۔ کیونکہ یونان میں جب

ریاست کو اس قسم کے شاہانہ اقتدار پانے کی ہوس ہو اُس
کا ایک بحری طاقت ہونا لابُد تھا۔ اسی لئے جب آزاد
یونانی ریاستوں کا حلقہ ایک مرتبہ اور از تھریس تا ایشیا
تمام بحیرۂ ایجین پر پھیل جائے تو گو اسپارٹہ کا رُتبہ اندرون
ملک میں برقرار رہے، تاہم عالم یونانی میں اس کا پہلا
سا امتیاز باقی نہ رہ سکتا تھا اور کوئی ریاست بھی جو سواحل
و جزایر ایجین پر حاکمانہ اقتدار حاصل کرلے اسپارٹہ کی
خطرناک رقیب بن سکتی تھی؛ چنانچہ یہی ہوا۔

اسپارٹہ کے لوگوں میں نئے حالات اور زمانے
کے مطابق اپنے تئیں بنا لینے کی صلاحیت نہ تھی۔ کسی قسم
کی اصلاح انہیں پسند نہ تھی۔ غیر معمولی قابلیت کے آدمی
سے وہاں لوگ بدگمانی کرنے لگتے تھے۔ بیڑا تیار کرنا ان کی
نظر میں ایسی ہی موہوم بات ہوتی جیسے ایران کے پایۂ تخت
پر فوج کشی۔ اور گزشتہ جنگ میں اُن کے طریق عمل پر بہ
استیعاب نگاہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی حکمتِ عملی
تنگ دلی و تنگ اندیشی سے خالی نہ تھی؛ چنانچہ ہوئے بھی
تو وہ بالعموم اخیر وقت پر کچھ کرنے کے لئے تیار ہوے۔ اور
اُن کی نظر اس قدر محدود تھی کہ محض اپنے حقیر جزیرہ نما کے
نفع نقصان کی خاطر وہ کئی دفعہ قریب قریب آمادہ ہوگئے
کہ تمام یونان کی قومی اغراض کو پس پشت چھوڑ کے الگ
ہو جائیں۔

یہ ماننا پڑیگا کہ پلاٹیہ کی لڑائی میں پوسے نیاس پسر کلیوم بروتوس نے اعلیٰ درجے کی جنگی قابلیت کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن وہ جتنا لایق سپہ سالار تھا اتنا لایق مدبّر نہ تھا؛ اسپارٹہ نے اُسی کو اب اپنے حلیفوں کے فراہم کردہ جہازوں کے ایک دستے پر سردار بنا کے بھیجا کہ مشرقی یونانیوں کو آزاد کرانے کا سلسلہ جاری رہے؛ سب سے پہلے پوسے نیاس قبرس آیا (۴۷۸ ق م) اور اس جزیرے کے بڑے حصّے کو ایرانیوں کی حکومت سے نجات دلائی۔ پھر اُس نے بای زنطہ آکر ایرانیوں کی جو فوج قلعے میں متعیّن تھی اُسے نکال دیا؛ لیکن یہاں اس کا برتاو سپہ سالاروں کا سا نہ تھا بلکہ مطلق العنان بادشاہوں کا سا ہوگیا۔ اور اُس کے وطن اسپارٹہ کو ایرانی حملے کی بدولت یونان کی متحدّہ ریاستوں پر سیادت کا جو موقع حاصل ہوا تھا وہ پوسے نیاس ہی کے باعث ہاتھ سے نکل گیا؛ خود اسپارٹہ میں اُس کے کرتوت کی اطلاع ہوئی تو عام طور پر لوگ متردّد و اندیشہ مند ہوگئے اور اُسے واپس بلا کے جواب طلب کیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ اُس نے ایرانی لباس پہنا اور تھریس کے سفر میں ایشیائی سپاہیوں کی فوج خاصہ اُس کے جلو میں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ پوسے نیاس ایرانی دربار سے ریشہ دوانی کر رہا تھا۔ اور اب یہ فاتح پلاٹیہ خود اپنے وطن اور باقی تمام یونان کو زرکسنر کا حلقہ بگوش کرادینے پر آمادہ

تھا اور زرکسنز کی بیٹی سے عقد کر کے اس عہد و پیمان کی توثیق
کرنی چاہتا تھا اور اُس کے پیام سلام پر شہنشاہِ ایران
کی جانب سے بھی اظہار خوشنودی ہوا تھا۔ پس یہ تنگ ظرف
شیخی سے پھولا نہ سمایا اور اتنا آپے سے باہر ہوگیا کہ چھوٹی
چھوٹی باتوں سے اُس کے غدّارانہ ارادے ظاہر ہونے لگے؛
تاہم اس وقت ایرانیوں سے اس کی سازش ثابت نہ ہوسکی
اور اُسے صرف اُن زیادتیوں کی سزا دی گئی جو خاص خاص
اشخاص کے ساتھ اُس نے کی تھیں، یا اُنہیں ضرر پہنچایا تھا؛
دوبارہ اُسے امیرالبحر بنا کے نہیں بھیجا گیا لیکن کچھ عرصے بعد
اُس نے خود ایک سہ طبقہ جہاز کرایے پر لیا اور اسی نواح
میں پہنچ گیا جہاں پہلے سازش کی تمہید ڈالی تھی؛ اس نے
پہلے بای زنطہ پر دوبارہ قبضہ پالیا اور اس طرح بحیرۂ اقشین
کا اندرونی دروازہ اس کے زیر اقتدار آگیا (۴۷۷ق م) پھر
تھوڑے ہی دن بعد جب سستوس کو تسخیر کیا تو بیرونی
دروازہ (یعنی آبنائے دردانیال) بھی اس کے تحت میں تھا؛
مگر سستوس کا نکل جانا اہل ایتھنز کو کسی طرح گوارا نہ ہوسکتا
تھا۔ انھوں نے ہل تیادیس کے بیٹے کائمن کو ایک بحری
دستہ دے کے روانہ کیا جس نے پوسے نیاس کو سستوس
سے بے دخل کیا اور بای زنطہ سے نکال دیا۔ (۴۷۶ق م) جب
حکومتِ اسپارٹہ نے سُنا کہ وہ پھر ٹرواے کے علاقوں میں
ریشہ دوانیاں کر رہا ہے تو اُنھوں نے ایک نقیب بھیجکر

اُسے واپس آنے کا حکم دیا اور یہ سمجھ کر کہ رشوتیں دے کے
بری ہوجاونگا، **پوسے نیاس** نے حکم کی تعمیل کی؛ افوروں
نے اُسے قید میں ڈال دیا لیکن اس کے جرم کی شہادت
ملنی دشوار تھی۔ لہٰذا وہ بڑے دعوے کے ساتھ رہا ہوگیا؛
ہر شخص جانتا تھا کہ **پوسے نیاس** نہ صرف ایران سے رسل
و رسایل کرتا رہا بلکہ اُس نے آزادی کے وعدے کر کے
ہلوتوں میں بغاوت کا سامان بھی کیا تھا۔ اور اسپارٹہ میں
صحیح معنی میں شخصی بادشاہی قایم کرنے کے خیال پکا رہا تھا؛
لیکن اس کے خلاف کوئی ایسا صریح ثبوت نہ ملتا تھا جس پر
با ضابطہ کارروائی کی جاسکے۔ یہاں تک کہ خود اُس کے ایک
رازدار نوکر نے مخبری کی۔ **پوسے نیاس** نے ایرانی صوبیدار
آرتابازو کے پاس لے جانے کے لئے ایک خط اس شخص
کے حوالے کیا تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ پہلے جس قدر ہرکارے اسی
کام پر بھیجے گئے اُن میں سے کوئی واپس نہ پھرا، اُس نے مہر
توڑ دی اور خط میں خود اپنے قتل کا حکم لکھا پایا۔ یہی خط
اُس نے **افوروں** کو لاکے دکھا دیا اور اس خیال سے کہ
خود **پوسے نیاس** کی زبان سے اس کی تصدیق اور ثبوت
مل جائے اُنھوں نے یہ چال چلی کہ تناروس کی درگاہ پر
ایک جھونپڑی بنائی اور اُس کے بیچ میں اوٹ کھڑی کر کے
ایک طرف خود چھپ رہے اور دوسری طرف **پوسے نیاس**
کا وہ نوکر فریادیوں کی طرح بیٹھا رہا۔ **پوسے نیاس** یہ

تجسس کرنے وہاں پہنچا کہ وہ درگاہ میں کیوں پڑا ہے۔ اور اُس وقت اُس کے آدمی نے خط کا حال سُنا کے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ جو گفتگو باہم ہوئی اُس میں پوسے نیاس نے اصل واقعے کا خود اعتراف کیا۔ لیکن پھر خطرے کا کچھ اشارہ پاکے وہ برنجی حویلی والی ایتھنہ دیوی کے مندر کو بھاگا اور اسی معبد سے ملے ہوئے ایک چھوٹے سے حجرے میں پناہ لی؛ افوروں نے اس حجرے کا دروازہ چُنواکر اُسے بھوکا مار دیا (سنہ ۴۷۱ ق م؟)۔ جس وقت وہ دم توڑ رہا تھا، اُسے باہر لائے اور خدائے ڈلفی کے فرمان کی بموجب اسی مقدس احاطے کے دروازے پر اس کو دفن کردیا لیکن۔ مندر کی حدود میں بھوکا مارنا بھی دیوی کا گناہ تھا اور اس کا عذاب تمام اسپارٹہ والوں پر پڑا ٭

وطن سے باہر جاکے اسپارٹہ والوں کی جو کیفیت ہوجاتی تھی، پوسے نیاس کا طرزِ عمل اس کا نمونہ ہے اور خشکی پر اسپارٹہ کی سعیٔ کشور کشائی کا جو کچھ نتیجہ ہوا اس میں بھی اسی قسم کی مثال یہ ہے کہ علاقہ تھسالیہ دبا لینے پر اہل اسپارٹہ کی نگاہ تھی اور اسی غرض سے اُنھوں نے شاہ لیوتی کی داس کو فوج دے کے روانہ کیا اور اُس نے خلیج پگاسوس کے ساحل پر فوج اُتاری (سنہ ۴۷۶ ق م)۔ اسپارٹہ کے اکثر سپہ سالاروں کی طرح وہ بھی چاندی سونے کی طمع سے نہ بچ سکا اور تھسالیہ کے رئیسوں نے حملہ آور کو رشوتیں دیکر

اپنا ملک بچالیا۔ یہ جرم سب پر ظاہر تھا اور جب وہ وطن کو واپس آیا تو سزائے موت کا مستوجب قرار دیا گیا لیکن لیوتی کی داس فرار ہوگیا اور شہر تگیا کے مندر ایتھنہ میں پناہ لے کر اپنی جان بچائی۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد اسپارٹہ کو اپنی اقتدار کی خاطر خود پلوپنی سس میں جنگ کرنی پڑی۔ ریاست آرگوس میں (اُس ضرب کاری کے بعد جو شاہ کلیومنیس نے لگائی تھی) اب پھر دم آگیا تھا۔ اور دوسری طرف اسپارٹہ کے دیکھتے دیکھتے الیس کے دیہات متحد ہوکر ایک شہر بن گئے تھے اور ان میں جمہوری نظام حکومت قایم ہوگیا تھا (سنہ ۴۷۲ ق م)۔ خود ارکیدیہ میں مان تینیا کے دیہات ملکر جو ریاست بنی اُسے بھی اسپارٹہ کو بادلِ ناخواستہ تسلیم کرنا پڑا تھا۔ مختصر یہ کہ ایرانی لڑائیوں کے بعد اسپارٹہ قریب قریب وہیں رہا جہاں پہلے تھا۔ حالانکہ اسی اثناء میں ایک دوسرا شہر برابر شاہ راہِ ترقی پر گامزن تھا، بڑے بڑے کام کررہا تھا اور ایک وسیع سلطنت بنا رہا تھا۔

۲۔ اتحادِ دلوس

جنگِ مای کیل کے بعد جب اسپارٹہ نے فتح سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا اور اس کی بے حسی ظاہر ہوگئی تو یہ دیکھکر آیونیہ اور ایشیا کے یونانی، ایتھنز کی سیادت قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ (سنہ ۴۷۸ و ۴۷۷ ق م) اور اس طرح اُنھوں

نے برضائے خود وہ اتحاد قایم کیا جس سے ایک دن ایتھنز کی سلطنت بننے والی تھی؛ اتحاد کا مقصد صرف یہی نہ تھا کہ جو یونانی شہر دولتِ ایران کے پنجے سے چھڑا لئے ہیں انہیں دوبارہ تسخیر ہونے سے بچائے۔ بلکہ یہ بھی غرض تھی کہ شہنشاہ کا ملک لوٹا جائے؛ متحدین کا بیت المال دلوس (ڈیلوس) کے متبرک جزیرے میں قایم ہوا تھا کہ یہی مقام آیونیانی گروہ کی پرستش کا قدیم مرکز تھا۔ اسی کے نام پر یہ اتحاد بھی اتحادِ دلوس کہلانے لگا اور اتحاد کا پہلا کارنامہ سستوس کی دوبارہ تسخیر، تھا؛

ایشیا کے آیونیانی اور ایولیانی شہر، لس بوس تارودس ساحل کے قریبی جزیرے ساحل مرموره کے بہت سے اور تھریس کے چند شہر، مجمع جزایر سای کلیڈیز کی اکثر ریاستیں، اور (جنوبی شہر کارسیتوس کے سوا) کل جزیرہ یوبیہ، اس اتحاد میں شریک تھے؛ یہ بحری ریاستوں کی انجمن تھی اور اس لئے شرکت کا قاعدہ یہ تھا کہ ہر ایک ریاست متحدہ بیڑے کے واسطے چند جہاز فراہم کرے۔ مگر بہت سی شریک ریاستیں چھوٹی اور قلیل البضاعت تھیں۔ اکثر دو ایک جہازوں سے زیادہ فراہم نہ کرسکتی تھیں اور اکثر بجز اس کے کچھ نہ کرسکتی تھیں کہ ایک ہی جنگی جہاز کے مصارف آراستگی میں کچھ روپے کی شریک ہوجائیں؛ ظاہر ہے کہ اس قسم کی منتشر اور قلیل امدادی فوج، کسی مقررہ وقت یا مقام پر جمع کرلینا بہت دشوار

تھا۔ دوسرے ایسے معجون مرکب بیڑے میں نظم قایم رکھنا بھی کچھ آسان نہ تھا۔ نظر بریں وجوہ، یہ طے پایا تھا کہ زیادہ چھوٹی ریاستیں ایک سالانہ رقم مشترکہ بیت المال میں جمع کردیا کریں۔ اس قسم کی تعیین اور اتحادی ریاستوں کے مال و متاع کی تشخیص کا کام ارس تدیز کو تفویض ہوا تھا۔ اور اپنی فراست اور اُس وقار کے لحاظ سے جو لوگوں میں اُسے حاصل تھا، ارس تدیز اس کام کے لئے بدرجۂ اولیٰ موزوں بھی تھا۔ چنانچہ اس کی مالی تشخیص پچاس برس سے زیادہ عرصے تک واجب العمل رہی؛ اس طرح **اتحادِ دلوس** میں اوّل سے دو قسم کے ارکان شامل تھے؛۔ ایک تو وہ جو جہاز فراہم کرتے تھے۔ اور دوسرے وہ جو اس کے بدلے "فوروس" یعنی زرِ نقد ادا کرتے تھے۔ اس گروہ کی تعداد پہلے گروہ کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔ کیونکہ علاوہ اُن ریاستوں کے، جو ایک دو جہاز، یا اس کے کسی حصّے سے زیادہ کی شریک نہ ہوسکتی تھیں، بہت سی بڑی ریاستیں بھی زر نقد ادا کرنے کو ترجیح دیتی تھیں کہ اس صورت میں اُن کے باشندوں کو باہر جانا نہ پڑتا تھا؛ سالانہ رقم اتھنز کے دس عہدے دار تحصیل کرتے تھے جن کا نام "ہلنوتامیای" (یعنی "یونانیوں کے خزانچی") تھا؛ اتحادیوں کی مجلس کا اجلاس بیت المال کے مقام، یعنی **دلوس** میں ہوتا تھا اور اس میں ہر ایک ریاست کی رائے برابر کی ہوتی تھی۔ لیکن سرگروہِ اتحاد ہونے کی حیثیت

سے، تمام انتظامی کاروبار ایتھنز کے ہاتھ میں تھے اور یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ خزانچی تمام متحدہ ریاستوں میں سے نہیں چنے جاتے تھے بلکہ صرف ایتھنز کے شہری ہوتے تھے؛ گویا اوّل ہی سے ایتھنز کو ایسے مواقع حاصل تھے کہ اس بحری اتحاد کو بہ تدریج اپنی بحری سلطنت بنالے۔

اتحاد کی بنا کے وقت ہر چند ارس تدیز کا اس میں زیادہ حصّہ نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ اُس کے حریف، تمس طاکلیس کا طفیل تھا کہ ایتھنز نے طغیانی کے وقت اپنے کھیت بھرے؛ تمس طاکلیس ہی نے اپنے وطن کو بحری طاقت بنایا تھا۔ اور اس کا یہی کارنامہ اُسے ایتھنز کے تمام مدبّرین پر فایق کردیتا ہے؛ وہ نہایت غیرمعمولی دماغ کا آدمی تھا اور سب سے متین مورّخ توسی ڈائی ڈیز (طوسی ویدش) بھی سلسلہ تحریر چھوڑ کر، اُس کے یہ خداداد اوصاف سراہنے لگتا ہے کہ آیندہ جو کچھ ظہور میں آنے والا ہو اُسے سمجھنے کی یا سخت مشکلات کے وقت عقدہ کشائی کی تمس طاکلیس کو بے مثل قابلیت عطا ہوئی تھی۔ جب ایتھنز نے سیادت حاصل کی اور وہ نئے راستے اختیار کئے جو اب اُس کے سامنے کھل گئے تھے، تو حقیقت میں یہ وہی طریق عمل تھا جس کے سب سے پہلے اور سب سے واضح معنی تمس طاکلیس نے بتائے تھے؛ پھر یہ کہ جس وقت ایتھنز کا بیڑا مشرق میں سلطنت کی عمارت تیار کررہا تھا، تمس طاکلیس

کے لئے خود وطن کے کھنڈروں میں کام کرنے کی بہت گنجائش نکل آئی تھی ؛

۳ - ایتھنز و پیرئیوس کے جنگی استحکامات

جنگ پلاٹیہ کے بعد ایتھنز کے لوگ اپنی تاراج بستی میں بال بچے اور اسباب واپس لائے ؛ پرانی شہر پناہ کا تھوڑا سا حصّہ ابھی تک باقی تھا مگر اُنھوں نے ایک نئی فصیل بنانی شروع کی - یہ کام بہت جلدی میں ہوا اور انھوں نے پُرانی عمارتوں کا ملبا اور بجری تک اُس میں لگا دی - لیکن اس فصیل میں ، جو تمسٹاکلیس کی تحریک و صلاح سے بنائی گئی اور اسی کے نام سے موسوم ہوئی - قدیم احاطے کی نسبت زیادہ رقبہ گھیرا گیا تھا ؛ لکدمونیوں کو (یعنی اہل اسپارٹہ کو) ان فصیلوں کے بننے سے حاسدانہ بدگمانی ہوئی اور اُنھوں نے ایلچی بھیجے کہ ایسے جنگی استحکامات بنانے سے باز رکھیں اور اہالیٔ ایتھنز کو آمادہ کریں کہ اپنے شہر کی مورچہ بندی کرنے کی بجائے وہ یونان بھر میں جہاں کہیں اس قسم کے استحکامات ہوں ، خود اُنہیں منہدم کرنے میں اسپارٹہ کے شریک ہوجائیں لیکن زبانی فہمایش کے سوا اسپارٹہ والے اور کچھ نہ کرسکتے تھے - پھر بھی ایٹی کا کے عُمر عیّار ، یعنی تمسٹاکلیس کی برجستہ چالاکی اور فن فریب کی تمثیل میں یہ قصّہ مشہور ہوگیا تھا کہ اس کی صلاح سے اسپارٹہ کے ایلچیوں کو یہ کہہ کے واپس

بھیج دیا گیا کہ جواب دینے کے لئے ایتھنز سے ایلچی بھیجے جائینگے
چنانچہ جب وہ چلے گئے تو تھمس طاکلیس سفارت کا ایک
رکن بن کے اکیلا اسپارٹہ روانہ ہوا مگر باقی سفیروں کو چھوڑ گیا
کہ جب تک فصیل مدافعت کے لایق بلند نہ ہوجائے وہ وہیں
ٹھیرے رہیں۔ ادھر وہ کہہ گیا کہ شہر کی تمام آبادی، مرد عورت
اور بچے تک شدّو مد کے ساتھ تعمیر کے کام میں مصروف
ہوجائیں۔ پھر خود اسپارٹہ پہنچا تو بہت دن تک مجلس کے
سامنے نہ گیا اور جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو جواب
دیا کہ ساتھ کے سفیر ابھی رک گئے ہیں اور اُن کے آج کل
میں آنے کی اُمید ہے۔ اس اثنا میں ایتھنز سے آنے والے
اہل اسپارٹہ کو وثوق کے ساتھ خبر دیتے تھے کہ ایتھنز کی فصیل
برابر بن رہی ہے۔ تھمس طاکلیس نے اُن سے کہا کے ایسی افواہوں
کے دھوکے میں نہ آو بلکہ خود اپنے آدمی بھیج کر حقیقت حال
معلوم کرو۔ اسی کے ساتھ اُس نے خفیہ طور پر ایتھنز کہلا
بھیجا کہ اسپارٹہ سے جو لوگ بھیجے جائیں اُنہیں میرے اور
میرے ساتھیوں کے سلامتی سے واپس پہنچ جانے تک واپس
آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ غرض اتنے عرصے میں فصیل
کافی بلند ہوگئی۔ ایتھنز کے دوسرے سفیر بھی آگئے اور
اب تھمس طاکلیس نے اسپارٹہ کی مجلس میں آکے اعلان کیا
کہ ایتھنز کی فصیلیں بن گئی ہیں اور اب وہ اپنی مدافعت کرسکتا
ہے۔

اسی طرح پیرئیوس کی مورچہ بندی کا بھی کام شروع ہوا۔ تمام جزیرہ نمائے مُنی کیا کے گرد سمندر کے کِنارے کِنارے ایک چوڑی دیوار بنائی گئی اور بندرگاہ کے شمالی رخ سے ہوتی ہوئی ای تیونیا کی راس تک پہنچادی گئی۔ اس بڑی بندرگاہ میں اور جزیرہ نما کے مشرقی جانب، منی کیا اور زیہ کی گودیوں میں اندر آنے کے راستوں کو پشتے ڈال کر مضبوط و مستحکم کرلیا گیا۔

اگلے بیس سال کے عرصے میں ایتھنز والوں کو بندرگاہ اور شہر کی الگ الگ آبادی ہونے کا نقص نظر آیا کہ ان دونوں کو ایک شہر ہونا چاہیئے تھا؛ اُن کے ارباب حل و عقد کے ذہن میں یہ بات آگئی کہ اٹیکا پر کوئی بڑی فوج حملہ کرے تو ایتھنز اور پیرئیوس کا راستہ روکا جاسکتا ہے اور شہر والوں کا اپنے جہازوں سے تعلّق بالکل منقطع ہوسکتا ہے۔ اس خرابی کا سب سے آسان علاج تو یہ تھا کہ ایتھنز کی سکونت چھوڑ دی جاتی، مگر اس کی بجائے مذکورہ بالا خطرے کے حفظ ماتقدم کی انہیں ایک نئی تدبیر سوجھی۔ یعنی یہ قرار پایا کہ ان دونوں آبادیوں کو ایک مسلسل فصیل کے اندر لیکر دوہرا شہر بنادیا جائے۔ چنانچہ ایتھنز کو سمندر سے ملادینے کے لئے دو انفراجی فصیلیں تیار کی گئیں جن میں شمالی تو بندرگاہ کے قریب پیرئیوس کی فصیل سے مل جاتی تھی اور جنوبی، فالرُن کے کھلے کِنارے تک آتی تھی۔ غرض ان فصیلوں

سے جن کا تعمیر کرنا اور بچانا دونوں صرفِ کثیر اور وقت کے کام تھے، بلدۂ ایتھنز نے اپنی وہ شکل بنالی جس میں آیندہ اُسے "ملکۂ بحر" کی شان میں جلوہ گر ہونا تھا؛

اُس کی بحری قوت ایک ترقی پذیر بحری تجارت پر مبنی تھی اور حقیقت میں یہی شئے، کسی بحری قوت کی قابلِ اطمینان بنیاد ہوسکتی ہے۔ خود اس بحری تجارت کا دارومدار اٹکی کی صنعت و حرفت کی ترقی پر تھا جس کا اندازہ اُن پردیسیوں کی تعدادِ کثیر سے ہوسکتا ہے جو تجارت و صناعت کی غرض سے ایتھنز یا پیریئوس میں آبسے تھے؛ معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اُن کا شمار دس ہزار کے قریب پہنچ گیا تھا اور سرکاری محصولات کے اعتبار سے ان پر بھی مالی بار اسی قدر تھا جس قدر کہ اصلی باشندوں پر۔ لیکن جنگ کے وقت جب املاک پر محصول لگایا جاتا تو ان پردیسیوں کے واسطے اس کی شرح بڑھادی جاتی تھی؛

تمس طاکلیس ایک ایسا طریقہ جاری کرنا چاہتا تھا جس کی رو سے ہر سال چند نئے سہ طبقہ جہاز بیڑے میں اضافہ ہوتے رہیں۔ لیکن اس کی تجویز پر عمل نہ ہوا بلکہ وقتاً فوقتاً ضرورت کے موافق نئے جہاز بنالئے جاتے تھے۔ البتہ اُن کے مہیا کرنے کا ایک نیا قاعدہ یہ رائج ہوا کہ سرکار صرف جہاز کا پیٹہ اور کچھ بالائی سازو سامان تیار کر دیتی تھی۔ باقی اُس کی تکمیل و آراستگی اور ملاحوں کو سدھانے کے تمام مصارف

باری باری ، سب سے دولتمند شہریوں کے ذمے ڈال دیئے جاتے تھے اور اس محصول کو " تری رار کی " (یعنی جہازوں کا انتظام) کہتے تھے ؛ ہر جہاز کو کھینے والوں کی تعداد ایک سو ستر ہوتی تھی اور اس میں اجیر پردیسی اور غلام اور کچھ حصہ سب سے غریب شہریوں کا شامل ہوتا تھا ۔ جہاز کا چلانا بیس ملاحوں (ہی پر نیای) کے سپرد ہوتا تھا ۔ انہی میں " کلیوس تیس " یعنی پتواریوں کو وقت بتلانے والے شامل ہیں ۔ باقی دس سپاہی (اپی تبای) ان جہازوں کے علاوہ ہوتے تھے ؛ سپہ سالاروں کے ہاتھ میں بری اور بحری دونوں قسم کے کامل اختیارات دے دیئے جاتے تھے ۔

۲۔ تمسٹاکلیس کا اخراج اور انتقال

چند سال تک تمس طاکلیس ، ارس تدیز اور زان تی پوس کی شرکت میں کاروبارِ سلطنت انجام دیتا رہا ۔ لیکن یونان کے اکثر ارباب حکومت کی طرح وہ بھی رشوت خواری کے عیب سے پاک نہ تھا ۔ اور شیخی کی بدولت سرکاری کاموں میں بھی بڑی حماقتیں کر گزرتا تھا ۔ خود اپنے مکان کے قریب اس نے " سب سے عاقل مشیر ، ارتمیس " کے نام پر ایک مٹھ بنوایا تھا ۔ اس بناء پر ، کہ اس نے جو مشورے اپنے وطن کو دیئے وہ سب سے زیادہ عقل و دانائی پر مبنی تھے ۔ اس قسم کی باتوں سے دشمنوں کو اس پر گرفت کرنے کا موقع ملتا تھا ۔ پھر

بھی اُس کے اخراج کی قریبی وجوہ اور ٹھیک وقت، صحیح معلوم
نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ ارس تدیز اور زان تی پوس نے
اس کے خلاف ایکا کرکے فتویٰ عام کی عدالت میں اُسے زیر کیا
(غالباً ۴۷۲ق م) اخراج کے بعد تمس طاکلیس نے ارگوس
میں سکونت اختیار کرلی مگر جب پوسے نیاس کی ایرانیوں
سے ساز باز طشت از بام ہوئی تو اہل اسپارٹہ کو پتہ چلا کہ تمس طاکلیس
بھی اس شرمناک فعل میں کسی حد تک شریک ہے۔ لیکن گو
اُس کی پوسے نیاس کے ساتھ خط کتابت تھی، تاہم یہ
کسی طرح قرینِ قیاس نہیں ہے کہ وہ ایران کے ہاتھ وطن
بیچنے کے ناپاک ارادے کا فی الواقع مجرم ہو۔ بلکہ زیادہ قرینہ
یہ ہے کہ یہ خط کتابت اُن تجاویز کے متعلق تھی جو پوسے نیاس
نے اسپارٹہ کے نظامِ حکومت کے خلاف سوچی تھیں۔ بہرحال
تمس طاکلیس پر وطن فروشی یا غدّاری کا الزام قایم ہوا (۴۷۱ق م)
اور اُسے گرفتار کرکے عدالت میں لانے کے واسطے چند آدمی ارگوس
بھیجے گئے۔ وہ کرکایرا بھاگا مگر وہاں والوں نے اُسے پناہ
دینے سے انکار کیا۔ پھر وہ ایی روس پہنچا۔ مگر لکدمونی اور
ایتھنزی اہل کار برابر تعاقب میں آرہے تھے۔ اسے مجبوراً
ملوسیوں کے بادشاہ اَدمتوس کے ہاں اُترنا پڑا حالانکہ
اس بادشاہ سے اُس کے پہلے تعلقات اچھے نہ تھے۔ یونان
کے یہ مغربی ممالک ہمیں بہت قدیم معاشرت کا نمونہ نظر
آتے ہیں اور ادمتوس کے مکان میں پہنچتے ہی معلوم ہوتا

ہے کہ ہم عہد ہومر کے کسی بادشاہ کی حویلی میں داخل ہو گئے!
تھمس طاکلیس جس وقت اس کے مکان میں پہنچا تو وہ خود موجود
نہ تھا۔ مگر تھمس طاکلیس نے اُس کی ملکہ کی منّت سماجت کی
اور اُسی سے یہ تدبیر بتائی کہ بادشاہ کے بچّے کو گود میں لے
کے وہ آتش دان کے پاس بیٹھ گیا اور جب ادمتوس
واپس آیا تو اُس سے پناہ کی التجا کی۔ چنانچہ اُس نے آئین
مہمانی کو ہاتھ سے نہ دیا اور تھمس طاکلیس کو حوالے کرنے
سے انکار کر دیا۔ اور اس کے بعد اُسے مقدونیہ کے پایۂ
تخت پیدنہ (پدنہ) بھجوا دیا۔ یہاں سے ایک کشتی نے
اُسے سواحلِ آیونیہ تک پہنچایا (سنہ ۴۶۴ ق م) اور جب زرکسنر
مرا اور آرتا زرکسنر (یعنی اردشیر بہمن) وارث تخت ہوا تو
تھمس طاکلیس دارالسلطنت سوس میں پہنچا اور دربارِ ایران میں
سازباز کرنے لگا۔ اس طرح اتفاقات نے اُسے بھی وہی کام
کرنے پر مجبور کیا جو پوسے نیاس کر رہا تھا۔ اور یہ تقدیر کی
عجیب نیرنگی ہے کہ وہی دونوں شخص، یعنی سلامیس و پلاٹیہ
کے سورما، جنھوں نے ایک وقت، یونان کو غلام ہونے سے
بچایا، آخر میں ایسے بدلے کہ خود اپنے کئے کام کو بگاڑنے
کی تدبیریں کرنے لگے اور اُسی ملک کو پھنسانے کے درپے
ہو گئے جسے خود اُنھوں نے نجات دلائی تھی! تاہم یہ ممکن
ہے کہ تھمس طاکلیس کا منشا محض شہنشاہ کو بیوقوف
بنا کے اپنا کام نکالنا ہو اور حقیقت میں وہ یونان سے

دشمنی کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا ہو۔ بہر حال ایران میں اُس نے بہت آبرو پائی اور ضلع مگنیسیہ کی حکومت اُسے ملی جہاں خود مگنیسیہ کے محاصل، نان و طعام کے لئے اور لمپ سکوس و میوس کے، گوشت و شراب کے نام سے اُسے مل جاتے تھے۔ اسی شہر میں اُس نے وفات پائی اور اس کی قبر بھی، اہل وطن کی نامہربانی سے، مگنیسیہ والوں نے ہی اپنی شہر پناہ کے باہر تیار کرائی ؂

۵- اتحادِ دلوس کا سلطنتِ ایتھنز کی شکل اختیار کرنا

اتحادِ دلوس کے شرکا جو لڑائیاں ایران سے لڑ رہے تھے اُن کا تمام انتظام کائمن پسر مِل تیادیس کے سپرد تھا ہم اُوپر پڑھ چکے ہیں کہ اُس نے پوسے نیاس کو سستوس و بائی زنطہ سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا کارنامہ ایئون کی تسخیر تھی (۴۷۶ء ق م) جو سترمین کے دہانے پر ایرانیوں کا آنبارے دردانیال کے اِدھر، سب سے مضبوط قلعہ تھا؛ پھر اُس نے سکی روس کے پہاڑی جزیرے کو فتح کیا جو قزاقانِ بحری کا مامن تھا (۴۷۴ء ق م) یہاں ایٹی کا کے باشندوں کو لا کے بسا دیا گیا تھا اور یہیں یہ مشہور "اکتشاف" ہوا کہ دلفی کے الہامی قول کی بموجب (جس میں اہل ایتھنز کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے قدیم سُورما شاہ تھی سیس کی ہڈیاں لائیں اور عزت کیساتھ دفن

کریں) جزیرۂ سکی روس میں اتفاقاً یا تلاش سے کسی جنگ آزما کی قبر ملی جس میں عہدِ شجاعت کے سے قدوقامت کی ایک لاش رکھی تھی۔ اسی کو لوگوں نے مان لیا کہ تھی سئیس کی لاش ہے۔ کائمن اسے وہاں سے ایتھنز کا لے کر آیا اور عوام الناس اس کام سے جتنا خوش ہوئے شاید اُس کے کسی اور کارنامے سے اتنا خوش نہ ہوئے ہونگے۔

اس واقعے کے چند سال بعد زرکسیز نے اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا بیڑا آراستہ کیا اور یونانی فتوحات کو روکنے کی آخری تیاری کی تھی؛ لہذا کائمن، جو شمالی ایجین میں مصروف جنگ تھا اب جنوب کی طرف روانہ ہوا اور کاریہ کے ساحل پر جس قدر یونانی یا وہاں کے اصلی باشندوں کی بستیاں تھیں ان سب کو ایران کی حکومت سے آزاد کردیا اور صوبہ لیسیہ کے شہروں کو اتحادِ دلوس کی شراکت پر مجبور کیا۔ (۴۶۸ ق م)۔ ایرانی فوج اور بیڑے سے اُس کا مقابلہ، پمفیلیہ میں یوری مدن ندی پر ہوا اور خشکی اور تری دونوں قسم کی لڑائی میں، اُس نے فتح حاصل کی اور دو سو فنیقی جہاز تباہ کردئے؛ اس فتح نے کاریہ سے پمفیلیہ تک جنوبی ایشیائے کوچک کا علاقہ ایتھنز کے سلک اتحاد میں منسلک کردیا اور اگر کوئی آیونیائی شہر ابھی تک ایران کا خراج گزار رہ گیا تھا تو اب آزاد ہوگیا؛

یہ کہنا کہ اتحادِ دلوس نے جو کام اپنے ذمے لیا تھا وہ انجام

نہ پاسکا، کسی طرح درست نہ ہوگا۔ یوریمیڈن کی ندی پر جو فتح
کائمن نے حاصل کی اُس نے یہ کھٹکا ہی مٹا دیا تھا کہ دولتِ
ایران کی جانب سے پھر یونان پر کوئی حملہ ہو؛ اور تھریس میں
جو بعض مقامات ابھی تک ان ملچھوں کے قبضے میں رہ گئے
تھے انہیں بھی مذکورہ بالا فتح کے بعد کائمن نے چھین لیا۔
اور دولتِ ایران کے پنجے سے یونانیوں کو بچانا ہی اتحادِ ڈلوس
کا اصلی مقصد تھا؛ لیکن اتحادی بیڑے نے اب ایک اور
کام بھی اپنے ذمّے لے لیا تھا۔ یعنی وہ ریاستیں جو اتحاد
میں شریک رہنا نہ چاہتی تھیں، اُن پر اتحادی بیڑا چڑھا کر
بھیجا جاتا تھا۔ شہرِ کاریس توس اتحاد میں پہلے ہی شریک
نہ ہوا تھا حالانکہ اُس کے علاقے (یعنی جزیرۂ یوبیہ) کی اور
سب ریاستیں اتحاد میں شریک تھیں؛ اتحادیوں نے اُس کو
مطیع اور بغیر اس کی مرضی کے جبراً اتحاد میں شامل کرلیا۔
(سنہ ۴۷۲ ق م) جزیرۂ نکسوس حلقۂ اتحاد سے باہر ہوگیا تھا۔
اُسے اتحادی بیڑے نے ناکہ بندی کرکے پھر تسخیر کیا۔ (سنہ ۴۶۹ ق م)
یہ دونوں فعل جواز کے پہلو ضرور رکھتے تھے۔ لیکن دونوں
میں آزاد ریاستوں کی خود مختاری کے خلاف، جابرانہ تشدّد
نمایاں تھا اور اس لئے یہ دونوں فعل عام طور پر یونان
میں مطعون ہوئے؛ یہ ظلم اور بھی تلخ و ناگوار اس وجہ سے
تھا کہ نکسوس و کاریس توس دونوں حکومتِ خود اختیاری سے
محروم کردیئے گئے تھے اور در اصل ایتھنز کے محکوم ہوگئے تھے

جو ابھی سے وہ طوق و سلاسل تیار کر رہا تھا جن میں اُسے آیندہ اپنے اتحادیوں کو جکڑنا منظور تھا ؛

ایھتنز اب اس راستے پر چلے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اور فتح یوری مِڈن کے بعد اُسے اور بھی فراغت ہوگئی تھی کہ اتحادِ دلوس کو شہنشاہیٔ ایھتنز کی صورت میں تبدیل کرلے ! ساحل تھریس پر اتحاد کی سب سے طاقتور رکن ، جزیرہ تھاسوس کی ریاست تھی۔ تھریس کے ساتھ تجارت پر اس کی خوش حالی کا بہت کچھ دارومدار تھا۔ پس جب ستیرِمُن کے کنارے اہل ایھتنز ایک نوآبادی قایم کرنے کی کوشش کرنے لگے تو اس میں تھاسوس کو اپنا نقصان نظر آیا اور باہم رقابت پیدا ہوئی۔ اصلی تنازعہ سونے کی کسی کان کے متعلق شروع ہوا اور اہل جزیرہ جنگ پر آمادہ ہوگئے۔ مگر اُن کے بیڑے کو کائمن نے شکست دی (۴۶۳ ق م) اور عرصے تک بحری ناکہ بندی کے بعد اُنھیں ہتیار رکھنے پڑے؛ اُن کی شہر پناہ منہدم کرادی گئی تمام جہاز ایھتنز کے حوالے کرنے پڑے ، اندرون ملک کی زمین اور کان سے انھیں دست بردار ہونا پڑا اور خراج بھی جس قدر اُن سے طلب کیا گیا تھا قبول کرنا پڑا ؛

کاریس توس ، نکسوس اور تھاسوس کی بحری ریاستوں کا جو حشر ہوا وہ نمونے کے لئے کافی ہے گویا آیندہ سے اتحادِ دلوس میں تین قسم کے شرکا تھے :- (۱) غیر باج گزار

اتحادی جو اپنے حصے کے جہاز فراہم کرتے۔ (۲) باج گزار اتحادی جو خود مختار تھے۔ اور (۳) باج گزار اتحادی جو محکوم تھے؛ ظاہر ہے کہ ایتھنز کا فائدہ اسی میں تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اتحادی روپے کی صورت میں اپنا سالانہ چندہ ادا کریں اور جہاز فراہم کرنے والوں کی تعداد جس قدر ہو سکے کم رہے۔ سبب یہ کہ اتحادیوں کے نقد روپے سے جو جہاز تیار ہوتے تھے وہ درحقیقت خود ایتھنز کے بیڑے میں اضافہ کرتے تھے، کیونکہ وہ براہ راست ایتھنز کی نگرانی میں رکھے جاتے تھے؛ پس اب ایتھنز پہلی قسم کے ارکان کی تعداد گھٹانے کے درپے ہوا۔ اور تھوڑے ہی دن بعد صرف تین بڑی اور دولتمند ریاستیں، یعنی لس بوس، خیوس اور ساموس اُس قسم کی شریک رہ گئیں اور باقی سب سے زرنقد سالانہ وصول ہونے لگا۔ مگر دوسری قسم کے اتحادیوں کو تیسرے درجے پر اُتار لانے میں بھی ایتھنز کا فائدہ تھا کہ اُن شہروں کے اندرونی معاملات میں خود دخل حاصل کرے۔ چنانچہ جب یہ شہر خود مختاری کھوکر محکوم ہو جاتے تو اُن کے نظامِ حکومت کے عام اصول ایتھنز ہی کے ایما سے قرار پاتے تھے۔ اور ایتھنز جمہوریت کا دلدادہ تھا لہذا اس کی محکوم ریاستوں میں بھی ہمیشہ اسی طرز کا جمہوری نظامِ حکومت قایم ہو جاتا تھا۔

اس طرح جب کچھ عرصے تک اہلِ اتحاد کے محکوم

بنتے جانے کا عمل جاری رہا تو پھر ایتھنز کو یہ بات بھی اپنی اختیاری نظر آئی کہ جزیرۂ دلوس میں مجلسِ اتحاد کے اجلاس کا سلسلہ موقوف کردے ؛ دیکھا جائے تو اُس کی باضابطہ سلطنت یا شہنشاہی اقتدار اسی وقت قایم ہوگیا تھا جب جنگِ تھاسوس کے دس سال بعد مشترکہ بیت المال دلوس سے شہر ایتھنز میں منتقل ہوا (۴۵۴ھ ق م)۔ گویا اتّحادِ دلوس تو اسی وقت سے معدوم ہوچکا تھا اور گو سرکاری طور پر ہمیشہ "اتّحاد" کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی تاہم معمولی بول چال میں لوگ اب بے تامّل "سلطنت" کا لفظ برتنے لگے تھے۔ اور ایتھنز کی یہ سلطنت شمال مغرب میں متھونہ سے لے کر جنوب مشرق میں لیسیہ کے شہر فاسلیس تک پھیلی ہوئی تھی جس میں تمام بحیرۂ ایجین اور اُس کے شمالی اور مشرقی کنارے شامل تھے۔ عین عروج کے زمانے میں اُس کے ماتحت شہروں کا شمار، دو سو سے بھی خاصا اُوپر تھا۔

بیت المال کے دلوس سے ایتھنز میں منتقل ہونے کے نصف صدی بعد ہی سلطنتِ ایتھنز نسیًا منسیا ہوگئی۔ مگر اس قلیل مدت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا زوالِ دولت عروج کو پہنچنے کے چند ہی سال بعد شروع ہوگیا تھا۔ ایسی سلطنت بنانا، سرے سے یونانیوں کے اُصول تمدّن اور سیاسی خیالات کے خلاف تھا۔ متمدّن دنیاے یونان کی

بنیادہی شہری ریاست کی خود مختاری پر قایم تھی اور یہ حق خود مختاری کوئی شہری ریاست حتی المقدور جزءً بھی چھوڑنا نہ چاہتی تھی؛ کسی عام خطرے کے وقت چند شہروں کا باہم متحد ہوجانا اور ہر شہر کا بعض معاملات میں اس متحد جماعت کی رائے کو فایق مان لینا، ممکن تھا، لیکن اس حالت میں بھی کوئی شہر اس حق سے محروم نہ ہوتا تھا کہ جب چاہے حلقۂ اتحاد سے علٰحدہ ہوجائے (اور اپنی ابتدائی صورت میں اتحادِ دلوس بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہ تھا) چنانچہ جب اُن حالاتِ خاص کا اثر زایل ہوجاتا جن کی وجہ سے کسی شہر کو اتحاد میں شریک ہونا پڑا، تو پھر ہر شہر اتحاد سے دست کش ہونے پر آمادہ ہوجاتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنی کامل آزادئ رائے اور خود مختاری حاصل کرلے؛ باقی شہنشاہی یا سلطنت کو، خواہ کتنے ہی پردوں میں کیوں نہ چھپای جائے، یونان میں ہمیشہ دوسروں کی حق تلفی اور ظلم سمجھا جاتا تھا۔

۶- کائمن کا اصولِ عمل اور اخراج

جس طرح ایرانی لڑائیوں نے یونانی اور غیر یونانی کا فرق زیادہ بیّن کرکے دکھادیا تھا اسی طرح اتحادِ دلوس نے اُس اختلاف کو نمایاں کردیا جو نسل یونانی کے آیونیانی اور ڈورئین گروہوں میں موجود تھا۔ اور اب پلوپنی سس کا ڈوریانی جتھا اسپارٹہ کی سرگروہی میں ایک طرف صف بستہ تھا تو ایجین

کا آیونیانی گروہ ایتھنز کے زیر علم دوسری طرف استادہ تھا۔ مگر ان کی باہمی خصومت چند سال تک فتنۂ خوابیدہ رہی کیونکہ ایرانیوں کا خطرہ ابھی تک زائل نہیں ہوگیا تھا۔ دوسرے ایک حد تک ارس تدیز اور کائمن کی بدولت بھی امن قایم تھا۔ اس لئے کہ کائمن کا طریق عمل ان دو اصول پر مبنی تھا کہ ایک طرف ایران سے جنگ کی جائے تو دوسری طرف اہل اسپارٹہ سے عمدہ تعلقات رکھے جائیں۔ وہ اس دو عملی کے اصول کا حامی تھا کہ ایتھنز "ملکۂ بحور" ہو اور اسی کے ساتھ اسپارٹہ کو خشکی کا بادشاہ تسلیم کرے۔ مگر ارس تدیز کی وفات کے بعد جو نوجوان اربابِ سیاست میدان میں آئے انھوں نے کائمن اور اُن امرا کے خلاف جو کائمن کے ساتھ ہوگئے تھے نیا گروہ تیار کیا۔ اور اس جمہوریت پسند جماعت میں افیالتیس اور زان تی پوس کا بیٹا پری کلیس سب سے نامور شخص تھے جنھوں نے اب مجلسِ ملکی میں نمایاں حصّہ لینا شروع کیا؛

ادِھر خود اسپارٹہ نے کائمن کے طریق عمل کو شدید نقصان پہنچایا۔ وہاں کے شہری اپنی بد دِل رعایا یعنی پری اویکی اور ہلوت آبادی کی وجہ سے ہمیشہ خطرے میں رہتے تھے۔ ۴۶۴ ق م میں وہاں ایک زلزلہ آیا جس نے شہر اسپارٹہ کو کھنڈر کردیا۔ مسّنیہ کی غلام رعیت کو اپنا طوقِ اطاعت اُتار پھینکنے کا یہی موقع ہاتھ آیا۔ اور اسپارٹہ کے ۳ سو سپاہیوں کے دستے کا ایک لڑائی میں اُنھوں نے بالکل قلع قمع کردیا لیکن بعد

میں شکست کھائی اور ایتھوم کے قلعے میں پناہ گزیں ہوئے۔
اس دشوار گزار پہاڑی پر وہ کئی سال تک مقابلہ کرتے رہے یہاں
تک کہ اہل اسپارٹہ نے مجبور ہوکر اپنے حلیفوں سے امداد کی درخواست کی
اس معاملے میں ایتھنز کے جمہوریت پسندوں نے ہنگامہ بپا
کیا کہ کوئی امداد اسپارٹہ کو نہ دی جائے۔ لیکن لوگوں نے کائمن
کی بات پر کان دھرے جس کا قول تھا کہ "ہمیں یونان کو
لنگڑا رکھنا کسی طرح منظور نہ ہوگا۔ ہم ایتھنز کو کبھی اپنی جوٹ کا
ساتھ نہ چھوڑنے دینگے" غرض کائمن ۴ ہزار پیادہ فوج لے کے
مسنیہ پہنچ گیا (۴۶۲ ق م)۔ لیکن گو قلعہ گیری میں اہل ایتھنز
کی مہارت مشہور تھی، مگر ایتھوم کو لینے میں ان کی کوششیں
بھی کارگر نہ ہوئیں؛ اس پر اسپارٹہ نے الٹ کر ایتھنز کی یہ
تذلیل کی کہ جتنے حلیف پہاڑی کے گرد خیمہ زن تھے ان میں
صرف ایتھنز والوں کو کہلا بھیجا کہ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت نہیں
ہے۔

اس واقعے سے ظاہر ہوگیا کہ اسپارٹہ کی دوستی کی خاطر ایثار
کرنا فضول تھا۔ اور جب کائمن اپنی حکمتِ عملی کی اس فضیحت
کے بعد واپس آیا تو افیالتیس اور اس کے گروہ نے "اسپارٹہ
پرست" کہہ کہہ کے اس کی بڑی مذمت کی اور وہ سمجھنے لگے کہ
اُسے فتوئ عام کی رو سے خارج کرنے کی اب بلاخطر کوشش
ہوسکتی ہے۔ چنانچہ فتوئ عام طلب کیا گیا اور کائمن کا اخراج
ہوگیا (۴۶۱ ق م)۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہاں

کائمن کے سب سے بڑے حریف افیالتیس کو کسی نے قتل کردیا یہ عجیب پُر اسرار قتل تھا۔ اور کوئی یقین کے ساتھ کبھی یہ سراغ نہ لگا سکا کہ اُس کا قاتل کون تھا ؎

تھوڑے ہی عرصے بعد اہل ایتھنز کو اسپارٹہ کی اُس شوخ چشمی کا بدلہ لینے کا موقع ملا۔ یعنی جب طویل محاصرہ رہنے کے بعد ایتھوم کے پناہ گزیں باغیوں نے اطاعت قبول کرلی تو انہیں اجازت دے دی گئی کہ اگر وہ پلوپنی سس سے باہر نکل جائیں اور عہد کریں کہ پھر کبھی واپس نہ آئیں گے، تو انہیں کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے گا۔ جب یہ لوگ نکلے تو اہل ایتھنز، جنھوں نے اس وقت اُن کے گھیرنے میں اسپارٹہ کی مدد کی تھی، اب اُن کے پشت پناہ بن گئے اور ان غریب الوطن مسّنیہ والوں کو انھوں نے خلیج کورنتھ کے کنارے شہر نوپاکتوس (نوپاکٹس) میں لاکے بسا دیا، جہاں حال میں ایتھنز نے ایک بحری مستقر قایم کیا تھا ؎

باب نہم

سلطنت ایتھنز پری کلیس کے عہدِ اقتدار میں

(۱) جمہوریہ ایتھنز کی تکمیل

افیالتیس دجب تک وہ زندہ رہا، اور پری کلیس کی رہنمائی میں یہ جمہوری اصول کہ قوم کی قسمت کے اصلی مالک خود جمہور ہیں، ایتھنز میں مزید قوت و وسعت پاتا رہا۔ اگلے تیس سال تک یونان کا سب سے ممتاز شخص **پری کلیس** ہے۔ جس کا باپ **زان تی پوس**، ارس تدیز و تمس طاکلیس کا ہم چشم تھا اور ماں کلیس تنیس کی بھتیجی **اگارستہ** تھی؛ پری کلیس کو سپاہ گری کی تعلیم دی گئی تھی۔ لیکن وہ دو مشہور صاحبانِ حکمت کا زیادہ رہینِ منّت ہے جنھوں نے اُسے درس دیا۔ ان میں ایک ایتھنز کا باشندہ **وامُن** تھا جس کی فن موسیقی میں بڑی شہرت تھی۔ اور دوسرا قصبۂ کلاذومنی کا باشندہ **انکساگورس**، جس کے آفرینشِ عالم اور ترکیبِ طبعی کے متعلق فلسفیانہ خیالات نے **پری کلیس** کو اُن اوہام سے آزاد کر دیا تھا۔ جو عوام النّاس میں رائج تھے۔ انہی عوام کی اُسے رہنمائی کرنی تھی لیکن اُس کی سیاسی رائیں ذاتی غور و فکر کا نتیجہ تھیں۔ اور اسی طرح وہ سلیس و پُر اثر طرزِ گفتار بھی اس کی اپنی تھی جس کے

طفیل وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتا تھا۔ مزاج کے لحاظ سے اُس میں اور **کائمن** میں نمایاں فرق تھا۔ کائمن ہر شخص کا یار اور نہایت بے تکلف لا اُبالی آدمی تھا۔ **پری کلیس** گھر سے بھی شاذ و نادر باہر نکلتا تھا۔ اپنے خانگی آمد و خرچ میں نہایت احتیاط اور کفایت شعاری برتتا۔ دعوت کے جلسوں میں جانے سے بچتا اور اپنا وقارِ خودداری قایم رکھنے کا اسے حد درجے خیال رہتا تھا۔

ان دنوں **ایتھنز** میں قدامت کی سب سے بڑی یادگار مجلس **آریوپاگوس** (ایریوپگیس) باقی تھی۔ اور اس میں صرف آرکن شامل تھے جو ریاست کے دو سب سے دولتمند طبقوں سے منتخب کئے جاتے تھے۔ پس ۴۶۲ ق م میں **افیالتیس** کی ایک تجویز کے مطابق اِن کا وہ حقِ احتساب اڑا دیا گیا جس کی رُو سے وہ لوگوں کے ذاتی افعال و اطوار کی تحقیقات کرسکتے تھے۔ گویا اب اِس برگزیدہ جماعت کے پاس مقدماتِ قتل کی سماعت کے سوا اور کوئی اختیار نہ رہا۔ آئندہ سے تمام قابلِ دست اندازی جرائم کے دعوے صرف مجلسِ انتظامی یا مجلس عوام کے سامنے پیش ہونے لگے اور جمہور ہی اپنی عدالتوں میں خاطی عہدہ داروں کی تحقیقات کے مجاز رہ گئے۔

اسی زمانے میں جمہوریت کی ایک اور منزل اس طرح طے ہوئی کہ آرکنی ایک باتنخواہ عہدہ بنا دیا گیا اور اس کے لئے آبادی کے کسی خاص طبقے کا فرد ہونے کی شرط نہ رہی۔ جمہوریت کی ترقی کے دو بڑے آلے قرعہ اور تنخواہ تھے۔ اب تک آرکن اور بعض چھوٹے عہدہ داروں اور مجلسِ انتظامی کے ارکان کا تقرر اس طرح ہوتا تھا

کہ پہلے بہت سے امیدوار بہ ذریعۂ قرعہ اندازی چھانٹ لئے جاتے اور اس کے بعد با قاعدہ انتخاب سے حسب ضرورت تعداد مقرر کی جاتی تھی ۔لیکن اب یہ انتخاب کا طریقہ بالکل اُڑا دیا گیا ۔ اور مجلس انتظامی کے پانچ سو افراد اور آرکنوں کا تقرّر صرف قرعہ اندازی سے ہونے لگا کہ تمام اہل ملک میں سے جس کا نام نکل آئے وہی مقرر ہو جاتا تھا ۔ جس کے معنی یہ تھے کہ ہر آزاد شہری کو اعلےٰ مناصب اور ملکی معاملات میں حصہ لینے کا سب کے برابر موقع حاصل ہوگیا ۔

یہ ظاہر ہے کہ جب تک ان عہدوں کی تنخواہ مقرّر نہ ہو یہ طریقہ نہ چل سکتا تھا ۔کیونکہ غریب باشندے سرکاری خدمات کی انجام دہی کے لئے وقت نہیں نکال سکتے تھے ۔پس نہ صرف آرکن بلکہ مجلس انتظامی کے ارکان کے واسطے بھی مشاہرے کا قاعدہ بنایا گیا اور پیری کلیس کی سیاسی اصلاحات میں سب سے نمایاں شئے یہی نیا آئین ہے ۔ آریوپاگوس کے حقوق کے خلاف جب ہنگامہ ہوا تو پیری کلیس ہی نے یہ تجویز منظور کرائی تھی کہ ارکانِ عدالت کو بھی ایک یا دو اوبل[1] حق الخدمت یومیہ دیا جایا کرے ۔ (غالباً ۴۶۲ھ ق م) اور اس میں کلام نہیں کہ عدالتی کام اس قدر زیادہ بڑھتا جاتا تھا کہ ارکانِ عدالت کی اتنی کافی تعداد جو روزانہ بغیر کسی معاوضے کے اسی کام میں لگی رہے ، میسرآنی محال ہوتی ۔

---

[1] اوبل ۔ چاندی کا ایک چھوٹا سکہ جو ہماری دونی کے ہم قیمت ہوتا تھا ۔ مترجم

لیکن اب اہلِ ایتھنز کا فائدہ اس میں تھا کہ نئے حقوق و مراعات میں حصّہ لینے والوں کی تعداد، یعنی "شہریوں" کا شمار حتی الامکان، کم ہو جائے۔ چنانچہ تقریباً دس سال بعد جب باشندگانِ اٹیکا کی فہرستوں پر نظر ثانی ہوئی تو اس میں بڑی سختی کی گئی۔ اور ایک قانون نافذ کیا گیا کہ کسی ایسے بچّے کا نام فہرست میں داخل نہ کیا جائے جس کے ماں باپ ایتھنز کے شہری اور با ضابطہ بیاہے ہوئے نہ ہوں۔ یہ ایسا قانون تھا کہ اگر اس وقت تھمس طاکلیس اور ایتھنز کا نامور مقنّن کلیس تھنیس، ہوتے تو وہ بھی خارج کر دیئے جاتے کیونکہ اُن کی مائیں پردیس کی تھیں۔

جمہوریۂ ایتھنز کی ایک دلچسپ خصوصیت جسے نظر انداز نہ کرنا چاہیئے، یہ تھی کہ اس میں سرکاری مصارف کا بار دولت مندوں پر ڈالا جاتا تھا غریبوں پہ اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ دوسرے یہ بار عمر بھر میں دو ایک مرتبہ ہی کسی شخص کو اٹھانا پڑتا تھا۔ سہ طبقہ جہازوں کے متعلّق تو ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ اُن کی تیاری اور جہازیوں کی فراہمی دولتمندوں کے ذمّے ڈال دی جاتی تھی اور وہ نہ صرف اس کے ذمے دار ہوتے بلکہ خود انہی کو اپنے اپنے جہاز میں بیٹھ کر جہاں ضرورت ہو وہاں جانا پڑتا تھا۔ خرچ کی دوسری مد یہ تھی کہ شہر کی طرف سے کبھی کبھی کسی مقدّس کام کے لئے مذہبی وفد بھیجے جاتے تھے۔ اس موقع پر بھی کسی دولت مند شہری کو چُن لیا جاتا کہ وہ وفد کا انتظام اپنے ذمّے لے اور بیت المال سے جو رقم دی جاتی تھی اس کی کمی کو حسب ضرورت خود اپنی جیب سے پورا کرے۔ لیکن اِن سب "رسوم" یا سرکاری

محصولات سے کہیں زیادہ قابل لحاظ اور ایتھنزی معاشرت کی خصوصیت وہ مصارف و اہتمام ہیں جو ڈایونی سیئس کے تہواروں میں سانگ تماشوں کے واسطے دولتمندوں کے ذمے کردیئے جاتے تھے۔ اس کام کے لئے ہر سال ہر قبیلہ اپنے ایک مالدار ہم قبیلہ کو نامزد کردیتا تھا جسے "کورگوس" کہتے۔ اور گانے بجانے والوں کی ایک منڈلی تیار کرنا اور ناٹک کے ناچ گانے سکھانے کے لئے کسی ہوشیار استاد کو مقرر کرنا، اس شخص کا فرض ہوتا تھا۔ پھر مقابلے میں جس کی منڈلی بازی لیجاتی اسے تاج (یا مکٹ) اور ایک برنجی تپائی انعام میں ملتی۔ ریاست کی جانب سے مذہب کی یہ خدمت حقیقت میں جوہر قابل کی خدمت ثابت ہوئی۔ اور وہ دولت مند جو اس کام پر لگائے جاتے تھے کہ اپنا وقت اور روپیہ ناچ والوں کے فراہم کرنے میں صرف کریں، گویا ٹریجڈی اور کومڈی کے نامور اساتذہ کی، اور اس لئے تمام دنیا کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے تھے:

(۲) ایتھنز کی جنگ پلوپنی سس کے ساتھ

کائمن کی جلا وطنی اس بات کی علامت تھی کہ معاملاتِ خارجہ میں ایتھنز کا جو اصول عمل اب تک رہا تھا اس میں بہت بڑا تغیر پیدا ہوگیا۔ اس نے لکدمونیوں کا ساتھ چھوڑ کے اب اُن کے دشمن اہل آرگوس و تھسالیہ کے ساتھ رشتۂ اتحاد قائم کیا تھا۔ اُسکی بحری سلطنت اور روز افزوں تجارت اُسے اسپارٹا کے دو حلیفوں کا (یعنے کورنتھ و اجی نا کے عظیم تجارتی شہروں کا) سخت رقیب بنا رہی تھی۔ اور جب ایتھنز کے ایک سپہ سالار نے

لوکریس والوں سے نوپاکتوس چھین کر وہاں بحری مستقر بنایا تو پھر لڑائی ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا۔ کیونکہ یہ مقام خاص خلیج کورنتھ پر واقع تھا اور وہاں سے اہل ایتھنز جب چاہتے کورنتھ کے تجارتی جہازوں کی جانبِ مغرب آمد رفت منقطع کرسکتے تھے؛ غرض اب لڑائی یقینی تھی اور جلد ہی اس کا موقع بھی آگیا ؛

مگارا والوں نے سرحد کے متعلق کورنتھ سے کسی نزاع پر پلوپنی سس کی ہیئتِ اتحاد کا ساتھ چھوڑدیا (۴۵۹ ق م) اور ایتھنز کے دامنِ حمایت میں آگئے؛ ایتھنز کے حق میں مگارا کے اتحاد سے بہتر کوئی فالِ نیک نہ ہوسکتی تھی۔ کیونکہ یہ علاقہ تحت میں ہو تو جزیرہ نمائے پلوپنی سس کے مقابلے میں، اس کی سرحد نہایت مستحکم ہو جاتی اور مشرق کے سرے پاگی سے لے کے مغرب میں خلیج سارونی کے شہر نیسایا تک پوری خاکنائے کورنتھ اُس کے قبضے میں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ بلا تاخیر اُس نے مگارا کی پہاڑیوں سے نیچے نیسایا کی بندرگاہ تک، جو سلامیس کے بالمقابل تھی ایک دوہری فصیل بنانی شروع کی اور ان "لمبی دیواروں" میں خود اپنی فوج متعین کردی۔ اس طرح مشرقی ساحل کا راستہ اُس کے قبضے میں آگیا اور آٹی کا پر خشکی کی جانب سے حملہ روکنے کے واسطے نہایت مستحکم مورچہ بن گیا ؛

اس واقعے کے تھوڑے ہی عرصے بعد لڑائی چھڑ گئی لیکن اوّل اوّل اسپارٹہ نے اُس میں خود کوئی حصہ نہیں لیا؛ پلوپنی سس

والوں کے بیڑے کو پہلی شکست اہل ایتھنز نے لک ری فالیا کے ٹاپو پر دی جو اجی نا اور ساحلِ ارگوس کے درمیان واقع ہے؛ یہاں سے اہل اجی نا بھی لڑائی میں شریک ہوتے ہیں؛ وہ جانتے تھے کہ اگر کورنتھ کو سخت شکست ہوگئی تو پھر خود اُن کی خیر نہ ہوگی اور ساری خلیج سارونی پر ایتھنز ہی کا تسلّط ہوگا۔ غرض اجی نا کے قریب ایک اور بڑا بحری معرکہ ہوا (۴۵۸ ق م) جس میں اجی نا اور ایتھنز دونوں کے حلیف بھی شریک تھے۔ اہل ایتھنز نے ستر (۷۰) جہاز پکڑ لئے اور جزیرے میں فوج اتار کے شہر کو گھیر لیا۔ اس وقت پلوپنی سس والوں نے پیادوں کی ایک جمعیت اہل اجی نا کی مدد کے لئے بھیجی اور ساتھ ہی کورنتھ کی سپاہ مگارا کی طرف بڑھی اور اُسے امید تھی کہ ایتھنز سے ایک ہی وقت میں مگارا کو بچانے اور اجی نا کو گھیرے رہنے کا انتظام نہ بن پڑے گا۔ لیکن ایتھنز کے جو شہری جنگی خدمت کی مقررہ عمر سے متجاوز تھے۔ اور نیز وہ نوجوان جو ابھی تک اُس کے تحت میں نہ آتے تھے۔ اُنکی ایک ہنگامی فوج فوراً مرتب کرلی گئی اور می رونی دیس کی سپہ سالاری میں مگارا کی طرف روانہ ہوئی۔ لڑائی میں دونوں فریق اپنی فتح کے مدّعی تھے لیکن جب کورنتھ والے میدان سے ہٹ گئے تو نشانِ فتح اہلِ ایتھنز ہی نے قایم کیا۔ اس پر کورنتھ کے سپاہیوں کو ان کے ہم وطنوں نے اس قدر چڑایا کہ وہ بارہ دن کے بعد پھر لوٹے اور جواب میں اپنی فتح کی یادگار بنانی شروع کی۔ مگر جس وقت وہ اس کام میں لگے ہوئے تھے، اہل ایتھنز نے

شہر مگارا سے نکل کے اُن پر یکبارگی حملہ کیا اور سخت شکست دی ⁂

اگر ان کامیابیوں کے سال کو ایتھنز کی تاریخ میں "اینوس مرابلیس" (یعنی عجائبات کا سال) کہا جائے تو بجا ہے؛ لک ری فالیا اور اجی نا کی لڑائیاں اُس نے اپنے بیڑے کے صرف ایک حصّے سے جیتی تھیں کیونکہ عین اُس وقت جب کہ یونان کی حریف ریاستوں سے اس کا مقابلہ تلوار سے ہونے والا تھا اُس نے مصر کو ایک بحری مہم روانہ کی تھی: اور یہ ایسی خطرناک بازی تھی کہ ایتھنز نے بہت کم کوئی ایسی بازی بَدی ہوگی ⁂

ایتھنز اور اتّحادیوں کے ۲ سو جہازوں کا ایک بیڑا قبرس کے سمندر میں ایران سے مصروفِ جنگ تھا کہ اُسے لبیاؔ کے ایک رئیس اناروس نے مصر کی طرف آنے کی دعوت دی۔کیونکہ وہ ایرانیوں کے خلاف دریائے نیل کی زیرین وادی میں لوگوں کو بغاوت پر اُبھار رہا تھا⁂

اناروس کے بلاوے پر سب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اگر ایتھنز ملک مصر کو ایرانیوں کی حکومت سے نجات دلادے تو وادیٔ نیل کی بیرونی تجارت پر اُسی کا قبضہ ہو جائے گا اور وہ ساحل پر ایک بحری مستقر قایم کر سکے گا۔پس امیرِ لبیا کی صدائے استعانت پر بیڑے کے سرداروں نے لبّیک کہی اور ۴۵۹ق م میں دریائے نیل میں اس وقت داخل ہوئے جب کہ اناروس اپنی مراد کو پہنچ چکا تھا۔ اور اس ایرانی فوج کو جو بغاوت فرو کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی، نیل کے شاخ در شاخ دہانے پر شکست دے چکا تھا؛ یونانی بیڑے نے

دریا دریا آگے بڑھ کے شہر ممفس پر قبضہ کرلیا تاہم اس کا "قلعہ سفید" اُن کے ہاتھ نہ آیا جس میں ایرانی فوج برابر مقابلہ کئے گئی۔ لیکن واقعی بات یہ ہے کہ اس موقع پر ایتھنز کی قوّت کا دو طرف منقسم ہونا، اس کی بڑی بدنصیبی تھی - اپنی پوری فوج سے وہ پلوپنی سس پر کاری ضرب لگا سکتا تھا اور اسی طرح اگر پوری فوج یہاں ہوتی تو وہ مصر میں اپنی مراد پا سکتا تھا:

غرض، اجی نا کا محاصرہ بھی برابر ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پچھلی لڑائی کے دو سال بعد اہل اجی نا نے ہتیار رکھ دئے اور مجبوراً ایتھنز کو اپنا بیڑا حوالے کرنا اور خراج دینا قبول کیا۔ (۴۵۶ قم) ایسی مبارک اور مفیدِ مطلب کوئی فتح ایتھنز کے لئے نہ ہو سکتی تھی جیسی کہ یہ فتح تھی - اُن کا وہ رقیبِ تجارت، وہ مالدار ڈوریانی جزیرہ جو ان کی آنکھوں میں خار تھا اور جب کبھی وہ اپنی پہاڑیوں پر چڑھکر نظر دوڑاتے تو خلیج کے پار انہیں لالچ دلاتا تھا، آخرکار، آج اُن کے قدموں میں بے دست و پا پڑا تھا:

ادھر، یونان کے دوسرے حصوں میں جو واقعات پیش آرہے تھے انہوں نے انجام کار خود لکدمونیوں کو جنگ میں حصّہ لینے پر آمادہ کرادیا۔ پلوپنی سس کے باہر سے جس کام کا بلاوا اُنہیں آیا تھا وہ صلہ رحم پر مبنی تھا۔یعنی انہیں اپنی قدیم ڈوریانی برادری کی مدد منظور تھی (جو علاقہ ڈوریس میں آباد تھی) اور اس کے تین قصبات میں سے ایک پر اہل فوکیس قابض ہو گئے تھے۔ لیکن ان غاصبوں کو قصبے کے واپس دینے پر مجبور کرنا اتنی بڑی

فوج کے واسطے، جس میں ۱۵ سو لکدمونی ہپ لیت (پیادے)، اور دس ہزار اتحادیوں کے سپاہی شامل تھے، کوئی مشکل بات نہ تھی، مگر در اصل انہیں ایک اور ہی مہم درپیش تھی جس کی منزلِ مقصود بیوشیہ کے علاقے میں واقع تھی؛ صاف نظر آتا ہے کہ اِس علاقے میں اہل اسپارٹہ ایک طاقتور ریاست بنا دینی چاہتے تھے جو ایتھنز کو زیادہ اُبھرنے کا موقع نہ دے۔ چنانچہ اسی غرض سے انھوں نے پھر تھبز کو استادہ کیا اور بیوشیہ کے شہروں کو مجبور کیا کہ وہ اُس کے ساتھ متحد ہوں۔ یہ کام ہوچکا تو فوج کو پلوپنی سس کی واپسی کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں نظر آئیں۔ مگارا کے پہاڑی دروں کی ایتھنز کے سپاہی پاسبانی کر رہے تھے اور خلیج کورنتھ میں بھی اُن کے جہازوں نے راستہ گھیر رکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس پریشانی میں اسپارٹہ والوں کو یہی سوجھی کہ براہ راست ایتھنز پر پیش قدمی کریں جہاں اُس وقت لوگ (شہر سے بندرگاہ تک) اپنی لمبی دیواریں بنانے میں مصروف تھے۔ چنانچہ پلوپنی سس کی فوج سرحد آٹکی کا قریب تناگرا تک بڑھ آئی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ سرحد کے اندر قدم رکھے اہل ایتھنز مقابلے کے لئے ۱۴ ہزار جوان لے کر آ پہنچے جن میں ایک ہزار ارگوس کے سپاہی اور کچھ تھسالیہ کے سوار بھی شامل تھے۔ اس موقع پر جب کہ اہل ایتھنز بیوشیہ کی سرزمین میں خیمہ زن تھے، جلا وطن سردار کائمن (جو اپنے دیس کی سرزمین پر قدم نہ رکھ سکتا تھا) اُن کے پڑاو میں آیا اور جب خود اُسے وطن کے لئے سینہ سپر ہونے کی اجازت

نہ ملی تو اُس نے اپنے دوستوں کو مردانہ وار جنگ کرنے کا جوش دلایا۔ کائمن کے اس فعل نے گویا اُس کی باز طلبی کا راستہ تیار کردیا۔ اور جب لڑائی ہوئی تو اُس کے دوست بھی اس جانبازی کے ساتھ لڑے کہ اُن میں سے کوئی شخص زندہ نہ بچا۔ لڑائی میں طرفین کا شدید نقصان ہوا لیکن فتح لکدمونیوں نے پائی (۴۵۷ ق م) تاہم شہر ایتھنز پر اِس لڑائی کی وجہ سے کوئی آنچ نہ آئی۔ اور فتح مندوں کو اپنی فتح سے فقط اتنا فائدہ ہوا کہ وہ خاکنائے کورنتھ کے راستے واپس آگئے +

اب ایتھنز نے دم لینے کے لئے، وقت کے وقت اسپارٹہ سے صلح کرنی چاہی۔ اس کام کو خاطر خواہ انجام دینے کیلئے جلا وطن کائمن سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ تھا۔ پس پری کلیس کی تحریک سے لوگوں نے اس کی واپسی کا حکم نافذ کیا۔ لیکن جب صلح نامے کی شرایط طے ہوگئیں تو کائمن پھر ایتھنز سے خود ہی باہر چلا گیا +

جنگ تناگرا کے دو مہینے بعد اہل ایتھنز نے می رونی دیس کے ماتحت بیوشیہ پر ایک مہم روانہ کی اور مقام انوفیتا پر جو فیصلہ کن جنگ ہوئی اُس نے ایتھنز کو تمام علاقہ بیوشیہ کا مالک بنادیا۔ (۴۵۶ ق م) لیکن یہاں کے شہروں کو اتحاد دلوس میں شریک نہ کیا گیا بلکہ انہیں یہ عہد کرنا پڑا کہ ایتھنز کی بحری فوج کے لئے مقررہ تعداد میں سپاہی فراہم کرتے رہیں گے۔ اسی کے ساتھ ایک طرف فوکیس تو از خود ایتھنز کا حلیف بن گیا

اور دوسری طرف لوکریس (مشرقی) کو مجبوراً اُس کا اقتدار تسلیم کرنا پڑا؛ انوفتیا اور تناگرا کی لڑائیوں کے نتائج یہ تھے۔ اور اب ایتھنز کو فرصت تھی کہ اطمینان سے اپنی لمبی دیواروں کی تکمیل کرتا رہے ؀

لیکن سمندر پار، اقصائے جنوب کے معرکوں میں اقبال نے ایتھنز کا ساتھ نہ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ممفس کی تسخیر کے بعد وہ کوئی کامیابی مصر میں حاصل نہ کر سکے اور "قلعہ سفید" اسی طرح اڑا رہا۔ یہاں تک کہ اردشیر نے مگابازو کے ماتحت فوج کثیر مصر کو روانہ کی اور فنیقیہ کا بیڑا اس کی مدد پر تھا۔ جنگ میں شکست دے کے اُس نے یونانیوں کو ممفس سے نکال دیا اور پروسوپیتیس میں گھیر لیا۔ اس مقام کے چاروں طرف ایک نہر تھی جس نے دریائے نیل کی دو شاخوں کو بیچ میں سے کاٹ دیا تھا۔ اس لئے یہ ایک جزیرہ سا بن گیا تھا جس کی مگابازو نے ناکہ بندی کر دی اور اٹھارہ مہینے تک یونانیوں کو گھیرے رہا آخر اُس نے نہر کا رخ بدل کے اس کا پانی خشک کر دیا اور یونانی جہاز جو نہر میں تھے خشکی پر کھڑے رہ گئے۔ اب تمام جزیرہ ساحل سے مل گیا اور اُس پر فوج لے جانا ممکن ہو گیا تھا۔ لہذا یونانیوں نے اپنے جہاز جلا دئے اور ببیلوس میں ہٹ کر اطاعت قبول کر لی۔ (۴۵۴ ق م)۔ پھر مگابازو نے انہیں واپس جانے کی اجازت دے دی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد محصورین کو چھڑانے کے لئے پچاس جنگی جہازوں کا ایک دستہ ایتھنز سے

آیا تھا لیکن اس پر دریاے نیل کے ایک دہانے پر فنیقیہ کے زبردست بیڑے نے حملہ کیا اور صرف چند جہاز بچ کر سلامت جاسکے ؛

ہر چند اس نا شدنی اور نا سازگار مہم میں اہل ایتھنز کے جہاز تلف ہوے اور زرِ کثیر کا خون ہوا، لیکن یہ زمانہ اُن کی سلطنت کے انتہاے عروج کا زمانہ ہے۔ بلکہ مصر ہی کے نقصانات کو حیلہ بنا کے انہوں نے اتحادِ دِلوس کا مشترکہ خزانہ اپنے قلعے میں اٹھوا منگایا کہ مبادا ایرانی بیڑا (جس کا اب مقابلہ دشوار ہے) آن کے جزیرۂ دلوس کو چھین لے ؛

اس کے علاوہ، اب ایتھنز کی سلطنت میں نہ صرف بحری بلکہ بری علاقے بھی شامل تھے۔ سرحد پار کے دونوں ملک، مگارا اور بیوشیہ اُس کے غاشیہ بدوش تھے۔ بیوشیہ سے آگے فوکیس و لوکریس پر درۂ تھرموپلی تک اُس کی قلمرو تھی۔ ارگوس میں اُسے رسوخ حاصل تھا۔ اجی نا اس کی بحری سلطنت کا اور اجی نا کے جہاز، اُس کے بیڑے کے، جزو بن چکے تھے۔ گویا تمام خلیج سارونی اُس کی ایک جھیل بن گئی تھی جس کے قریب قریب ہر طرف ایتھنز کا مُلک تھا ؛

خاکناے کا بڑا تجارتی شہر، کورنتھ، ایتھنز کا سب سے خطرناک دشمن تھا اور اسی لئے پری کلیس کی حکمت عملی کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ خلیج کورنتھ کو بھی ایتھنز کی جھیل بنا دیا جاے تا کہ شہر کورنتھ اپنے دونوں سمندروں کی طرف سے نرغے میں آجائے، مگارا،

بیوشیہ اور خاص کر شہر نوپاکتوس کے قبضے کی بہ دولت خلیج کا شمالی ساحل، خاکنائے کورنتھ سے لے کر مغربی دروازے تک، ایتھنز کے تحت میں آگیا تھا۔ لیکن خلیج کے جنوبی کنارے ابھی تک خالص پلوپنی سسی تھے اور باہر کے رخ، ساحلِ اکرنانیہ کے کئی با موقع مقام اس قابل تھے کہ اُن پر قبضہ کیا جائے چنانچہ ادھر، کشور کشائی کا آغاز سپہ سالار تول میدیس نے کیا اور پات ری کے مقابل کورنتھ کی نو آبادی چالکیس کو فتح کرلیا۔ (۴۵۵ ق م)۔ اس کے بعد خود پری کلیس ایک مہم لے کر گیا کہ تول میدیس نے جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ جاری رہے۔ (۴۵۳ ق م) اور ہر چند اُسے کوئی جنگی فتح حاصل نہیں ہوئی تاہم اکائیہ کے شہروں کا ایتھنز کے حلقۂ اتحاد میں داخل ہونا بہ ظاہر اسی مہم کی کارگذاری تھا۔ اور یہ تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ مہم جانے کے کچھ دن بعد ہی اکائیہ کا علاقہ ایتھنز کے تحت میں آگیا اور چند سال تک ایٹی کائی جہاز خلیج سارونی کی طرح خلیج کورنتھ میں بھی اسی انداز سے آتے جاتے رہے کہ گویا وہ خاص اُن کی مِلک ہے ‡

۳۔ ایران کے ساتھ مصالحت

پچھلے چند سال کی لڑائیوں نے ہر اعتبار سے ایتھنز پر بڑا بوجھ ڈال دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ بار ہلکا ہو جائے لیکن پری کلیس کی مہم کے بعد تین چار سال گزرنے تک

صلح کی کوئی صورت نہ نکلی؛ اور مصالحت کی ابتدا ہوئی بھی تو
ارگوس و اسپارٹہ سے ہوئی جنھوں نے آپس میں تیس سال تک
جنگ نہ کرنے کا عہد کیا۔ اسی وقت کائمن نے، جواب ایتھنز آگیا تھا
پانچ سال کے واسطے ایتھنز اور اہل پلوپنی سس میں صلح کرادی (۴۵۲ قم)
ایتھنز اور اس کے اتحادیوں کو اب پھر فرصت مل گئی کہ اطمینان
سے ایران کے خلاف جنگ تازہ کریں۔ اور سپہ سالاری کے لئے
انھوں نے بالطبع کائمن ہی کو منتخب کیا؛ وہ پہلے قبرس گیا جہاں
فنیقیہ کا بیڑا (مصری بغاوت فرو کرنے کے بعد) دوبارہ ایرانی اقتدار قایم
کرنے میں مصروف تھا۔ مگر یونانی کی ٹیِن کا محاصرہ کر رہے تھے کہ اسی
زمانے میں کائمن مرگیا (۴۵۰ قم)۔ پھر قلت رسد کی وجہ سے محاصرہ
بھی اٹھانا پڑا۔ لیکن وہاں سے واپس ہوتے میں یونانی بیڑے کا فنیقیہ
اور سلیسیہ کے جہازوں سے مقابلہ ہوگیا اور قبرس کے شہر سلامیس
کے آگے یونانیوں نے خشکی اور تری دونوں پر فتح حاصل کی ؛

اس فتح کے باوجود ایتھنز کو جنگ جاری رکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔
ایک طرف ایران سے اور دوسری طرف خود یونانی دشمنوں سے پورے
زور کے ساتھ جنگ کرتے رہنا ممکن نہ تھا۔ اور ایران والوں سے
صلح صرف اس صورت میں ہو سکتی تھی کہ اپنے مقبوضات سے ہاتھ
اُٹھالیا جائے۔ پری کلیس ایتھنز کی شہنشاہی کا بڑا دلدادہ تھا اور اسکا
مطمح نظر یہ تھا کہ خود یونان کی حدود میں ایتھنز کی شہنشاہی اور
حکومت کا دائرہ وسیع ہو۔ اس کے برخلاف ایرانیوں سے
جنگ کا بڑا حامی کائمن تھا۔ وہ مرگیا اور اس لئے اب ایران کے

ساتھ مصالحت آسان ہوگئی۔ چنانچہ غالباً ۴۴۸ ق م میں صلح کا معاہدہ ہُوا۔ اِس میں شہنشاہ ایران نے اقرار کیا کہ ایران کے جنگی جہاز بحیرۂ ایجین میں نہ بھیجے جائیں گے اور ایتھنز نے قول دیا کہ سلطنتِ ایران کے سواحل حملوں سے محفوظ رہیں گے۔

اسی واقعے پر یونان و ایران کی کشمکش کا پہلا باب ختم ہوتا ہے۔ خاتمے پر، یونانی شہر جو کہ اجانب کے قبضے میں تھے، بجز جزیرہ قبرص کے، سب کے سب عالم یونانی کی آزاد ریاستوں میں دوبارہ آملے۔

۴۔ ایتھنز کی ناکامیاں۔ امن سی سالہ

مگر ایرانیوں سے صلح ہو جانے کے بعد ایتھنز کے مقبوضات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس، بعض علاقے، جو حال میں اس نے حاصل کئے تھے، اُس کے ہاتھ سے نکلنے لگے ارکومنوس، شیرونیہ اور مغربی بیوشیہ کی بعض اور بستیاں اُن اُمرا نے چھین لیں جنھیں جلاوطن کردیا گیا تھا۔ لہٰذا ایتھنز کو فوراً مداخلت کرنی پڑی مگر سپہ سالار تول میدیس جو فوج لے کے چل کھڑا ہوا اس کی تعداد بالکل ناکافی تھی۔ شیرونیہ پر تو اُس نے قبضہ کرلیا اور فوج متعین کردی لیکن اُرکومنوس پر اُس نے پیش قدمی نہ کی اور وطن کو واپس جارہا تھا کہ اِس شہر کے جلاوطنوں نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا اور کرونیہ کے قریب شکست دی (۴۴۷ ق م)۔ خود تول میدیس جنگ میں کام آیا۔ بہت سے ہپ لیت (پیادہ سپاہی) اسیر ہوگئے اور انہی کے فدئے میں ایتھنز کو علاقہ بیوشیہ سے دست بردار

ہونا پڑا - گویا انوفیتیا کی جنگ کا ماحصل، کرونیہ کی جنگ میں برباد ہوگیا - اور بیوشیہ کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد ہی فوکیس اور لوکریس کے علاقے بھی ایتھنز کے قبضے سے نکل گئے +

مگر لڑائی کا اس سے بھی بدتر نتیجہ یہ وقوع میں آیا کہ عین اسی زمانے میں یوبیہ اور مگارا نے بغاوت کی - یہاں بھی امرا کے گروہ یا حکومتِ خواص کے حامی مائۂ فساد تھے - پری کلیس جو اس وقت سپہ سالار تھا فوراً سات قبایل کی فوج لے کے خود یوبیہ پر چلا اور باقی تین قبیلوں کے دستے مگارا کی طرف روانہ ہوے - لیکن وہ جزیرہ یوبیہ میں اُترا ہی تھا کہ خبر پہنچی کہ شہر مگارا میں جو سپاہ متعین تھی وہ قتل ہوگئی اور پلوپنی سس کی ایک فوج خود ایٹی کا پر بڑھ رہی ہے - یہ سنتے ہی وہ بہ عجلت واپس ہوا - اور اُن فوجوں سے جا مِلا جو پہلے مگارا کی جانب روانہ ہو چکی تھیں ؛ اُس کی واپسی نے افواج پلوپنی سس کے سپہ سالار شاہ پلیس توناکس کے منصوبے خاک میں مِلا دیئے اور وہ واپس چلا گیا ؛ اس طرف سے مطمئن ہوکر پری کلیس کو پھر فرصت مل گئی کہ یوبیہ کو دوبارہ تسخیر کرے ؛ اس جزیرہ کے شمال میں شہر ہیس تیایا تھا - اس کے ساتھ بڑا ظالمانہ سلوک کیا گیا - کیونکہ غالباً وہی سب سے زیادہ مقابلے پر اڑا رہا تھا - چنانچہ اس کے تمام باشندے شہر سے نکال دیئے گئے اور اس کی زمینیں ایتھنز نے اپنے قبضے میں لے لیں ؛ لیکن اہل ایتھنز کی نظر میں اب امن اس درجے ناگزیر ہوگیا تھا کہ پائدار صلح کی

خاطر انہوں نے مجبوراً بہت سی رعایتیں دینی، گوارا کیں۔ مگارا
ان کے قبضے سے پہلے ہی نکل چکا تھا لیکن اس کی دو بندرگاہیں
نیسایا اور پاگی اُن کے پاس تھیں۔ اب انہیں اور علاقہ اکائیہ
کو بھی چھوڑنا پڑا اور انہی شرائط پر ایتھنز اور پلوپنی سس کی ریاستوں
میں ایک سی سالہ معاہدہ صلح پر دستخط ہو گئے۔ (۴۴۶ ق م)۔ دونوں
طرف کے حلیفوں کے نام صلح نامے میں شریک تھے اور اُس کی
ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اسپارٹہ یا ایتھنز کوئی اپنے اتحاد میں فریقِ
ثانی کے کسی حلیف کو شامل نہ کرے گا۔ البتہ غیر جانب داروں کو
اجازت تھی کہ وہ جس جتھے میں چاہیں شریک ہو جائیں۔

اس صلح میں ایتھنز کی بہت سُبکی تھی اور اگر اہل پلوپنی سس کے
ایٹی کا میں گھس آنے کا اس قدر خوف و ہراس نہ پیدا ہوگیا ہوتا
تو غالباً کبھی ایسی صلح نہ ہوتی۔ کیونکہ، بیوشیہ اور اکائیہ کا تخلیہ
تو بہ آسانی برداشت ہو سکتا تھا مگر مگارا کا ہاتھ سے نکل جانا بڑا
داغ تھا۔ اس لئے کہ جب تک وہ لمبی فصیلیں جو گرانیا کے
دروں سے نیسایا تک ایتھنز نے تعمیر کی تھیں، اُس کے پاس
تھیں، اُس وقت تک خاص ایٹی کا کو پلوپنی سس کی فوج کشی کا
مطلق خطرہ نہ تھا۔ اور یہ مورچہ نکل گیا تو سمجھنا چاہئے کہ آیندہ سے
ایٹی کا گویا ان ترکتازوں کی زد میں آگیا۔

۵۔ پری کلیس کی ہوسِ باج ستانی اور اُسکی مخالفت

جب ایران سے لڑائی ختم ہو گئی تو اتحادِ دلوس کے شرکاء کا یہ

دعوےٰ کرنا حق بہ جانب تھا کہ اب ہمیں پہلی سی خود مختاری اور آزادی مل جانی چاہیئے؛ اس دعوے کا معقول جواب یہ ہوسکتا تھا کہ ایرانیوں کے ساتھ جو صلح ہوی ہے اُس کے قایم رہنے کا اسی وقت اطمینان ہو سکتا ہے جب تک کہ خود وہ قوت قائم رہے جو ایران کی مدِّ مقابل ہو سکتی تھی؛ لیکن ایتھنز کو اب حکومت کی چاٹ پڑ چکی تھی اور وہ صحیح معنوں میں "باج ستاں" بن گیا تھا جس کی ہوسِ ملک گیری کسی طرح کم نہ ہو سکتی تھی۔ اپنے باجگزاروں سے جو خراج اُس نے مقرّر کیا تھا وہ غالباً بہت گراں نہ تھا اور برابر اُس کی ترمیم و تجدید ہوتی رہتی تھی لیکن اُن بستیوں کے لئے، جن میں آزادی کی سچی محبّت سرایت کر چکی تھی، اس محکومی میں تکلیف و دل آزاری کے اور بیسیوں اسباب موجود تھے؛

اہل ایتھنز کی ہوسِ باج ستانی میں پریکلیس اُن کا رہنما تھا۔ لیکن یہ اصولِ ملک گیری متّفق علیہ نہ تھا۔ کیونکہ طبقۂ اعلےٰ کی ایک با اثر جماعت نہ صرف اپنے شہر کی جمہوریت کو ناپسند کرتی تھی بلکہ اُس کی مُلک ستانی پر بھی حرف گیر تھی۔ اور اس جماعت میں کم سے کم ایک شخص کو یہ فخر ضرور حاصل ہے کہ وہ بالکل سچائی کے ساتھ حلیفوں کی حمایت اور اپنے وطن کی خود غرضانہ زیادتی کی مخالفت کرتا رہا۔ یہ ملیسیاس کا بیٹا توسی دیدیس تھا جس کی حجّت یہ تھی کہ وہ رقوم جو حلیفوں سے لی جاتی ہیں، صرف ایران سے مدافعت کے کاموں میں صرف ہونی چاہئیں

کیونکہ یہی اُن کی اصلی غرض ہے اور ایتھنز کو کوئی حق نہیں کہ وہ اس روپے کو کسی اور کام میں لگائے۔ یہ سخت نا انصافی ہے کہ بیوشیہ پر فوج کشی اہل ایتھنز کریں یا مندر تو، ایتھنز میں تعمیر کیا جائے اور اُس کے مصارف کا بار اتحادیوں کے مشترکہ خزانے پر پڑے"۔ توسی دیدیس کا یہ کہنا سراسر انصاف پر مبنی تھا۔ لیکن کسی قوم کے سیاسی اقتدار حاصل کرتے وقت، انصاف کو کبھی دخل نہیں ہوتا۔ اور پری کلیس کو دُھن لگی ہوئی تھی کہ جس طرح ممکن ہو اپنے وطن کو مقتدر بنا دے۔

اس غرض کے لئے اُس نے جو تدبیریں نکالی تھیں اُن میں سب سے زیادہ نیتجہ خیز یہ طریقہ ثابت ہوا کہ ایتھنز کے شہریوں کو حسب ضرورت باہر لے جا کے بسا دیا جائے۔ ان نو آبادیوں سے فائدہ یہ تھا کہ وہ محکوم علاقوں میں مقامی سپاہ کا کام دیتی تھیں اور دوسرے اس طرح شہر کی زاید آبادی کے واسطے حصول معاش کی ایک صورت نکل آتی تھی۔ اس قسم کی پہلی "کلروکی" (یعنے نو آبادی) خرسونیس علاقۂ تھریس میں قایم ہوئی اور اس کے قیام کا انتظام پری کلیس نے بہ ذات خود کیا تھا۔ پہلے اس علاقے کے حلیف شہروں سے زمین خرید لی گئی اور اس میں ایتھنز کے زیادہ تر مفلس اور بے کار باشندے ایک ہزار کی تعداد میں لا کے بسا دئے اور مختلف شہروں کی زمینوں میں سے اُن کو قطعات دے دئے گئے۔ قیمتِ زمین کے ادا کرنے کی صورت یہ تھی کہ اُس سالانہ خراج میں جو یہ شہر، ایتھنز کو ادا کرتے تھے، تا ادائے قیمت، کمی کر دی گئی۔

ایتھنز میں یہ طریقہ عام طور پر لوگوں کو پسند آیا کیونکہ ہزاروں بے کار باشندوں کو جن کی بازاروں میں بھیڑ لگی رہتی تھی، معاش کا وسیلہ مل گیا؛ لیکن اتحادیوں کو جن کی زمینوں میں یہ بستیاں بسائی گئیں یہ طریقہ اسی مناسبت سے ناپسند تھا۔

اس میں کلام نہیں کہ پری کلیس کی اس اقتدار پسندی میں بھی نظر بہت وسیع تھی۔ وہ ایتھنز کو سارے یونان کی ملکہ بنا دینا چاہتا تھا۔ وہ ایتھنز کو برو بحر پر مسلّط کر دینے کی فکر میں تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ اُن ریاستوں میں بھی ایتھنز کا رعب مانا جائے جنھیں محکوم کرنا نا عاقبت اندیشی اور غالباً امکان سے باہر تھا۔ کرونیہ کی شکست اور پھر بیوشیہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ایتھنز نے تمام یونان میں جو اعلان شایع کیا، خود اُس سے ظاہر تھا کہ اُسے سارے یونانیوں پر اپنا سکّہ جمانے کی آرزو ہے:۔ اُس نے تمام یونانی ریاستوں کو ایک متحدہ مجلس میں ایتھنز آنے کی دعوت دی تھی کہ بعض مشترکہ معاملات پر مل کر غور و بحث کی جائے۔ جن مندروں کو ایرانیوں نے جلا ڈالا تھا اُن کی از سرِ نو تعمیر، اس بلائے عظمیٰ سے نجات ملنے پر دیوتاؤں کی ضروری نذر و نیاز، اور یونانی سمندروں کو بحری قزّاقوں سے پاک کرنے کی مشترکہ سعی، یہ وہ کام تھے جنھیں ایتھنز تمام یونان کی غور و بحث کے لئے پیش کرنا چاہتا تھا۔ اور بے شبہ اگر مجلس کی تجویز عمل میں آجاتی تو تمام یونان کی ایک ایسی ہمہ گیر "ام فک تیونی" (یعنے دینی مجلسِ ہمسایگاں) کا افتتاح ہو جاتا جس کا مرکز ایتھنز ہوتا۔ غرض تجویز نہایت شاندار تھی لیکن اسکا چل جانا

غیر ممکن تھا۔ اسپارٹہ سے یہ امید کبھی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ ایسی تجویز کا ساتھ دے گا جو کیسی ہی بلند خیالی اور خوش اعتقادی پر مبنی ہو یہ پہلو ضرور رکھتی تھی کہ اُس کی آڑ میں ایتھنز کو اپنی ہوس جاہ اور زیادہ ستانی کے نئے نئے حیلے نکالنے کا موقع مل جائے، چنانچہ ایتھنز کے فرستادوں کو پلوپنی سس والوں نے جھڑک دیا اور وہ تجویز رہ گئی ؛

(۶) مندروں کی ازسرِ نو تعمیر

اب ایتھنز کے لئے یہی رہ گیا کہ جہاں تک خود اُس سے تعلق تھا، اُن تجاویز کو حیزِ عمل میں لائے۔ یہ اہل شہر کا مذہبی فرض تھا کہ ایرانی ملیچھوں کے ہاتھ سے جو نقصان مذہبی عمارتوں کو پہنچا تھا اسکی مرمت کریں اور ان دشمنانِ ملک کی ہزیمت پر خدا کا ایسا شکریہ بجالائیں جو اس موقع کے شایاں ہو، اور پری کلیس کی بلند نظری سب سے زیادہ اسی بات میں ظاہر ہوئی کہ وہ اس دینی فرض کو ایک عالیشان پیمانے پر انجام دینے کی قدر جانتا تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ شہر کا اپنے دیوتاوں کے مساکن کی شان بڑھانا، خود اپنی شان بڑھانا ہے۔ نیز یہ کہ اُس کے جاہ و جلال اور بلند حوصلوں کے اظہار کی سب سے معقول صورت یہی ہو سکتی ہے کہ خوب صورت مندر و معابد تعمیر کئے جائیں ؛

ان یادگاروں میں، جنھوں نے بیس برس کے عرصے میں اکروپولس کی صورت بدل دی، سب سے پہلی چیز ایتھنہ دیوی کی ایک بہت بڑی برنجی مورت تھی۔ خود اس دیوی کے نام کی پہاڑی پر

اس مورت کو اس طرح نصب کیا تھا کہ اُس کا مُنہ جنوب مغرب کی طرف تھا اور اس کے خود اور نیزے کی سِنان بہت دور سمندر سے دھوپ میں چمکتی نظر آتی تھی۔ اس دیوی کے نئے استھان کی (جو تھمس طاکلیس کے زمانے میں بننا شروع ہوا تھا) اسی پہلے موقع اور انہی آثار پہ تعمیر جاری ہوئی۔ لیکن عمارت کا نقشہ اکتی نوس جیسے ہنرمند معمار نے تیار کیا تھا۔ عمارت میں باہر سے پاروسی پتھر لانے کی بجائے، خود آیٹی کائی سنگ مرمر پن تلی کوس کی کانوں سے نکلوا کے لگایا گیا تھا۔ مندر کی پوری وضع ڈورِیانی تھی اور بعد میں یہ پارتھناں کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے اندر دو کمرے تھے جن کے درمیان کوئی راستہ نہ تھا۔ مشرقی کمرہ جس میں برآمدے سے داخل ہوتے تھے۔ اصل مندر تھا۔ یعنے یہاں دیوی کا بُت تھا۔ اس کمرے کا طول سو فیٹ کے قریب ہوگا۔ اور اسی لئے اس کا سرکاری نام "ہکاتم پڈوس" (یعنی سو فٹا) تھا۔ کمرے میں دیوی کا دیو قامت بُت زریں لباس پہنے شاہانہ شان کے ساتھ کھڑا تھا اُس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ، سر پہ خود دائیں ہاتھ میں سونے کی تصویر نصرت و کامرانی[1] اور بایاں اپنی ڈھال پہ لگا ہوا تھا۔ اور اُس کا پیر یعنے ارِک تونیوس نامی سانپ کنڈلی مارے قدموں میں پڑا تھا۔ واضح ہو کہ یہ بُت چوبی تھا جس کے اوپر سونا اور ہاتھی دانت جڑ دیا گیا تھا اس طرح کہ جہاں جسم کھلا ہوا تھا وہاں ہاتھی دانت لگایا تھا اور

---

[1] یہ بھی ایک قدیم یونانی دیوی تھی۔ مترجم

جہاں لباس دکھانا منظور تھا، وہاں سونا۔ اسی لئے اُسے "کری سل فن تین" (یعنے زرو عاج آمیز) کہتے تھے؛۔ یہ ایتھنز کے نامی بُت تراش فیدیاس (پسر کارمیدیس) کی کاریگری تھی جو اپنے فن کا بڑا مجتہد گزرا ہے ؛

ایک بڑے مندر کی تکمیل و آرایش کے لئے اور جس قدر نقش و نگار کی ضرورت ہوتی ہے، ان کا کام بھی اسی فیدیاس کے سپرد کیا گیا تھا۔ چنانچہ دونوں پیل پایوں اور ستونوں کے درمیان دیوار کے حاشئے پر اپنی خدا داد ہنرمندی اور کمال کی جو یادگاریں اُسنے چھوڑیں وہ اہل دنیا کے لئے قابل زیارت ہیں؛۔ مشرقی ڈیوڑھی کے مثلث پر ایتھنہ کی پیدایش کا سماں دکھایا تھا کہ وہ یک بہ یک زئیس دیوتا کے سر سے نمودار ہوتی ہے ایک طرف چاند ڈوب رہا ہے اور دوسری طرف سورج نکل رہا ہے۔ اور آسمان کا ہرکارا یعنی دھنک چلی ہے کہ ایک سرے سے دوسرے تک سارے عالم کو یہ مژدۂ جانفزا پہنچا دے ؛ مغربی سرے پر جو پیل پایہ تھا اُس پر دیوی کی زندگی کا وہ واقعہ دکھایا گیا تھا جس کا اٹی کا سے خاص تعلّق ہے۔ یعنی اپنے حریف پوسی ڈن پر اس کی فتح، اور اکروپولس کے اوپر اس مقابلے میں (کہ اس سرزمین کا مالک کون ہو) اُس کے جادو سے یک بہ یک زیتُون کا زمین سے پھوٹنا جس کے آگے اس کے حریف کو ہار ماننی پڑی۔ مندر کے گرداگرد جو حیرت انگیز حاشیہ بنایا گیا تھا اُس پر ایتھنہ ماتا کے سب سے مقدّس تہوار کی تصویر تھی۔ ہر چوتھے سال اہل ایتھنز اس دیوی کا بہت بڑا تہوار مناتے تھے جس میں جلُوس بنا کے مندر تک جاتے اور ایک نئی قبا چڑھاتے تھے

نقشہ اکرو پولس

گھ گھ ۰۰۰۰۰ پلاسجی دیوار کے کھنڈر